میرے مہرماہ

تحریر: نور بانو

READER BURAQ

گرے سوٹ میں ملبوس سلور رنگ کی ٹائی لگائے وہ اپنے آفس بلڈنگ کی سولہویں منزل کی راہداری میں پروقار انداز میں چلتا ہر شہ سے بے نیاز نظر آتا تھا۔ کلائی میں چمکتی ہوئی رولیکس جو اس وقت انگلینڈ کی صبح کے ساڑھے نو بجا رہی تھی۔ سیاہ بالوں کو جیل کی مدد سے ماتھے پر ٹکائے تیوری ناک پر چڑھائے وہ جب راہداری سے گزرتا تو اردگرد بنے کیبنز میں موجود امپلائیز مودبانہ انداز میں اپنی اپنی کرسیوں سے کھڑے ہوتے جاتے۔ ساتھ چلتا پی-اے اُسے آج کے شیڈول سے آگاہ کر رہا تھا اور دو قدم کے فاصلے پر چلتا آفس بوائے ادب سے ایک ہاتھ میں اُسکا سوٹ کیس اور دوسرے ہاتھ میں کافی کا ایک کپ اٹھائے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

دکھنے میں وہ کوئی یونانی دیوتا لگتا تھا۔ ٹال اینڈ ہینڈسم دی پرفیکٹ ایشین بیوٹی۔

ساتھ چلتے پی-اے نے آگے بڑھ کر اُس کے آفس کا دروازہ دھکیلا اور ایک طرف کو کھڑا ہو گیا۔ اس نے کوٹ کا بٹن کھولا تو آفس بوائے نے ادب سے آگے بڑھ کر اس کا کوٹ تھام لیا اور پاس رکھے اسٹینڈ پر ڈال دیا۔ اب وہ اپنی پاور سیٹ پر بیٹھا کسی سلطنت کا حکمران نظر آتا تھا۔ جس کا ہر فیصلہ حرفِ آخر تھا۔ وہ جب بھیڑ میں چلتا تو لوگ خود ہی ادب سے راستہ چھوڑ دیتے۔ وہ حکم دیتا اور لوگ سرِ تسلیم خم کرتے۔

اس کی پشت پر شیشے کی دیوار کے باہر دیکھو تو برمنگھم شہر اپنی آب و تاب سے چمکتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ بلکل میر آہل کی طرح۔۔۔۔

"سر بسٹرول پراجیکٹ کا جو کانٹریکٹ تھا وہ ہمیں مل گیا ہے۔ یہ کچھ پیپرز ہیں۔ جو آج اُنہیں میل کرنے ہیں۔ آپ ایک نظر دیکھ کر سائن کر دیجیے گا"

مائیکل نے چند پیپرز اس کی ٹیبل پر رکھ دیئے۔

اس پورے دورانئے میں میر آہل کے چہرے پر پہلی بار ہلکی سی مسکان ابھری تھی۔

"سر آج دوپہر میں ملِے آئل کمپنی کے ساتھ ہماری ایک میٹنگ ہے اور کل لندن والا ڈیلیگیشن بھی آنے والا ہے۔ یہ اس کی ڈیٹیلز ہیں۔"

مائیکل نے مزید چند پیپرز ٹیبل پر رکھے تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا اینا اورنگزیب بنا دستک کے آفس کا دروازہ دھکیل کر دندناتے ہوئے اندر داخل ہوئی تھی۔ اس نے گھٹنے تک آتی ہلکے پیلے رنگ کی فلورل فراک پہن رکھی تھی۔ اور سنہرے بالوں کو کندھوں پر پھیلا رکھا تھا۔ سفید رنگت کی وہ مخروتی ناک والی لڑکی اب میر آہل کے مقابل کھڑی تھی کہ درمیان میں حائل ٹیبل کی وجہ سے اس کے پاؤں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اینا اورنگزیب برہم چہرہ لئے آہل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دو قدم مزید آگے آئی۔

"میں تمہیں کب سے کال کر رہی ہوں آہل۔۔۔" میک اپ سے تراشے ہوئے چہرے پر ناراضگی عیاں تھی۔

میر آہل نے سنجیدگی سے مائیکل کی جانب دیکھا. جیسے پوچھ رہا ہو کہ۔۔۔ "اور کوئی ضروری بات نہیں تو وہ جاسکتا ہے۔" مائیکل اس کی نظروں کا ارتکاز سمجھتے ہوئے سر کو خم دیتا آفس سے نکلا، آفس بوائے زبیر نے بھی مائیکل کی تقلید کی.

اس نے کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے اینا کو سر سے پیر تک ایک نظر دیکھا۔

"تمہیں اچھی طرح معلوم ہے اینا کہ میں کام کے وقت غیر ضروری کالز انٹرٹین نہیں کرتا۔"

آہل کا سپاٹ اور سنجیدہ چہرہ دیکھ کر اینا کے کندھے ڈھلکے اور تھوڑی دیر پہلے کی برہمی جیسے غائب ہوگئی۔

"سویٹ ہارٹ ناراض کیوں ہو رہے ہو ہم اتنے دن سے ملے نہیں اور نا ہماری بات ہوئی اس لئے میں نے سوچا کال کر کے تمہاری خیریت پوچھ لوں"

اینا گھوم کر آہل کے عقب میں آکر کھڑی ہوگئی تو آہل نے ریوالونگ چیئر کا رخ اس کی جانب کیا۔

"اور ویسے بھی تم کام میں اتنا بزی ہوتے ہو کہ۔۔۔۔"

اینا والہانہ انداز میں کہتے ہوئے اس کے اوپر جُھکی تو بائیں جانب کے سنہرے بال اس کے کندھے سے پھسل کر آہل کے چہرے سے ٹکرائے تو اس کے ماتھے پر آئے بل ہلکے ہوگئے اور لمحے بھر کے لئے اس پر بے خودی طاری ہوگئی۔ یہ شاید مائیکل کی جانب سے دی گئی خوش خبری کا اثر تھا کہ وہ کچھ پل کے لئے اپنے اُصول فراموش کر گیا۔ اس

نے سنہرے بالوں کو پیچھے کیا اور ذرا آگے کو جھکا۔۔۔اُسی لمحے آہل کے پی-اے مائیکل نے انگلی سے دروازے پر دستک دی تو میر آہل کا فسوں ٹوٹا اور وہ اپنی کرسی سے یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔

بلند آواز میں۔۔۔"یس کم اِن"۔۔۔۔کہتے ہوئے اب وہ پہلے والا سنجیدہ میر آہل لگ رہا تھا۔ جس کے اپنے کچھ قواعد وضوابط ہیں۔ جن کا احترام اس پر لازم ہے۔

"سر پاکستان سے آپ کی بی جان کا فون ہے۔۔۔"مائیکل نے فون اس کی جانب بڑھاتے ہوئے آہستگی سے کہا تو اس کے چہرے پر بشاشت سی پھیل گئی۔ بنا کچھ کہے اس نے فون تھام لیا اور سر کے اشارے سے اُسے باہر جانے کا کہا البتہ اینا اب بھی دانت کچکچاتے ہوئے مائیکل کو کینہ توز نظروں سے گھور رہی تھی۔ جس کے آنے سے آہل کی پہلی بار اُس کی جانب اس طرح سے بڑھتی آٹینشن ڈائیورڈ ہو گئی تھی۔

ناجانے ایسا کیا تھا اس شخص میں کے لاکھ کوششوں کے باوجود وہ آہل کو خود کی طرف مائل کرنے میں ناکام ہو جاتی تھی۔ آہل سے اس کی ملاقات کسی کمپنی کے پراڈکٹ لانچ ایونٹ میں ہوئی تھی۔ ہر کسی سے بے نیاز بھوری آنکھوں والا یہ شخص اُسے پہلی نظر میں ہی بھا گیا تھا۔ اس کا انداز، اس کی باتیں ہمیشہ اینا اور نگزیب کو نئے طریقے سے متاثر کرتی تھیں۔ وہ اس کے قریب آنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ وہ دونوں اچھے دوست بھی بن گئے تھے۔ مگر یہ کہنا غلط نہیں ہو گا کے یہ دوستی کافی حد تک یکطرفہ تھی۔

"اسلام وعلیکم بی جان کیسی ہیں آپ"

خوشگواری سے کہتے ہوئے اب وہ شیشے کی دیوار کے سامنے کھڑا باہر کا منظر دیکھ رہا تھا۔ آہل نے ایک ہاتھ سے فون کان پر لگا رکھا تھا جبکہ دوسرا ہاتھ پینٹ کی جیب میں تھا۔ بلاشبہ وہ واقعی بہت ہینڈسم تھا۔

"اپنے بچے کو دیکھے بغیر میں کیسی ہو سکتی ہوں بھلا" دوسری جانب سے پیار بھرے انداز میں استفسار کیا گیا تو آہل آہستگی سے مسکرایا۔

"مجھے معاف کر دیں میں نہیں آسکا پاکستان یہاں اتنی مصروفیت ہوتی ہے کہ۔۔۔"

"اچھا بس بس بی جان کو بہانے مت دو، مجھے اچھے سے پتا ہے کہ کیوں نہیں آئے تم "بی جان نے درمیان میں ٹوک کر گلہ کیا تو آہل کے ماتھے پر بل پڑے۔

"آپ جو چاہتی ہیں بی جان میں وہ نہیں کر سکتا میں نے کبھی اس کے بارے میں ایسا نہیں سوچا وہ مجھ سے سات سال چھوٹی ہے اور میں ایک مختلف اپروچ کا انسان ہوں۔ اس کے ساتھ کبھی ایڈجسٹ نہیں کر پاؤں گا سمجھنے کی کوشش کریں پلیز۔"

وہ شیشے کی دیوار میں اپنا اورنگزیب کا عکس دیکھ سکتا تھا۔ وہ خراماں خراماں چلتی اس کے عقب میں آئی اور معصوم سی شکل بنا کر آہل کو ملتجیانہ نظروں سے دیکھا۔ جسے میر آہل نے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔

"مجھے نہیں معلوم پُتر میں کتنے دن زندہ رہوں گی اب تو بس یہی خواہش ہے کہ مرنے سے پہلے تجھے اور دل آویز کو ہنسی خوشی ساتھ رہتے دیکھوں، اپنی بی جان کے فیصلے پر ایک بار بھروسہ کر کے تو دیکھ، اُسے ایک موقع دے کر دیکھ اگر پھر بھی تجھے تسلی نہیں ہوئی تو اس کے بعد جو تیرا فیصلہ ہو گا وہی میرا فیصلہ ہو گا مگر ایک بار میرا مان رکھ لے بیٹا پاکستان آجا۔۔۔" انکے انداز میں ایک عجیب سی یاسیت گھلی تھی کہ لمحے بھر کے لئے میر آہل کے ہونٹوں پر قفل لگ گیا اور الفاظ دم توڑ گئے۔

یہ پہلی بار نہیں تھا کہ بی جان اس سے پاکستان چکر نا لگانے کا گلہ کرتی تھیں۔ بات محض پاکستان چکر لگانے کی ہوتی تو شاید وہ کب کا چلا جاتا مگر ان کی ضد تھی کہ وہ اپنے چھوٹے چاچو کی بیٹی دل آویز سے شادی کر لے۔ جو اس کے لئے بہت مشکل تھا۔ اتنے سال انگلینڈ میں گزارنے کے بعد ایک ایسی لڑکی سے شادی کرنا جس نے کبھی گاؤں سے باہر قدم نہیں رکھا ہو، جس کی زندگی حویلی کی چار دیواری میں ہی شروع اور ختم ہو جاتی ہے ایسی لڑکی کے ساتھ زندگی گزارنا میر آہل جیسے مرد کے لئے آسان نہیں تھا۔

اس نے کبھی شادی کر کے سیٹل ہونے کا سوچا نہیں تھا کیونکہ اس کے نزدیک سب سے اہم ہمیشہ کام رہا تھا۔

وہ کچھ دیر یوں ہی کھڑا برمنگھم کی سڑکوں پر دوڑتی زندگی کو دیکھتا رہا۔ یہاں اس اونچائی پر کھڑے ہو کر دیکھو تو ہر شہ خود سے کمتر دکھائی دیتی تھی۔ چھوٹی اور حقیر۔۔۔ نو سال پہلے اُس نے اسی سڑک کے وسط میں کھڑے ہو کر اس عظیم الشان عمارت کو حسرت سے دیکھتے ہوئے ایک خواب دیکھا تھا۔ انگلینڈ کا سب سے بڑا بزنس ٹائیکون بننے کا خواب۔۔۔ کچھ پل یوں ہی خاموشی کی نظر ہو گئے۔

"ٹھیک ہے بی جان مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہے مگر آپ اپنی زبان یاد رکھیئے گا۔ اگر میں اُسے قبول نا کر سکا تو پھر آپ کو میرا ہر فیصلہ ماننا پڑے گا۔ میری ہر بات حرفِ آخر ہو گی۔"

یہ کہہ کر اس نے چند الوداعی کلمات ادا کیئے اور کال منقطع ہو گئی۔

اینا اُسے ششدر نگاہوں سے یوں دیکھتی رہی کہ اُسے اپنی سماعتوں پر یقین نا آیا ہو۔ اگر میر آہل کی شادی اس کی کزن سے ہو گئی تو اس کا کیا ہو گا۔ اس نے جھرجھری لی۔

"سویٹ ہارٹ۔۔۔"

"جاتے ہوئے میرے پی-اے کو اندر بھیج دینا....." اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ آہل نے اکھڑپن سے اپنی بات مکمل کر کے اپنا رخ پھیر لیا۔ اینا نے تیز نظروں سے آہل کو دیکھا جو اب اپنی پاور سیٹ پر بیٹھا کام میں مصروف دکھائی دینے لگا تھا، اور پیر پٹختے ہوئے آفس سے باہر چلی گئی۔

☆...☆...☆

حویلی کی بیٹھک میں اس وقت بی جان کے ارد گرد سب ہی موجود تھے اور کافی خوش دکھائی دیتے تھے۔ سوائے ایک انسان کے

"بی جان آپ بھی کمال کرتی ہیں کہاں ہمارا آہل اور کہاں یہ منحوس دل آویز جو دنیا میں آنے سے پہلے اپنا باپ اور دنیا میں آنے کے بعد اپنی ماں نگل گئی"

خاموشی سے چائے کی ٹرے میز پر رکھتے ہوئے لمحے بھر کے لئے اس کا ہاتھ کانپا مگر پھر اپنی کپکپاہٹ کو قابو پا کر جلدی سے ٹرے رکھ کر کچن میں بھاگ گئی۔

زلیخا نے کینہ توز نظروں سے اُسے دروازے کے پار گُم ہوتے دیکھا تو پھر سے رُخ بی جان کی جانب پھیرتے ہوئے کہنے لگیں۔

"میں کہتی ہوں کیا ضرورت ہے بی جان اس بیچارے کو زبردستی کے بندھن میں باندھنے کی ہر کوئی زبردستی کے بندھن نبھانے کی سکت نہیں رکھتا" اُنہوں نے الفاظوں پر ذرا زور دیتے ہوئے کہا تو میر خلیل نے ایک اُچٹتی نگاہ زلیخا پر ڈالی اور غیر آرام دہ سے ہو کر پہلو بدلا۔

"بہو کتنی بار کہا ہے کہ دل آویز کے بارے میں اس طرح کی باتیں مت کیا کرو وہ میرے بیٹے کی آخری نشانی ہے اور فیصل کی یہی خواہش تھی کہ اس کی اولاد محفوظ ہاتھوں میں رہے اور اس کے لئے آہل سے بہتر انتخاب ہو ہی نہیں سکتا"

وہ رسان سے اپنی بات کہتے ہوئے گرم چائے کے گھونٹ بھرنے لگیں تو زلیخا کا چہرہ مزید سرخ ہوا اور تیز نظروں سے گردن ترچھی کر کے صوفے پر بیٹھی اپنی بیٹی ریما کو دیکھا جو بے نیازی سے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے گود میں سموسوں سے بھری پلیٹ رکھ کر ایک کے بعد ایک سموسہ کُتر رہی تھی۔ سانولہ رنگ، بھدے نین نقش اور اس پر بھاری سی جسامت۔۔۔ ریما کے ڈراؤنے وجود کو دیکھ کر زلیخا نے ہلکی سی جھرجھری لی۔

یہی وجہ تھی کہ زلیخا ہمیشہ سے دل آویز سے نفرت کرتی تھی کیونکہ وہ ہر لحاظ سے ریما سے آگے تھی۔ عقل، سوجھ بوجھ، سگھڑ پن اور خوبصورتی میں بھی۔۔۔ اس لئے وہ چاہ کر بھی دل آویز کو چاچی کی محبت نہیں دے سکی۔

"پر اماں خدا نہ کرے کل کو آہل نے دل آویز کو۔۔۔"

میر خلیل ایسا سوچنا بھی نہیں چاہتے تھے کیونکہ بے شک وہ ان کے بڑے بھائی کی بیٹی تھی مگر انہوں نے کبھی دل آویز اور ریما میں فرق نہیں کیا تھا۔

"بے فکر ہو جا خلیل میں جانتی ہوں آہل کو وہ ایک خاندانی مرد ہے ایک بار دل آویز کے نام کے ساتھ اس کا نام جڑ گیا تو پھر اس کی غیرت اجازت نہیں دیگی کہ اس کی بیوی کا نام پھر کبھی کسی دوسرے شخص کے ساتھ جُڑے" وہ اطمینان سے بولیں تو میر خلیل بھی مطمئن ہو گئے۔

میر فرقان کے انتقال کے بعد بی جان نے اپنے تینوں بیٹوں کی پرورش کے ساتھ ساتھ کھیت اور حویلی کی بھاگ دوڑ خود سنبھالی تھی۔ سلطانہ بیگم بھاولپور کے بڑے زمیندار کی بیٹی تھیں اور نہایت ہی پڑھی لکھی اور سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔ گھر کے ساتھ ساتھ اپنی دانائی اور سمجھداری سے اپنے شوہر کے کاروبار میں بطور مشیر وہ ہمیشہ پیش پیش رہیں۔ ان کے تین بیٹے تھے۔ رحمان، فیصل، اور خلیل۔۔۔

میر رحمان حویلی کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔۔ اس لئے دل بھی بڑا تھا وہ خود تو بڑے بنے اور اپنے بھائیوں کو بھی بڑا بننے میں مدد کی چھوٹی عمر سے ہی وہ اپنی بی جان کا کاموں میں ہاتھ بٹانے لگے تھے۔ میر آہل ان کا ایک لوتا بیٹا

تھا۔ماں باپ کے انتقال کے بعد وہ کافی اداس رہنے لگا تو بی جان نے اُسے آگے کی پڑھائی مکمل کرنے کے لئے پردیس بھیج دیا۔ یہ میر رحمان کی ہی خواہش تھی کہ دل آویز ان کے بیٹے آہل کی بہو بنے کیونکہ میر فیصل اپنی بیماری کی وجہ سے اپنی اولاد کے لئے (جو اس دنیا میں ابھی آئی بھی نہیں تھی) پریشان رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی اولاد کی ذمہ داری اپنے بھائی کو سپرد کی تھی۔ اس لئے میر رحمان نے بچپن میں ہی دونوں کو ایک دوسرے سے منسلک کر دیا تھا۔

پھر آتے ہیں میر فیصل کی جانب جو حویلی کے دوسرے بیٹے اور اپنی بی جان کے لاڈلے تھے۔ دل آویز انکی ایک لوتی بیٹی تھی۔ ان کا انتقال دل آویز کی پیدائش سے پہلے ہی کینسر کی بیماری کی وجہ سے ہو گیا تھا۔ جس کا صدمہ ان کی بیوی رابعہ برداشت نہیں کر سکیں، ان کے انتقال کے بعد وہ اکثر بیمار رہتی تھیں اور اپنی بیٹی کی پیدائش کے وقت اس غم کی تاب نالاتے ہوئے وہ دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

پھر حویلی کے سب سے چھوٹے بیٹے میر خلیل جن پر دونوں بھائیوں کے انتقال کے بعد ذمہ داریوں کا بوجھ دُگنا ہو گیا تھا۔ ان کے بس دو بچے تھے کریم اور ریما۔ انہوں نے گھر کے چاروں بچوں کو ایک برابر محبت دی تھی۔ کبھی آہل اور دل آویز کو کریم اور ریما سے الگ نہیں جانا تھا۔ یہ شاید بی جان کی تربیت اور بھائیوں کی محبت تھی۔ جو وہ لوگ آج بھی ہنسی خوشی محبت سے ایک چھت تلے رہ رہے تھے اور میر خلیل نے حویلی اور کھیتوں کی بھاگ دوڑ سنبھال رکھی تھی۔ مگر چیزیں اکثر ویسی ہوتی نہیں ہیں جیسی وہ نظر آتی ہیں۔ قدرت بھی خود میں ہزاروں راز دفن رکھتی ہے۔ صدیوں خاموش رہتی ہے۔ یہ حویلی اور اس کے مکین بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ یہاں ہر شخص اپنی حسرتوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھائے، اپنے سینے میں بہت سے رازوں کا جنازہ دفن کئے پھر رہا تھا۔

☆...☆...☆

وہ کچن میں سنک کے پاس کھڑی اندر بیٹھک سے آتی باتوں کی آوازیں خاموشی سے سُن رہی تھی۔ اُس نے سیاہ لمبی قمیض کے نیچے ٹراؤزر پہن رکھا تھا لمبے خوبصورت اور چمکدار بالوں کو کسی آبشار کی طرح پشت پر کھلا چھوڑا ہوا تھا۔ جس کی لٹیں ابھی تک نمی لئے ہوئے تھیں۔ شاید وہ ابھی نہا کر نکلی تھی۔

سیاہ جارجٹ کے ڈوپٹے کو سر اور کندھوں پر اچھے سے پھیلائے اب وہ جھک کر برتن دھو رہی تھی۔ پانی میں نہائے اس کی دودھیا کلائی مزید دلکش اور نازک دکھائی دے رہی تھیں۔ لمبا قد اور تیکھے نقوش۔۔۔۔ میک اپ کے نام پر اس نے محض آنکھوں میں کاجل ڈال رکھا تھا۔ زلیخا چاچی کی نفرت بجا تھی۔

اُسے دیکھ کر تو کوئی بھی احساس کمتری کا شکار ہو سکتا تھا اور زلیخا چاچی ٹھہریں ایک پھوہڑ اور بد صورت بیٹی کی ماں وہ کیوں نا جلن اور حسد کا شکار ہوتیں۔

کچن کی کھڑکی (جو باہر برامدے میں کھلتی تھی) سے دھوپ چھن کر اندر آ رہی تھی۔ جو اس کی ناک میں پہنی نازک ہیرے کی لانگ کو مزید چمکا رہی تھی۔

لوگ کہتے ہیں میرا یار چاند کا ٹکڑا ہے

میں کہتا ہوں چاند میرے یار کا ٹکڑا ہے

کسی کے ترنت شعر داغنے پر وہ چونک کر پلٹی تو دیکھا کریم انگلی سے ٹھوڑی کجاتے ہوئے کمینی مسکان ہونٹوں پر سجائے اُسے ہی دیکھ رہا ہے۔ اس کے انداز پر دل آویز جل بُھن گئی۔ مگر پلٹ کر کچھ نہیں کہا۔۔۔۔

"اُف اتنا خوبصورت سراپا اور اس پر یہ نخرہ میں مر جاؤں گا اگر آپ ایسے ہی قیامت ڈھاتی رہیں۔" بلا کی ڈھٹائی تھی وہ ہنوز خاموشی سے برتن دھوتی رہی۔۔۔ یہ تو مانو روز کی بات تھی۔ کریم اکثر اُسے تنہا دیکھ کر دندناتے ہوئے آ جاتا تھا اور اس طرح کی اوچھی حرکتیں کر کے دل آویز کو پریشان کرتا تھا۔ ابھی بھی نا جانے وہ کہاں سے آوارہ گردی کر کے آ رہا تھا اور اب اُسے کچن میں تنہا دیکھ کر بغیرتی پر اُتر آیا تھا۔ وہ برتن دھو کر پلو سے ہاتھ خشک کرتے ہوئے کچن سے باہر نکلنے لگی تو کریم نے بازو پھیلا کر اس کا راستہ روک لیا۔

"کدھر جا رہی ہو شہزادی پہلے جی بھر کر دیکھ تو لینے دو خود کو" کمال کی بے نیازی تھی۔

"بس بی جان کو بتانے کی دیر ہے کریم بھائی آپ کی عقل چاچو خود ٹھکانے پر لے آئے گے" اس نے کاٹ دھار نظروں سے اسے گھورا، چہرہ سپاٹ اور لہجہ سخت تھا۔

کریم دل آویز سے عمر میں ڈھائی سال بڑا تھا اور ریما اور اس کی عمر میں تقریباً سات، آٹھ ماہ کا فرق تھا۔ حالانکہ میر خلیل اور فیصل کی شادیاں ایک ساتھ ہی ہوئی تھیں۔

یہ کہہ کر وہ دروازہ پار کرنے لگی تو کریم نے پیچھے سے اس کی کلائی بھینچ لی۔۔۔

"ابھی دیکھ لیتے ہیں کون کس کی عقل ٹھکانے پر لگاتا ہے۔۔۔" کریم نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا تو دل آویز نے زور سے اس کا ہاتھ جھٹک کر اپنی کلائی آزاد کروائی دودھیا کلائی اب سرخ پڑ گئی تھی۔

پلو سے کلائی صاف کرتے ہوئے۔ اس نے محض آنکھ سکوڑ کر اُسے دیکھا اور اس کے عقب کی جانب اشارہ کیا۔ کریم اس کے اشارے کا تعقب کرتے ہوئے ایڑیوں کے بل گھوما اور اس کا سارا خون خُشک ہو گیا۔

میر خلیل اس کے بلکل پیچھے کھڑے تھے اور اس کی تمام حرکت ملاحظہ کر چکے تھے۔

دل آویز نے شرمندگی سے رخ دوسری جانب موڑ لیا۔

"اب آئے گی انکی عقل ٹھکانے پر"

اس نے دل ہی دل میں تبصرہ کیا تھا۔

☆...☆...☆

حویلی کے آنگن میں اس وقت سب سنجیدہ چہرہ لئے موجود تھے۔

"شرم نہیں آئی تجھے کوئی اپنے گھر کی عزت پر بُری نگاہ ڈالتا ہے بے غیرت۔۔۔" میر خلیل کا ہاتھ ایک بار پھر ہوا میں لہرایا اور دوسرے گال پر بھی اپنی انگلیوں کی ثبت چھوڑ گیا۔

میر خلیل کا بھاری مردانہ ہاتھ پڑنے سے کریم کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ میر خلیل کی گرجدار پھنکار سن کر دل آویز جو بی جان کے عقب میں کھڑی تھی مزید سہم گئی اور زلیخا شوہر کا گرم مزاج دیکھ کر جہاں تھی وہی بُت بنی کھڑی رہی اگے بڑھ کر بیٹے کی حمایت تک کرنے کی جرات نہ کر سکی۔

"میری برسوں کی محنت اور ریاضتوں کا صلہ مجھے اس نامراد اولاد کی شکل میں ملا ہے۔۔۔ ناجانے کون سا گناہ ہوا تھا مجھ سے، زندگی بھر میرے باپ اور بھائیوں نے اس گاؤں میں صرف عزت کمائی ہے اور میری نسل دیکھو کس طرح اس عزت کو پیروں تلے روندرہی ہے"

وہ دل برداشتہ سے بول رہے تھے۔ غصے سے چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔

"م۔۔۔م۔۔ میں نے کچھ نہیں کیا بابا جی۔۔۔ دل آویز نے ہی مجھے روکا تھا اور۔۔۔۔"

"بس خاموش ورنہ گُدی سے زبان کھینچ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گی۔"

بی جان نے گرج کر کہا تو آنگن میں لمحے بھر کے لئے سکوت چھا گیا خود میر خلیل بھی کچھ پل کو ٹھہر کر اپنی ماں کا چہرہ دیکھنے لگے جس پر غضب ناک غصہ منڈلا رہا تھا۔

"تیری اتنی مجال کے میری پوتی کے خلاف اس طرح کی گھٹیا بات کرے"

"بی جان اب آپ زیادتی کر رہی ہیں۔ تالی دو ہاتھوں سے بجتی ہے ایک ہاتھ سے نہیں"

زلیخا نے منمناتے ہوئے کہا اور کُن اکھیوں سے دل آویز کو کینہ توز نظروں سے دیکھا۔

" صحیح کہا زلیخا بہو تالی دو ہاتھوں سے ہی بجتی ہے تبھی یہ سزا (اشارہ کریم کی طرف تھا) ہم بھگت رہے ہیں اور اگر میں خاموش ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں تمہارے ارادوں سے ناواقف ہوں مگر جو دل آویز کا ہے وہ اُسی کا رہے گا میرے جیتے جی تمہارا یہ خواب تو پورا ہونے سے رہا" بی جان نے ناچاہتے ہوئے بھی ان پر چوٹ کی تھی تو زلیخا کے اوسان خطا ہو گئے اور کندھے ڈھلکے۔

"بس میر خلیل اب اور دیری نہیں کرنی آہل کا فون آیا تھا وہ اگلے ہفتے پاکستان آرہا ہے۔ بس اس کے آتے ہی دل آویز اور آہل کی شادی کر دے گے۔"

دل آویز کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا اپنے چہرے کے بدلتے تاثرات چھپانے کے لئے اس نے چہرہ مزید نیچے جھکا لیا۔

"جی بی جان بہتر۔۔۔۔ میر خلیل نے ماں کے فیصلے کی حمایت کی۔"

"اور ہاں جب تک دل آویز اس گھر سے رخصت نہیں ہو جاتی۔ یہ (انگلی سے کریم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا) باہر ملازموں کے ساتھ ان کے کوارٹر میں رہے گا۔ رخصتی تک حویلی کی دہلیز پار نا کرے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا"

غصیلی آواز میں سب کو تنبیہ کرتے ہوئے انہوں نے زلیخا کو تیکھی نظروں سے دیکھا اور دل آویز کو بازو سے تھامے وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئیں۔

میر خلیل نے ماں کی بات پر سر اثبات میں ہلاتے ہوئے حمایت کی اور بیٹے کو باہر کے دروازے کی جانب اشارہ کیا گویا کہا کے دفع ہو جا یہاں سے اور زینے کی طرف بڑھ گئے۔ زلیخا دانت پیستی رہ گئی اور پاس کھڑی ریما کو ٹہوکا مارا جو کب سے کھڑی سب سے بے نیاز و بے خبر چاکلیٹ کی پنی چاٹ رہی تھی۔

"اُف امی کیا مسئلہ ہے مجھے کیوں مار رہی ہیں آپ جائے بھائی کو جا کر ماریں۔۔۔" وہ دبا دبا سا چلائی۔

"ہاں بس ٹھوستی رہ جب دل آویز کا نکاح آہل سے ہو جائے گا نا تو بیٹھ کر شادی میں آئے مہمانوں کے جھوٹے برتن صاف کرنا توں۔۔۔ ٹھیک ہے۔ میری تو قسمت ہی ماڑی ہے اولاد بھی ملی تو ایک دم گندی بیٹا دل آویز کے پیچھے لٹو کی طرح گھومتا ہے اور بیٹی کو ٹھونسنے سے فرصت نہیں ہے"

وہ ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کچن میں چلی گئی اور ریما منہ کا زاویہ بگاڑے ماں کی جلی کٹی سنتی رہی۔

"اونہوں۔۔۔ جب دیکھو کچی مرچیں چبائے رہتی ہیں. آنے دو اس میر آہل کو پھر دیکھتے ہیں" اس نے انگلی پر لگی چاکلیٹ کو چاٹتے ہوئے کہا۔

☆...☆...☆

"بی جان۔۔۔۔"

جگ سے گلاس میں پانی اُنڈیلتے ہوئے اس نے آہستگی سے سلطانہ بیگم کو مخاطب کیا جو بستر کے سرہانے سے ٹیک لگائے سامنے کھڑکی کے باہر سنہری دھوپ کو بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔ دل آویز کے مخاطب کرنے پر چونک کر اس کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھا پھر گہری سانس اپنے حلق سے خارج کی۔

گویا سمجھ گئیں ہو کہ وہ کیا کہنے والی ہے۔۔۔

"بی جان شادی کے رشتے محبت اور مرضی سے قائم کئے جائے تو برکت رہتی ہے ورنہ وقت کے ساتھ ساتھ دل پر بوجھ پڑنے لگتا ہے" کہتے کہتے اس کی آواز یکدم بھاری ہوئی تو بی جان نے بازو لمبا کر کے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

"کیا تجھے میرے فیصلے پر اعتماد نہیں۔۔۔" چہرہ جھکا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا تو ایک آنسو ٹوٹ کر اس کے سرخ رخسار پر آ کر ٹھہر گیا۔

"بات اعتماد کی نہیں پسندیدگی کی ہے بی جان۔۔۔میں ان کے قابل نہیں ہوں۔وہ اتنے سال پردیس میں رہے۔انکا کھانا،پینا،رہن سہن یہاں تک کہ بولی بھی مختلف ہے میں کیسے۔۔۔"وہ کہتے کہتے رُک گئی سسکی نے اس کے الفاظوں کی ترتیب بگاڑ دی تھی۔اُسے دیکھ کر بی جان ہلکا سا مسکرائیں۔

"درست کہا تم دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے مگر تو جانتی ہے تجھ میں اور آہل میں مشترکہ کیا ہے؟" وہ مستفسرانہ نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

دل آویز نے سر نفی میں ہلایا۔

"تم دونوں کی رگوں میں بہتا خون۔۔۔یہ خون بڑی بڑی دیواریں گرا دیتا ہے۔بڑے بڑے پہاڑ اور چٹانوں سے ٹکرانے کی طاقت ہوتی ہے اس میں۔۔۔اور تجھے لگتا ہے کہ وہ تجھے قبول نہیں کر پائے گا۔

اور بیٹا نکاح کا رشتہ تو سخت سے سخت دلوں کو بھی پگھلا دیتا ہے اور میرا آہل تو ویسے بھی محبت کرنے والا بچہ ہے۔وہ کبھی تجھ پر کوئی آنچ نہیں آنے دیگا"

وہ اب بھی پہلے کی طرح مطمئن نظر آرہی تھیں۔نا جانے کیا تھا۔ان کے لہجے میں جو اس کے اندر تک اطمینان بھر گیا تھا۔

بی جان کے سینے سے لگ کر اس نے آنکھیں موندلیں تھی۔ہر فکر اور بوجھ سے آزاد اس گھر میں ایک واحد بی جان تھیں۔جو اس کی سرخ آنکھوں کا راز جھٹ سے پہچان جاتی تھیں۔لہجے کی لرزش ہو یا بھوک کا مر جانا۔وہ دل آویز کی ساری بولیاں سمجھتی تھیں۔وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ رشتہ اس کی زندگی کی محرومیاں کم کر پائے گا یا اسکی مشکلات مزید بڑھا دے گا مگر وہ اتنا جانتی تھی کہ بی جان اس کو کبھی آگ میں نہیں جھونکے گیں۔

☆...☆...☆

حویلی پر رات اُتر گئی تھی۔ملازم اپنے اپنے کوارٹرز میں جا چکے تھے۔حویلی کے مکین بھی اپنے اپنے کمروں میں خواب خرگوشی میں مبتلا ہو چکے تھے۔وہ بی جان کو سُلا کر اوپر اپنے کمرے میں آگئی۔ یہ رات کا وہ پہر تھا۔جب وہ خود سے باتیں کیا کرتی تھی۔گھنٹو کھڑکی کے پاس کھڑی آسمان پر جھلملاتے چاند میں اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھا کرتی تھی۔

آج بھی پردہ ایک طرف کو کھسکا کر وہ کھڑکی کے باہر آسمان پر مسکراتے چاند کو دیکھنے لگی۔ باقی راتوں کی بانسبت آج کی رات زیادہ بوجھل اور خاموش تھی۔

اس حویلی میں وہ بس چند دن کی مہمان تھی۔ اس کے بعد وہ آہل کے ساتھ باہر چلی جائے گی۔ کریم کی بدتمیزیوں، ریما کے اکھڑے اکھڑے لہجے اور زلیخا چاچی کی بدسلوکیوں سے ہمیشہ کے لئے دور ایک پرسکون ملک میں جہاں اُسے اپنے سپنوں کی تعبیر ملنے والی تھی۔ اس نے بورڈز میں ٹاپ کیا تھا اور وہ آگے بھی پڑھنا چاہتی تھی۔ ایک بڑی رائٹر بننا چاہتی تھی۔ اپنے پیروں پر کھڑی ہو کر خود کو آہل کے معیار کے مطابق ڈھالنا چاہتی تھی۔

مگر ایک خدشہ تھا جو اندر ہی اندر اُسے ہمیشہ بے چین کر دیتا تھا۔ اگر میر آہل شادی کے باوجود بھی اس کو قبول نا کر سکا تو پھر وہ کیا کریگی؟؟ یہ وہ جُوا تھا جسے بس جیتنا ہی تھا۔ یہاں ہارنا وہ افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے بوجھل دل کے ساتھ کھڑکی کا پردہ برابر کر دیا اور بتی بجھا دی کیونکہ اگلی صبح اپنے ساتھ بہت کچھ لانے والی تھی۔

☆...☆...☆

میر آہل کی آمد کی خوشی نے حویلی میں ایک الگ رونق پھونک دی تھی۔ مانو برسوں سے ویران حویلی یکدم جی اُٹھی ہو۔ بی جان ملازموں کے سر پر کھڑی اُن کو ہدایت دیتی اِدھر سے اُدھر دوڑ رہی تھیں۔

"ایک ایک کونا اچھے سے صاف کرو، ارے بُلبُل تو نے آہل کا کمرہ تو سیٹ کر دیا نہ؟"

"ظفر کل مالی کو بُلوا کر یہاں لان کے گھاس کی کٹائی بھی کروا دینا"

انہوں نے اطراف پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا

"اور رنگ برنگے پھولوں کے نئے گملے بھی رکھوا دینا میرے آہل کو بہت پسند ہیں۔"

"دھیان سے کسی شہ کی کمی نہ ہو۔ مہمانوں کے رہنے کا انتظام دیکھ لینا۔ پورے گاؤں میں مٹھائی اور کپڑے بانٹوں۔۔۔ میرے گھر کی پہلی خوشی ہے کسی بھی چیز کی کمی نا ہونے پائے۔"

وہ ایک ایک کو ہدایت دے رہی تھیں اور ملازم ایک ایک کر کے سر کو خم دیتے اپنے اپنے حصے کے کام میں لگ گئے تو انہوں نے پاس کھڑے میر خلیل کو مخاطب کیا۔ جو پہلے ہی پیچھے ہاتھ باندھے ماں کے چہرے پر آئے دھنک کے رنگ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

"لگتا ہے بی جان پوتے کے آنے کی خوشی نے آپ کے گھٹنوں کا درد کم کر دیا ہے تبھی صبح سے ایک ٹانگ پر کھڑی سب ملازموں سے کام پر کام کروائے جا رہی ہیں آپ۔۔۔" وہ محظوظ ہوئے تھے۔

وہ بھی جواباً مسکرائی اور اثبات میں سر ہلایا۔۔

"اتنے سال بعد آ رہا ہے خوشی تو ہو گی نا۔۔۔ آنکھیں ترس گئی تھیں میری اس کی ایک جھلک دیکھنے کو اب جب وہ واقعی آ رہا ہے تو وقت گن گن کر کاٹ رہی ہوں میں"

ان کی بات پر میر خلیل مسکرائے

"بس کل کا دن گزار لیں بی جان پرسو صبح آ جائے گا آپ کا لاڈلا پھر جی بھر کر دیکھنا اس کو" میر خلیل ماں کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے بولے۔ دور افق پر اب سورج ڈھل رہا تھا اور آسمان پر ہلکی ہلکی نیلاہٹ پھیل رہی تھی۔

یہاں سے ذرا اوپر سر اٹھا کر دیکھو تو دل آویز اپنے کمرے کی کھڑکی سے لگ کر کھڑی حویلی کی چہل پہل دیکھ رہی تھی۔ سفید حویلی کو رنگ برنگی روشنیوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ جیسے جیسے دن گزر رہے تھے۔ اس کی سانسیں بھی حلق میں آ رہی تھیں۔ نا جانے وہ یہ زبردستی کا رشتہ کیسے نبھائے گی۔ اس کو دیکھ کر میر آہل کے تاثرات کیا ہونگے۔

اس کی سوچوں کا تسلسل ٹوٹا جب کسی نے زور سے اُسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا

"یہاں ماہ رانیوں کی طرح کیا کھڑی ہو دل آویز بی بی کتنے کام پڑے ہیں۔ یہ سب کام کیا تمہاری ماں قبر سے نکل کے کرے گی"

زلیخا نے دانت پیستے ہوئے کہا تو پل بھر کے لئے اُس کا حلق خشک ہوا۔

"چاچا۔۔چی وہ بی جان نے مجھے کمرے سے کم سے کم نکلنے کی ہدایت دی ہے"

تھوک نگلتے ہوئے اُس نے بمشکل کہا

"ایک بات کان کھول کر سُن لو بی بی"

وہ خون رنگ ہوتی آنکھوں کو اس کی آنکھوں میں ڈالتے ہوئے تھوڑا قریب آئیں اور سرگوشی کرتے ہوئے بولیں تو دل آویز کا دل کسی نے مٹھی میں لیا۔

"جس طرح تمہاری ماں نے میرے حق میں ڈاکا ڈالا تھا میں تمہیں اپنی بیٹی کے حق میں ڈاکا نہیں ڈالنے دوں گی۔ تمہیں کیا لگتا ہے تم آہل سے شادی کر کے پر دیس جا کر ایش کرو گی۔۔۔ ہر گز نہیں ابھی زلیخا زندہ ہے اور میرے جیتے جی ایسا کبھی نہیں ہو گا" انہوں نے حقارت سے دل آویز کا بازو جھٹکا اور پیر پٹختے ہوئے وہاں سے نکل گئیں۔

اپنے کمرے میں آ کر انہوں نے دروازہ لاک کیا اور قدم قدم چلتے ہوئے سنگھار میز کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئیں۔ جامنی رنگ کے لباس میں ان کی سانولی رنگت مزید دب گئی تھی۔ سارا قصور اس سانولے رنگ کا تھا جو انکی خوشیوں کے آڑے آ گیا تھا۔ انہوں نے دونوں ہاتھ میز پر جمائے اور آگے کو جُھکی تو پشت پر گری چُٹیا آگے کو جھول گئی۔ جس میں سے کچھ بال بے ترتیبی سے چٹیا سے نکل رہے تھے۔

"رابعہ نے بھی مجھ سے میری خوشیاں چھین لیں تھی اور آج پھر ماضی خود کو دھرا رہا ہے۔ آج اس کی بیٹی میری بیٹی کی خوشیاں چھیننے جا رہی ہے۔" انہوں نے غصے سے میز پر رکھی چیزیں ہاتھ مار کر گرا دیں۔ تو وہاں رکھا زلیخا اور میر خلیل کی تصویر کا فوٹو فریم بھی گر کر چور چور ہو گیا۔ جس میں وہ ساتھ کھڑے مسکرا رہے تھے۔ ہنستی مسکراتی تصویروں کے پیچھے چھپے دکھ تاحیات اذیت دیتے ہیں۔

ایک درد کی لہر ان کو اپنے دل میں اُٹھتی محسوس ہوئی۔ یکدم ارد گرد کا منظر بدلا اور آس پاس کا شور مدھم ہوتا چلا گیا۔ آنکھوں کے سامنے ماضی گھوم گیا۔

("بی جان میں زلیخا سے کبھی شادی نہیں کروں گا میرے دل میں ہمیشہ سے رابعہ تھی اور وہ ہی میری دلہن بنے گی."

وہ طیش میں بولے

"مگر بیٹے تیرا اور زلیخا کا رشتہ تو بچپن میں ہی طے کر دیا گیا تھا اور رابعہ تو گھر کے ملازم کی بیٹی ہے لوگ کیا کہیں گے ہمارے بارے میں."

سلطانہ بیگم نے تحمل سے بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کی مگر میر فیصل کچھ سننے کو تیار ہی نہیں تھے۔ وہ میر فرقان اور سلطانہ بیگم کے لاڈلے بیٹے تھے۔ نا چاہتے ہوئے بھی انہیں میر فیصل کی ضِد کے آگے جھکنا پڑا اور شوہر کے

انتقال کے بعد ان کے تین بیٹے ہی ان کا سرمایہ تھے۔ وہ چاہ کر بھی ان کو ناراض نہیں کر سکتی تھیں اور پھر کہی نا کہی انہیں رابعہ کے طور طریقے، سگھڑپن اور خوبصورتی متاثر کرتی تھی۔ کہنے کو وہ انکے ملازم کی بیٹی تھی مگر اس کے آجانے سے بی جان کے دل میں جو بیٹی نا ہونے کی کمی تھی وہ پوری ہو گئی تھی اور زلیخا ان کے دیور کی بیٹی تھی مگر اس کی تیز زبان اور سخت رویے کی وجہ سے وہ زلیخا کو کبھی اس طرح سے قبول نہیں کر پائیں۔ جیسے انہوں نے رابعہ کو کیا تھا۔

رشتوں کی ڈور درمیان میں آگئی تھی ورنہ وہ خود بھی ہمیشہ سے رابعہ کو ہی اپنی بہو بنانا چاہتی تھیں اور اب میر فیصل کی ضد نے کہی نا کہی یہ کام خود بخود آسان کر دیا تھا۔

"رُباب میں تو اب بھی تمہاری زلیخا کو اپنی بہو بنانا چاہتی ہوں اگر رشتوں کی محبت اور تمہارا خیال نا ہوتا تو خلیل کا رشتہ کیوں لاتی میں ہماری زلیخا کے لئے.." وہ رُباب کو شانت کرتے ہوئے بولیں جو فیصل کے بجائے خلیل کا رشتہ لانے پر بوکھلا سی گئی تھیں۔

ڈرائنگ روم میں اس وقت میر عثمان، سلطانہ بیگم اور رُباب موجود تھے۔ پورے کمرے میں سکوت سا چھا گیا تھا گویا کوئی مر گیا ہو۔ زلیخا پردے کی اوٹ میں کھڑی ساری باتیں سُن رہی تھی۔۔۔

"مگر میری بیٹی ایک عمر فیصل کے نام پر بیٹھی رہی سلطانہ بھابی"

میر عثمان ادب سے بولے

"اور اب آپ کہہ رہی ہیں کہ فیصل کو ملازم کی بیٹی رابعہ پسند ہے۔ آپ کیسے ایک ملازم کی بیٹی کا موازنہ میری زلیخا سے کر سکتی ہیں" ناچاہتے ہوئے بھی ان کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔ خلیل کا نام سنتے ہی زلیخا کے پیروں تلے جیسے زمین کھسک گئی تھی۔ اس نے زور سے پردے کو بھینچ لیا۔

"دیکھو میر عثمان تم نے آج تک بھابھی ہونے کے ناتے میری کوئی بات نہیں ٹالی ہمیشہ میرا بھرم رکھا۔۔ آج بھی رکھ لو میر فرقان کو کھونے کے بعد مجھ میں اتنی سکت نہیں کہ اپنا ایک بیٹا بھی کھو دوں"

انہوں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے سر جھکا دیا تو رُباب اور میر عثمان شرمندہ سے آگے کو ہوئے۔

"بھابی آپ ہماری بڑی ہیں۔ اس طرح ہاتھ مت جوڑیں، کیوں گنہگار کر رہی ہیں آپ ہمیں"

کہتے کہتے رُباب کی آنکھ بھی بھر آئی۔

"جی بھابی رُباب صحیح کہہ رہی ہے مجھے معاف کر دیں میں نے آپ سے گستاخی کی، جیسا آپ کہیں گی ویسا ہی ہو گا بھابی۔۔۔ ہمیں زلیخا کے لئے میر خلیل کا رشتہ منظور ہے۔ ویسے بھی ہماری بیٹی آپ کے بڑے بیٹے کی دلہن بنے یا چھوٹے بیٹے کی اس سے فرق نہیں پڑتا۔"

اور یہ الفاظ پردے کے اوٹ میں کھڑی زلیخا کے دل میں پھانس کی طرح چبھے تھے۔ ہمارے لئے یہی بہت ہے کہ زلیخا آپ کے گھر جا رہی ہے۔

وہ کہتے ہوئے اب بلکل مطمئن لگ رہے تھے۔ اس بات سے انجان کے پردے کی اوٹ میں کھڑی زلیخا کے دل پر کیسے خنجر چل گئے تھے یہ سب سن کر)

رشتوں کی پاسداری انسان سے کیا کچھ نہیں کرواتی۔۔۔ بہت سے لوگوں کے ٹوٹے دل اور آہوں کی گرمائش سے رشتے بنتے ہیں اور پھر بھی ان کی ڈور ریشم کے دھاگے کی طرح نازک ہوتی ہے۔ ہلکی سی غفلت سے ٹوٹ جاتی ہے۔

"ایک معمولی دو ٹکے کے ملازم کی بیٹی مجھ سے میرا نصیب چھین کر لے گئی۔ میری خوشیاں میرا سکون سب کھا گئی وہ کمینی.."

ماضی دھویں کی طرح اڑ گیا تھا۔ وہ اب بھی شیشے کے سامنے کھڑی سرگوشی کر رہی تھی۔ اس کی سرگوشی کمرے میں ہیجان پیدا کر رہی تھی۔

☆...☆...☆

گاؤں میں میلہ سا لگ گیا تھا۔ سیاہ رنگ کی پجیرو حویلی کے دروازے پر رُکی تو اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ کھڑکی کے پردے کو ذرا سا سرکایا اور اس کا سانس ساکت ہو گیا۔

میر آہل نے سیاہ چمکدار جوتے زمین پر رکھے اور سر کو خم دیتا ہوا وہ کوٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے گاڑی سے باہر نکلا۔ اس نے سیاہ سوٹ پہن رکھا تھا۔ بالوں کو جیل کی مدد سے دائیں جانب جمائے، آنکھوں پر سیاہ گوگلز ٹکائے وہ ہمیشہ کی طرح پر وقار اور ہینڈسم نظر آرہا تھا۔ سورج کی شعاعوں میں چمکتا اس کا مردانہ چہرہ اور اس پر آہل کے سنجیدہ اور سپاٹ سے تاثرات، اس کو مزید پر وقار بنا رہے تھے۔

میر آہل کو دیکھ کر زلیخا کے برابر میں کھڑی ریما کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ جس کے دانتوں پر چاکلیٹ اب بھی لگی ہوئی تھی۔ جو وہ کچن میں کھڑی کھانے میں مگن تھی جب زلیخا اُسے بازوؤں سے گھسیٹ کر باہر لے آئی تاکہ وہ آہل کی نظروں میں آ سکے۔ زلیخا نے ریما کا کھلا منہ دیکھا تو زور سے ٹہوکا دیا۔

"ارے بد دماغ منہ بند کرو ورنہ ایک نظر دیکھنے کے بعد وہ دوسری بار تیری شکل نہیں دیکھے گا" انہوں نے ناگواریت سے کہا تو وہ فوراً سنبھل گئی۔ منہ بند کر کے زبان دانتوں پر پھیری پر دھیمی سی مسکان چہرے پر سجالی۔

اس نے دھوپ کی وجہ سے آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کرتے ہوئے دروازے پر کھڑی بی جان کو دیکھا جن کے چہرے پر اُس کے آنے سے دھنک کے سارے رنگ بکھر گئے تھے۔ میر خلیل گاڑی سے اُتر کر اس کے عقب میں آکر کھڑے ہو گئے اور اُسے اندر چلنے کا کہا۔ ملازم گاڑی سے اس کا بیگ نکال رہے تھے۔ اس نے اندر جانے سے پہلے سر سری انداز میں سر اٹھا کر دیکھا تو اوپر کھڑکی پر اُسے ہیولہ سا نظر آیا۔ اس نے لمحے بھر کے لئے آنکھیں سکوڑ کر دیکھا تھا مگر پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

دروازے پر کھڑی بی جان نے لپک کر اُسے اپنے سینے سے لگایا اور زار و قطار رونے لگیں۔

آہل نے جھک کر ان کے ہاتھ کی پشت کو چوم کر آنکھوں سے لگایا۔

"بی جان رو کر ہی استقبال کرنا تھا تو بہتر تھا میں نہیں آتا" اس نے نرمی سے کہا تو بی جان نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔۔

"تجھے دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی تھیں۔ اب تو مر بھی جاؤں تو غم نہیں پُتر۔۔۔"

"اوہو میری پیاری بی جان ایسی باتیں مت کریں ابھی آپکو دو سو سال اور جینا ہے وہ بھی میرے ساتھ" وہ بازو ان کے گرد حمائل کرتے ہوئے بولا تو سب مسکرانے لگے۔

"اپنی بی جان سے ہی باتیں کرتے رہو گے یا اپنی چاچی سے بھی ملو گے" انہوں نے مصنوعی انداز میں استفسار کیا تو اس کی مسکراہٹ سمٹی۔۔۔ ماضی ایک پل کے لئے آنکھوں کے سامنے گھوما مگر اس نے فوراً سر جھٹک کر سر کو خم دیتے ہوئے سلام کیا اور پھر بی جان کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"Height of hypocrisy....." اس نے دل ہی دل میں تبصرہ کیا تھا۔

وہ سب بیٹھک میں موجود تھے گھر کا ہر فرد تھا وہاں سوائے دل آواز کے۔

"یہ دل آویز کدھر رہ گئی زلیخا۔۔۔۔ پردیس سے آہل آیا ہے اور وہ ہے کہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی"
میر خلیل نے اس کی غیر موجودگی کو بھانپتے ہوئے استفسار کیا۔

"پتہ نہیں اپنے کمرے میں سو رہی ہوگی اُسے کیا خبر گھر میں کیا چل رہا ہے کون آ۔۔ جا رہا ہے۔ اب ہر کوئی میری بیٹی ریما جیسا تو نہیں ہوتا." پاس بیٹھی بھاری بھرکم ریما کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"جب سے سنا ہے کہ آہل پردیس سے آ رہا ہے۔ بس انتظامات دیکھنے میں مصروف ہے میری بچی۔۔۔ صبح سے بس کام ہی کر رہی ہے ایک پل کو فرصت نہیں۔" انہوں نے ہاتھ نچاتے ہوئے اپنی بیٹی کے سگھڑپن پر تبصرہ کیا تو میر خلیل برہمی سے زلیخا کو بس دیکھتے رہ گئے۔ بی جان نے بھی ایک ناپسندیدہ نگاہ زلیخا پر ڈالی جبکہ میر آہل نے لاتعلقی سے شانے اچکا دیئے جیسے اُن کی آواز کانوں تک پہنچی ہی نہیں ہو۔

ریما گاہے بگاہے آہل کو کن اکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔

"اُف بچپن میں دیکھا تھا تب تو مناسب سا ہی لگتا تھا۔ مگر اب تو کڑیل جوان ہو گیا ہے۔ ہئے ریما تیری اور اُس کی جوڑی کیا فِٹ رہے گی"

وہ انگلی پر لٹ لپیٹتے ہوئے مسکرائی۔ ریما کے مسلسل دیکھنے سے آہل کو کوفت محسوس ہر رہی تھی۔

☆...☆...☆

وہ پتھر کا مجسمہ بنی جہاں کھڑی تھی وہی کھڑی رہ گئی۔

محبت۔۔۔

کسی نے آہستہ سے اس کے کانوں میں سرگوشی کی تو اس نے چونک کر اپنے اردگرد گھوم کر دیکھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ سوائے اُن دو مغرور بھوری آنکھوں کے جو اس نے کچھ لمحے پہلے دیکھی تھیں۔

کیا ایسا ہوتا ہے محبت کا احساس۔۔۔؟ اس نے خود سے پوچھا تھا۔ ایک عجیب سے احساس نے اس کے من کو گُدگدایا تھا۔

اس کی سوچوں کا تسلسل تب ٹوٹا جب ملازمہ نے دروازے پر دستک دے کر اسے بی جان کا (نیچے آنے کا) حکم سنایا تھا۔ وہ گھبر اسی گئی۔ اس نے آخری بار میر آہل کو نو سال پہلے دیکھا تھا اور تب سے لیکر آج تک اس نے محض اس کی تصویریں دیکھی تھیں۔ اس کی باتیں سنی تھی مگر آج جب وہ حویلی میں تھا تو اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیسے اس شخص کا سامنا کرے گی۔ وہ بھاری قدموں کے ساتھ کمرے سے باہر آئی اور ریلنگ سے جھک کر نیچے دیکھا تو یہاں سے اُسے آہل کی پشت دکھائی دی۔ وہ جھٹ سے دو قدم پیچھے ہٹی۔ دل آویز کو اپنی سانس درمیان میں اٹکتی محسوس ہوئی مگر بی جان کا حکم تھا وہ ٹال نہیں سکتی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ چائے کی ٹرے لئے بیٹھک میں داخل ہو رہی تھی۔ اب وہ پہلے سے بہتر حالت میں تھی مگر ہاتھ کی لرزش ہنوز برقرار تھی۔ اسے دیکھ کر جہاں بی جان اور میر خلیل کے چہرے پر بشاشت پھیلی تھی وہاں زلیخا اور ریما نے ایک غلط نگاہ اس کے خوبصورت اور چمکدار سراپے پر ڈالی تھی۔

اُس نے دیکھا کہ کوئی ہلکے گلابی رنگ کی فراک اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس لڑکی چائے کی ٹرے لئے بیٹھک میں داخل ہوئی ہے۔ میر آہل نے پہلو بدلا تھا۔ اور اب وہ ایک ایک کر کے سب کو ادب سے جھک کر چائے سرو کر رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر بل پڑے۔

اب اس کا رخ بی جان کی طرف تھا۔ میر آہل سپاٹ چہرہ لئے زمین کی جانب دیکھتا رہا۔ جب دل آویز نے دھڑکتے دل کے ساتھ چائے کا کپ اس کی جانب بڑھایا تھا۔ آہل نے دیکھا کہ چمکتے دودھیا پیروں کا رُخ اس کی جانب ہے اور اس کے خوبصورت نازک ہاتھ جو ہلکی سی کپکپی لئے ہوئے ہیں۔ چائے کا کپ ادب سے پکڑے اُس کے منتظر ہیں۔

میر آہل نے ایک گہری سانس ہوا میں خارج کی۔

بس ایک لمحہ۔۔۔ بس ایک لمحے کے لئے اس نے نظر اٹھا کر دل آواز کو دیکھا تھا اور پھر جلدی سے چائے کا کپ تھام کر رُخ بی جان کی جانب موڑ لیا۔

"اونہوں۔۔۔ بی جان کو لگتا ہے میں اتنا کمزور مرد ہوں جو ذرا سی خوبصورتی دیکھ کر کمزور پڑ جاؤں گا۔

میں میر آہل ہوں. ایسی ہزاروں لڑکیاں میری ایک نظر کی منتظر رہتی ہیں۔ میں کبھی اُسے قبول نہیں کروں گا۔ یہ لڑکی کبھی بھی میرے دل میں جگہ نہیں بنا پائے گی"

اس نے دل ہی دل میں کہتے ہوئے چائے کا کپ لبوں سے لگایا اور لمحے بھر کے لئے ٹھٹک کر رہ گیا۔

یہ سب سوچتے ہوئے میر آہل اس بات سے یکسر انجان تھا کہ اوپر والا اسی عورت کی محبت کی رسی اس کے گلے میں ڈالنے والا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر بیٹھک کے دروازے کی جانب دیکھا۔ جہاں سے وہ ابھی نکلی تھی۔ اس نے سوچتی نظروں سے اس کی پشت کو گھورا تھا۔

"میر خلیل نکاح کی تیاریاں شروع کردو ہر طرف شادیانے بجنے چاہئے پورے گاؤں میں خبر کردو کہ میر آہل اور ہماری دل آویز کی شادی ہے" بی جان پرجوشی سے کہہ رہی تھیں۔

"بی جان اتنا جھمیلا کرنے کی ضرورت نہیں ہے بس سادگی سے نکاح کر دیں مجھے اگلے ہفتے فوراً انگلینڈ واپس جانا ہے۔ میرے پیچھے بہت سے کام رہتے ہیں۔ جو میری غیر موجودگی میں نہیں ہو سکتے"

اس نے ضبط سے اپنی بات مکمل کی وہ بلکل بھی اس تام جھام کے حق میں نہیں تھا۔

"ارے ایسے کیسے حویلی کی پہلی خوشی ہے۔ اس دن کا تو میں نے برسوں انتظار کیا ہے۔ مجھے اپنے تمام شوق اور ارمان پورے کرنے دے۔" انہوں نے محبت سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو وہ محض مسکرا سکا۔ وہ بی جان کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر مزید کچھ نہیں کہہ پایا تھا۔

"بی جان میں ذرا تھک گیا ہوں۔۔۔ فریش ہو کر آرام کرنا چاہتا ہوں۔" وہ غیر آرام دہ سا اپنے کوٹ کو بازو پر ڈالتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تو باقی سب بھی کھڑے ہو گئے۔ وہ مزید یہ ساری گفتگو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

"ہاں ہاں آہل بیٹا ریما ہے نا تمہیں تمہارے کمرے تک چھوڑ دے گی۔" زلیخا نے فوراً ریما کو آنکھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ لپک کر آگے آئی اور جھپٹ کر اس کے بازو پر دھرا کوٹ لے لیا۔

آہل نے ضبط سے گہری سانس لی۔ وہ یہاں چند دن کا مہمان تھا اور کسی بھی قسم کی بدمزگی نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے خاموشی سے ریما کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ زلیخا نے دونوں کو حسرت سے ساتھ زینے چڑھتے ہوئے دیکھا تو چہرے پر خوشگواری چھا گئی۔

بی جان نے ناگواری سے زلیخا کے چہرے کو دیکھا تھا

"یہ جو تم کر رہی ہو نا بہو یہ ٹھیک نہیں ہے۔" وہ ضبط سے بولیں۔

"اور جو آپ نے کیا تھا میرے ساتھ ٹھیک تو وہ بھی نہیں تھا بی جان" اس کے لہجے میں سالوں کی کڑواہٹ در آئی۔

"بہو وہ کہاوت تو سُنی ہو گی نا تم نے جو چیز جب نصیب میں نہیں ہوتی تو دانتوں کے درمیان میں بھی ہو تو انسان کو نہیں ملتی"

سلطانہ بیگم نے کہتے کہتے نظر اٹھا کر زلیخا کے پھیکے پڑتے چہرے کو دیکھا تھا۔

"اور جو چیز نصیب میں لکھ دی گئی ہو تو پھر دو پہاڑوں کے درمیان بھی دفن ہو تو حقدار تک پہنچ جاتی ہے۔"

انہوں نے لاپرواہی سے شانے اچکا دیئے اور آگے بڑھ گئیں۔

میر خلیل نے دکھ اور شرمندگی سے سر مزید جھکا دیا اور ایک پل بھی ضائع کئے بغیر وہاں سے نکل گئے۔

ان کے لئے مزید یہ باتیں سُننا بہت مشکل تھا۔ زندگی کا ایک طویل حصہ انہوں نے اندھوں اور بہروں کی طرح گزارا تا کہ وہ جانے انجانے میں اپنی ماں کا دل نا دکھا دیں۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی بیوی ان کو نہیں بلکہ ان کے بڑے بھائی فیصل کو پسند کرتی آئی ہیں۔ وہ چاہ کر بھی کبھی اپنی بیوی کے دل میں وہ مقام اور جگہ نا لے سکے۔ جس کے وہ حقدار تھے۔

اپنی زندگی ایک ایسی عورت کے ساتھ کاٹی جس نے کبھی انہیں شوہر کے طور پر قبول کیا ہی نہیں تھا۔

بیٹھک کی کشیدگی کو ایک جانب رکھ کر باہر زینوں کی طرف آ و تو ریما پٹر پٹر اپنی للو چلا رہی تھی۔ جس نے میر آہل کا دماغ آدھا خراب کر دیا تھا۔

"میرے تو اور بھی بہت سے کارنامے ہیں اگر سنیں گے تو دنگ رہ جائیں گے۔ میں تو ہمیشہ سے ہی ہر چیز میں بہت آگے رہی ہوں پھر چاہے وہ پڑھائی ہو یا گھر گرہستی، اللہ کا شکر ہے میں نے کبھی کسی کو مایوس نہیں کیا۔" وہ شانِ بے نیازی سے اپنے قصیدے سنا رہی تھی اور اس وقت میر آہل کو واقعی اپنی باتوں سے مایوس کر رہی تھی۔ آہل نے آپس میں ہونٹ ضبط سے دباتے ہوئے کنپٹی پر ہاتھ پھیرا تھا۔

"یہ لیں جی آپ کا کمرہ آ گیا"

اس نے دروازہ دھکیلا اور اُسے ایک ہاتھ سے کمرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میر آہل نے ایک نظر کمرے کی طرف دیکھا۔۔۔ کمرہ کافی نفاست سے سیٹ کیا گیا تھا۔ ہلکے رنگ کے پردے، تکیوں اور کشن سے سجا جہازی بیڈ درمیان میں گرے رنگ کا نرم سا کالین کا ٹکڑا بچھا ہوا تھا۔ جس پر مختلف رنگ کے بڑے اور چھوٹے کشن رکھے ہوئے تھے۔ کھڑکی کے پاس ایک چھوٹا سا اسٹڈی ٹیبل رکھا ہوا تھا۔ جس پر ایک سیاہ رنگ کا فوٹو فریم رکھا تھا۔

جس میں آہل، میر رحمان اور سمیرا کی ایک پرانی تصویر لگی تھی۔ اس تصویر میں وہ ہنستے مسکراتے نظر آ رہے تھے کسی مکمل فیملی کی طرح، میر آہل خواب کی کیفیت میں چلتا اسٹڈی ٹیبل تک گیا اور فوٹو فریم اٹھایا۔ آنکھ میں ہلکی سی نمی اتری۔ آنکھوں کے آگے بہت سے منظر گھومے۔ اس حویلی میں اس نے اپنے دل کے دو ٹکڑے کھوئے تھے۔ وہ کبھی یہاں لوٹ کر نہیں آنا چاہتا تھا کبھی بھی نہیں۔۔۔ اس کی یادوں میں خلل ریما کی بھاری چبھتی ہوئی آواز نے ڈالا تھا۔

"اُف بہت محنت سے میں نے یہ کمرا خاص آپ کے لئے" خاص پر قدرے زور دیتے ہوئے کہا....

"سیٹ کیا ہے امید ہے۔ آپ کو پسند آیا ہو گا آہل۔۔۔"

"بھائی۔۔۔"

اس نے آہستگی سے فریم واپس جگہ پر رکھا اور ایڑیوں کے بل گھوما تو چہرہ سپاٹ اور ماتھے پر چند بل تھے اور آنکھ کا کنارا بلکل خشک ہو گیا تھا۔

"آہل بھائی۔۔۔"

دوبارہ کہتے ہوئے اس نے لفظ "بھائی" پر زور دیتے ہوئے اُسے جیسے باور کروایا کہ وہ یہاں کس حیثیت سے کھڑا ہے اور اس کا کیا مقام اور رتبہ ہے۔

ریما کی پٹر پٹر چلتی زبان کو یکدم بریک لگا۔ وہ جواب میں کچھ بھی کہہ نہیں سکی محض اثبات میں سر ہلا دیا۔

"جی آہل بھائی آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو بتا دیجئے گا" اس کا سارا جوش ایک دم جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور آواز دب گئی۔

"میرا کمرہ یہی۔۔۔۔"

"جاتے ہوئے دروازہ بند کر دینا"

میر آہل نے کسی حاکم کی طرح بے نیازی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا اور اپنے سفری بیگ سے کپڑے نکالنے لگا۔ جو ابھی کچھ دیر پہلے ملازم رکھ کر گیا تھا۔ الفاظ ابھی ریما کے منہ میں ہی تھے جب میر آہل اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ گیا۔ وہ کچھ دیر بے یقینی سے اس کی پشت کو گھورتی رہی اور پھر کمرہ مقفل کر کے باہر آ گئی۔

"اونہوں۔۔۔ شادی سے پہلے تو سب ہی بھائی بہن ہوتے ہیں۔" وہ زینے اترتے ہوئے لاپرواہی سے شانے اُچکا گئی۔

جیسے ہی دراوزہ بند ہوا اس کے کپڑے نکالتے ہوئے ہاتھ رُک گئے۔ اس نے پلٹ کر اس فوٹو فریم کو دیکھا اور کھڑکی سے باہر اترتی شام کو دیکھتے دیکھتے ناجانے کن خیالوں میں کھو گیا۔

☆...☆...☆

حویلی پر رات کی چاندنی اُتری تو رنگ برنگی قمقمے جھلملانے لگے۔ کھانے کی میز پر طرح طرح کے پکوان سجے تھے۔ جِن سے اٹھتی اشتہار انگیز خوشبو ریما کی نیت خراب کر رہی تھی۔ مگر زلیخا کی کھا جانے والی آنکھوں نے اُسے اب تک باز رکھا ہوا تھا۔ ہر چیز آہل کی پسند کی تھی۔

"جاؤ دل آویز آہل کو کھانے کے لئے بلا کر لاؤ" بی جان نے سربراہی کرسی سنبھالتے ہوئے کہا تو برتن لگاتے ہاتھ لمحے بھر کے لئے ٹھٹکے۔

"ب۔۔ بی جان م۔۔ میں بُلا کر لاؤں؟" اس نے جھجکتے ہوئے ان کی بات دہرائی۔ جیسے اُسے سننے میں غلطی ہوئی ہو۔

"ارے دل آویز کیوں، میں بُلا کر لاتی ہوں۔۔۔" ریما جھٹ سے اٹھنے لگی تو بی جان نے ہاتھ اٹھا کر اُسے دوبارہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"جاؤ دل آویز آہل کو بُلا کر لاؤ" لہجہ اتنا ٹھوس تھا کہ وہ بنا کسی چُوں چرا کے ڈائننگ روم سے نکل گئی۔

وہ جلدی جلدی زینے پھلانگتے ہوئے اوپر جا رہی تھی کہ آخری سیڑھی پر اُسکا اور دل آویز کا سامنا ہوا۔

بس ایک لمحے کے لئے دل آویز نے نظر اٹھا کر اس کے سراپے کو دیکھا تھا۔ خوبصورت مردانہ جسامت کا وہ اونچا لمبا شخص اب نہا دھو کر سفید رنگ کی شلوار قمیض میں کافی فریش اور ہینڈسم لگ رہا تھا۔ اُس نے فوراً جھینپتے ہوئے نظریں گرا دیں۔

آہل نے رُخ دائیں جانب موڑا تو غیر دانستہ طور پر دل آویز بھی دائیں جانب کو مُڑی۔ وہ ایک بار پھر آمنے سامنے کھڑے تھے۔ دل آویز کا دل زور سے ڈھڑکا وہ تذبذب سا بائیں جانب کو مُڑی تو آہل بھی اُسی لمحے بائیں جانب کو مڑا۔

"میرے اللہ یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں۔۔۔" دل آویز نے دل ہی دل میں کہتے ہوئے نا جانے خود کو اندر ہی اندر کیا کچھ کہا تھا۔

آہل نے ضبط سے گہری سانس لی اور اُسے شانوں سے پکڑ کر ایک جانب کیا اور تحمُل سے زینے اتر گیا۔

اُس نے سیکنڈ کی رفتار سے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تھا۔ حویلی کی ساری بھاگ ڈور اور گردشیں یکدم تھم سی گئی تھیں۔ زمین سے لے کر آسمان تک ہر شہہ رُک گئی تھی۔ وہ اُسی شانِ بے نیازی سے سیڑھیاں اُتر رہا تھا۔ وہ اُسے دیکھتی چلی گئی یہاں تک کہ وہ صحن عبور کر کے کمرے کے اندر غائب ہو گیا۔ دل آویز جہاں تھی وہی کی وہی کھڑی رہ گئی۔ وہ ایک قدم ہل نہیں سکی وہی دیوار سے کمر ٹکا کر اپنی دھڑکن محسوس کرتی رہی۔

☆...☆...☆

ڈائننگ روم میں واپس آؤ تو سب کھانے کی ٹیبل پر آہل کے منتظر تھے۔

ریما کے پیٹ میں دس۔۔ دس من کے چوہے کُود پھلانگ رہے تھے۔ مگر مجبوری تھی کیا کر سکتے تھے۔ میر آہل کمرے میں داخل ہوا تو ریما کی جان میں جان آئی۔

اس نے پہلی فرصت میں بریانی اور ریشمی کباب سے اپنی پلیٹ پر مینار پاکستان تعمیر کر لیا تھا۔

جِسے دیکھ کر زلیخا تو شرمندہ نظر آ ہی رہی تھی اور میر آہل نے بھی اپنی مسکراہٹ دبانے کے لئے ہاتھ منہ پر رکھا تھا۔

"اُفففف" اس نے اندر ہی اندر جھرجھری لی۔

تھوڑی دیر بعد دل آویز بھی ڈائننگ روم میں داخل ہوئی بس ایک ہی دن میں اس کے چہرے کی رنگت کِھل سی گئی تھی۔ بی جان نے اُسے پیار سے دیکھا تھا۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر اندر تک جیسے سکون اتر گیا تھا۔ اس نے خاموشی سے پلیٹ میں چاول ڈالے اور کھانے لگی۔ بھوک تو جیسے مر گئی تھی۔

دل میں ہزاروں نئے خواب پنپ رہے تھے۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس میں عجیب سی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

"آہل بیٹا تمہاری واپسی کب ہے" میر خلیل نے چاولوں کا چمچ منہ میں رکھتے ہوئے سرسری سا سوال کیا۔

"بس نکاح کے دو دن بعد فوراً واپس جانا ہے کچھ پراجیکٹس پر فوراً کام شروع کرنا ہے۔" اس نے کباب کا ٹکڑا منہ میں رکھا۔

"ارے آہل چکن تکہ تو لیا ہی نہیں تم نے" لفظ پراجیکٹ پر زلیخا کی آنکھیں چمکی تھیں۔ فوراً سے ٹِرے آگے کی اور آہل کی پلیٹ میں چکن کی بوٹیاں ڈالنے لگیں۔ جسے آہل نے انکار کر دیا۔

"چاچی میں رات میں زیادہ نہیں کھاتا" آہل کے چہرے پر سپاٹ سے تاثرات تھے۔

"ہاں آہل" ریما جوش سے کچھ کہہ رہی تھی لفظ

"آہل" پر اُس کی ٹھنڈی نگاہوں سے دیکھنے پر فوراً تکیہ کلام بدل گئی۔

"آہل بھائی ڈائیٹنگ پر ہونگے" آہستگی سے جملہ مکمل کیا تو آہل نے رُخ پھیر لیا۔

بی جان نے اس بات کو فوراً نوٹس کیا تھا مگر بولیں کچھ نہیں محض مسکرائیں اور پانی کا گلاس لبوں سے لگایا۔

"میرا انتخاب بلکل درست تھا" دل ہی دل میں تبصرہ بھی کیا۔

"یہاں ہماری اتنی زمینیں ہیں، کھیت ہیں اور یہ حویلی سب تیرا ہی تو ہے پُتر کب تک میر خلیل ان سب کی دیکھ بھال کرے گا۔ اب وقت آگیا ہے کہ تو اپنی ذمہ داریاں یہاں رہ کر نبھائے"

بی جان کے تبصرے پر میر خلیل کا منہ میں رکھنے والا ہاتھ لمحے بھر کو رُکا، نظر اٹھا کر بی جان اور پھر میر آہل کو دیکھا پھر دھیما سا مسکرائے اور برابر میں بیٹھے میر آہل کے شانوں پر ہاتھ رکھا۔

"بی جان بلکل صحیح کہہ رہی ہیں آہل اب وقت آ گیا ہے کہ تم یہاں اپنے حصے کی ذمہ داریاں نبھاو" چہرے پر نرم سا تاثر تھا جیسے بچپن میں ہوا کرتا تھا۔ آہل نے گردن ترچھی کر کے بس ایک نظر میر خلیل کو دیکھا تھا۔

اب وہ پہلے جیسے جوان نہیں دکھتے تھے۔ سر اور داڑھی کے بال جگہ جگہ سے سفید ہو گئے تھے۔ چہرہ بھی پھیکا پھیکا سا تھا۔ جس پر برسوں کی تھکاوٹ نظر آتی تھی۔ اگر کچھ نہیں بدلا تھا تو وہ اُن کی آنکھوں کا رنگ اور چہرے کی مسکراہٹ تھی مگر آنکھوں میں پہلی جیسی چمک نہیں تھی۔

"نہیں بی جان ایسا ممکن نہیں ہے میں جانے کے لئے ہی واپس آیا ہوں۔ پلیز آپ ضد مت کیجئے گا، میں پوری نہیں کر سکوں گا"

اس نے نیپکن سے ہونٹوں کے کنارے صاف کئے۔ بی جان مزید کچھ نہیں بولیں۔ وہ میر آہل کا انداز پہچان گئی تھیں۔ انہیں اس کی آنکھوں میں اٹھتا کرب محسوس ہوا۔

"ارے دل آویز بچے جاو آہل کے لئے میٹھا لے آو" آہل کا ذہن بٹانے کے لئے بی جان نے بات بدلی۔

"جی بی جان" کہتے ہوئے وہ کچن میں چلی آئی اور فریج سے میٹھے کا کٹورا نکالنے لگی تو کھڑکی کے باہر برآمدے میں اُسے کریم سگریٹ پھونکتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے تاثرات بگڑے کریم کی اس کی جانب پشت تھی۔ اس لئے وہ دل آویز کی موجودگی سے بے خبر تھا۔ اس نے جلدی سے کٹورا نکالا اور کچن سے باہر نکل گئی۔ وہ واپس کمرے میں آئی تو سب کھانا ختم کر چکے تھے اور میٹھے کے منتظر تھے۔ اس نے ٹیبل پر کٹورا رکھا اور ایک ایک کر کے سب کو میٹھا سرو کرنے لگی۔

دل آویز نے میٹھے کا پیالہ میر آہل کی جانب بڑھایا جو پہلے ہی اُسے سوچتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میر آہل نے پیالہ پکڑا تو اس کی انگلیاں دل آویز کی انگلیوں سے مِس ہوئیں۔ دل آویز نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا۔

"بی جان میں کمرے میں جاؤں" ملتجیانہ نظروں سے بی جان کو دیکھ کر اجازت طلب کی۔

اس کی نظروں کا ارتکاز وہ سمجھ گئی تھیں۔ وہ معنی خیز انداز میں مسکرائیں اور اُسے کمرے میں جانے کی اجازت دے دی تو دل آویز کی جان میں جان آئی۔ وہ کمرے سے نکلی تو زلیخا نے آواز اونچی کر کے ریما کو مخاطب کیا۔

"ریما جاؤ بیٹی جھوٹے برتن سمیٹ لو پھر ٹیبل صاف کر کے برتن دھو لینا۔ دل آویز تو جب دیکھو کمرے میں گھسی رہتی ہے۔ بس میری بیٹی ہے جسے میرا خیال ہے۔" جتا کر کہا تو ریما نے مرجھائے ہوئے چہرے کے ساتھ ماں کو دیکھا گویا کہہ رہی ہو کہ

"اب یہ سب بھی اسکرپٹ کا حصہ تھا؟" میر خلیل اور بی جان نے گہری سانس کھینچی اور میر آہل نے ہمیشہ کی طرح لاتعلقی کا اظہار کیا تھا وہ زلیخا چچی کی مکاری بہت اچھے سے جانتا تھا کچھ دیر وہاں بیٹھے رہنے کے بعد میر آہل بھی بی جان سے اجازت لیکر اپنے کمرے میں آ گیا۔ کچن میں برتنوں سے بھرے سنک کو دیکھ کر ریما کا چہرہ مزید مُرجھا گیا۔

"یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجئے سامنے برتنوں کا انبار ہے اور گھستے جانا ہے" اس نے نل کھولا اور ماں کو کوستے ہوئے برتن رگڑنے لگی۔

"اُفففف عجیب" رات ابھی جواں تھی اور برتن بھی اچھے کھاسے تھے۔

☆...☆...☆

حویلی پر صبح طلوع ہوئی تو پرندے اپنے رزق کی تلاش میں اپنے اپنے گھونسلوں سے اُڑ گئے۔ ایسے میں میر آہل حویلی کی پشت پر بنی ایک لمبی پکی سڑک (جس کے اطراف میں دور دور تک کھیت کھلیان تھے) پر واک کر رہا تھا۔ ٹراؤزر کے اوپر ٹی شرٹ (جس کی آستین کہنی سے کچھ اوپر تک ختم ہو جاتی تھیں) پہن رکھی تھی۔ ماتھے پر ننھے منھے پسینے کی بوندیں جمع تھیں۔ وہ کافی دیر سے سڑک پر دوڑ رہا تھا۔ وہ بھاگتے بھاگتے ایک تناور درخت کے ساتھ رکھے بڑے سے پتھر پر بیٹھ گیا۔ صبح کا وقت تھا کسان کھیتوں کی جانب گامزن تھے۔ گاؤں کی ٹھنڈی تازی ہوا۔ تازگی کا احساس دے رہی تھی۔ یہ سڑک خالی تھی۔ یہاں شہر جیسا ٹرافک بلکل نہیں تھا۔ نو سال پہلے وہ جیسا اس جگہ کو چھوڑ کر گیا تھا۔ یہ جگہ آج بھی ویسی ہی تھی۔ کوئی بدلا تھا تو وہ میر آہل تھا۔ مگر کیوں یہ ایک ایسا سوال تھا۔ جس کا جواب وہ خود بھی نہیں کھوجنا چاہتا تھا ورنہ دوسری صورت میں بہت سے لوگوں کے دل ٹوٹ جاتے۔ وہ خاموشی سے بیٹھ کر دور تک پھیلے سبزہ زار کو دیکھتا رہا۔ ذہن میں بہت سی باتیں چل رہیں تھی مگر آنکھوں کو یہ منظر تسکین دے رہا تھا۔

("بابا یہ سب ہمارے کھیت ہیں؟"

ننھے سے آہل نے میر رحمان سے سوال کیا تھا۔ کسان کھیتوں میں کھیتی باڑی کرتے نظر آ رہے تھے۔

"ہاں آہل بیٹا دور دور تک یہ جتنے بھی کھیت لہلہا رہے ہیں۔ یہ سب ہمارے ہیں"

انہوں نے میر خلیل کے ہاتھوں سے حساب کتاب کا کھاتہ پکڑتے ہوئے جواب میں کہا۔

"ہم یہاں اپنی حویلی بنائے گے جہاں آپ، میں اور امی ہونگی اور وہ حویلی ہماری اس حویلی سے بھی بڑی ہوگی

" آہل نے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کر کے بتایا تو میر رحمان محض مسکرائے تھے۔

میر خلیل دونوں باپ بیٹے کو گفتگو کرتے دیکھ اپنے بھائی کے عقب میں مودبانہ انداز میں کھڑے بس آہستگی سے مسکرائے تھے۔

"خلیل پچھلے مہینے کا کھاتہ مجھے ٹھیک نہیں لگا۔ حساب اوپر نیچے ہے آئندہ میں خود اپنے کھیتوں کا حساب کتاب دیکھو گا۔ تم جا کر کسانوں کی مزدوری دو اور ایک ایک حساب صحیح سے درج کرنا میں دوبارہ چیک کروں گا" انہوں نے حکم صادر کیا۔

"جی بھائی جان جیسے آپ کا حکم" انہوں نے سر کو خم دیتے ہوئے کہا۔

"فیصل کی کیا صورت حال ہے ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں" اب وہ کھیتوں کے درمیان درخت کے نیچے رکھی چارپائی پر بیٹھنے لگے۔ آہل نے گردن موڑ کر باپ اور چاچو کو دور جاتے دیکھا۔

"ڈاکٹرز نے کچھ خاص امید نہیں دلائی بھائی جان کیونکہ کینسر آخری اسٹیج کا ہے۔ مگر وہ اپنی جانب سے تمام کوششیں کر رہے ہیں۔"

وہ میر رحمان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کچھ فاصلے پر رک گئے۔ میر رحمان نے انگلی سے ٹھوڑی کجائی۔

"رابعہ کی بھی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہتی اپنی بیوی سے کہو کہ اپنا رویہ اس کے ساتھ درست رکھے۔ کل حویلی میں کیا ہوا مجھے سمیرا نے سب کچھ بتایا ہے۔ دیکھو خلیل یہ اچھی بات نہیں ہے۔ اس طرح حویلی کا ماحول خراب ہو جائے گا۔" وہ اب مصنوئی خفگی سے بول رہے تھے۔

"میں زلیخا کی جانب سے معذرت خواہ ہوں بھائی جان میں اُسے دوبارہ سمجھاؤں گا" میر خلیل کے چہرے پر شرمندگی صاف ظاہر تھی۔

"بہتر بھی یہی ہو گا ورنہ مجھے سخت فیصلہ لینا پڑے گا اب محض تمہاری بیوی کی وجہ سے میں گھر کا ماحول خراب نہیں کروں گا" انہوں نے مونچھوں کو تاؤ دیا۔ جواباً میر خلیل سر جُھکا گئے۔)

پاس سے بیل گاڑی گزری تو میر آہل نے چونک کر اپنے اطراف میں نظر دوڑائی اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ کتنے لمحے بیت گئے۔ ٹھنڈی ہوا اور پرندوں کی چہچہاہٹ ہنوز ویسی ہی تھی۔ وہ سر جھٹک کر حویلی کی جانب بڑھ گیا اور ماضی اُس درخت کے ارد گرد ہوا سے ہچکولے کھاتے پیچھے رہ گیا۔

☆...☆...☆

حویلی پانچ کنال کے سبزہ زار پر پھیلی ہوئی تھی۔ حویلی کے ستون بڑی شان سے اپنے پیروں پر کھڑے تھے۔ حویلی کا خوبصورت سالان مختلف رنگ کے پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ ان پھولوں کی مہک ہوا کو مزید خوشگواری بخش رہی تھی۔ درمیان میں فوارہ موجود تھا۔ جس کے تین درجوں سے پانی بہتا دوبارہ اوپر کی جانب اُبل رہا تھا۔ حویلی کے دروازے سے بیرونی دروازے تک سرمئی رنگ کے اینٹوں کی روش بنی ہوئی تھی۔ جس پر سیاہ رنگ کی چمچماتی پجیرو کھڑی تھی۔ میر خلیل سفید کاٹن کا کلف دار جوڑا پہنے تیار نظر آرہے تھے۔ وہ آج زمینوں کے دورے پر جارہے تھے۔ شادی کی دوسری ذمہ داریاں بھی اُنہی کے کندھوں پر تھیں۔ انہیں گاڑی کی سمت آتا دیکھ کر ڈرائیور نے پیچھے کا دروازہ کھولا۔ وہ گاڑی میں بیٹھنے لگے تھے کہ دل آویز کی آواز پر چونک کر مُڑے پھر دھیما سا مسکرائے۔

"چاچو ہوا سرد ہے یہ شال اوڑھ لیجیے۔" دل آویز نے سرمئی شال ان کو اوڑھائی ایسے کے پیچھے سے پوری پشت چھپ گئی اور باقی کی شال کندھوں سے آگے کی طرف گرتی تھی۔ اسی لمحے میر آہل بیرونی دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہوا تھا۔ دروازے اور گاڑی کے درمیان فاصلہ تھوڑا زیادہ تھا۔ اس نے دیکھا کہ دل آویز خلیل چاچو کو شال اوڑھا رہی ہے۔ وہ وہی رُک کر دونوں کو آنکھ سکوڑ کر دیکھنے لگا۔

میر خلیل نے محبت سے دل آویز کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"میری بیٹی کچھ دنوں بعد جب چلی جائے گی تو میرا خیال کون رکھے گا" یکدم ان کی آنکھ بھرنے لگی۔ تو دل آویز نے دکھتی نگاہ اٹھا کر دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔ ایک نظر شفقت سے دل آویز کو دیکھنے کے بعد وہ مڑ کر گاڑی میں بیٹھنے لگے تو ان کی نظر آہل پر پڑی جو پسینے سے شرابور شاید واک سے واپس آیا تھا۔

آہل نے رُک کر انہیں سلام کیا تو میر خلیل نے سر کو خم کرتے ہوئے سلام کا جواب دیا۔

"آہل میں زمینوں کو دیکھنے جا رہا ہو بیٹا بی جان کی خواہش تھی کہ تم بھی ایک بار زمینوں کا ضرور چکر لگاؤ" وہ سرسری انداز میں کہتے ہوئے گاڑی میں بیٹھنے لگے۔

"جی چاچو جانے سے پہلے میں ضرور اپنی زمینیں دیکھنا چاہوں گا" اس نے لاپرواہی سے شانے اُچکاتے ہوئے کہا۔

وہ بیٹھتے بیٹھتے لمحے بھر کے لئے رُکے، نظر اٹھا کر آہل کو دیکھا پھر دھیما سا مسکرائے اور شال سمبھالتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے آہستگی سے دروازہ بند کیا۔ لمحوں میں گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور زن سے گاڑی حویلی کے مین دروازے سے باہر نکالی۔ بیک وِیو مرر میں میر آہل اور دل آویز صاف دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے جیسے گاڑی حویلی سے دور جا رہی تھی ویسے ویسے وہ دونوں نظروں سے اوجھل ہوتے چلے جا رہے تھے۔ وہ حویلی کے اندر جانے کے لئے مُڑی تو میر آہل نے اُسے مخاطب کیا۔

"سُنو"

دل آویز کے قدم زنجیر ہوئے۔ وہ آرام سے گھومی مگر نظریں نہیں اٹھائی۔

"یہ خلیل چاچو کا بیٹا کریم ہے نا"

آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

لان کے دوسری طرف جہاں ملازم کے کوارٹرز بنے تھے وہاں دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ جن میں سے ایک پر کریم بازوؤں کا تکیہ بنا کے چِت لیٹا ہوا آسمان کو گھور رہا تھا۔

"جی کریم بھائی ہیں" وہ اتنا ہی بول سکی۔

"میں جب سے آیا ہوں اُسے یہاں ملازموں کے ساتھ ہی بیٹھا دیکھا ہے۔ کھانا بھی اُنہی کے ساتھ کھاتا ہے۔ یہ یہاں کیوں رہتا ہے اندر کیوں نہیں آتا" وہ دو قدم مزید قریب آیا البتہ نظریں کریم پر تھیں۔ دل آویز دو قدم پیچھے ہوئی۔ فاصلہ پھر اتنا ہی رہ گیا جتنا پہلے تھا۔

"جی وہ۔۔ وہ بی جان نے۔۔" وہ اٹکی

"ہیں۔۔بی جان۔۔واٹ" آہل نے مستفسرانہ نظروں سے اُسے گھورا۔

"وہ بی جان نے انہیں سزادی ہے کہ جب تک

"میری"

اس نے رُک کر تصیح کی

"ہماری"شادی نہیں ہو جاتی وہ حویلی کی دہلیز پار نہیں کر سکتے"اس نے کن اکھیوں سے میر آہل کے چہرے کی طرف دیکھا جو بلکل پُر سکون نظر آتا تھا۔

"اور ایسا یقیناً اس لئے ہوا ہو گا کیونکہ۔۔۔"رک کر دل آویز کے چہرے کو ٹٹولا"اس نے تمہارے ساتھ بد تمیزی کی ہو گی"وہ دونوں ہاتھ ٹراوزر کی جیب میں ڈالے مکمل توجہ کے ساتھ اُس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی دھوپ نکل آئی تھی۔ جس کی روشنی میں دل آویز کا چاندی میں نہایا چہرہ مزید چمک رہا تھا۔

"آپ کو کیسے پتہ چلا؟"وہ بلکل چونک گئی۔

میر آہل نے اُسے سر سے پاؤں تک ایک نظر دیکھا۔ اس نظر میں کچھ عجیب سا تھا۔ مگر اُس نظر نے دل آویز کو ان کمفرٹیبل نہیں کیا تھا۔ گھٹنوں سے ذرا سی نیچے آتی سبز رنگ کی کمیز اور اس کے نیچے سبز رنگ کا ٹراوزر پہنا ہوا تھا اور گلے میں ہلکے پیلے رنگ کا ڈوپٹہ ڈال رکھا تھا اور لمبے سیاہ بالوں کی ڈھیلی سی چوٹی پشت پر بکھری ہوئی تھی۔ وہ بہت معصوم اور نازک سی دکھائی دیتی تھی۔

"میرا اور بی جان کی رگوں میں بہتا خون ایک ہے اور"وہ ذرا آگے آیا اور جھک کر اس کی کتھئی رنگ کی آنکھوں میں دیکھا"اور اگر میں بی جان کی جگہ ہوتا تو اُس کے جسم کی ایک بھی ہڈی سلامت نہیں چھوڑتا"ایک سخت نگاہ چارپائی پر لیٹے کریم پر ڈالی اور کندھے سے نادیدہ گرد جھاڑتے ہوئے وہ دل آویز کے برابر سے نکل گیا۔

دل آویز لمحوں میں ایڑیوں کے بل گھومی تھی۔ اتنی بڑی بات وہ کتنی آسانی سے کتنے معمولی سے انداز میں کہہ کر نکل گیا تھا۔ کون تھا یہ شخص دل آویز نے حویلی کا دروازہ پار کرتے میر آہل کی پشت کو گھورتے ہوئے سوچا تھا۔ جو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ساتھ اسے حیران کر رہا تھا۔ یہ کوئی راز تھا جو قسطوں میں اس پر افشاں ہو رہا تھا۔

بی جان نے ٹھیک کہا تھا خون میں ایک عجیب کشش ہوتی ہے۔ وہ کشش اب اُسے بھی محسوس ہونے لگی تھی۔

☆...☆...☆

فضا میں ہلکی ہلکی خُنکی پھیل گئی تھی۔ سورج کی شعائیں بھی ہوا میں گھلی ٹھنڈک کو مات دینے میں ناکام دکھائی دے رہی تھیں۔ دور تک محض ہریالی ہی ہریالی تھی۔ کسان کھیتوں میں کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ میر خلیل زمینوں کا چکر لگا چکے تھے اور اب ڈیرے پر موجود تھے۔ ایک بڑے تناور درخت کے نیچے چارپائی پر پھیل کر بیٹھے ہوئے ایک ہاتھ میں حقہ تھامے وہ دوسرے ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنی انگھوٹھی کو انگلی میں انگھوٹے کی مدد سے گُھما رہے تھے۔

چہرہ بلکل سپاٹ تھا۔ دماغ میں سوچوں کا ایک انبار لگا تھا۔

انسان۔۔۔ کون ہے یہ انسان زمین کے چند ٹکڑوں پر حکمرانی کرنے والے چلتے پھرتے مٹی کے پُتلے، اور یہ زمینیں جن پر یہ انسان خدا بنے بیٹھے ہیں انکا کردار صرف اتنا ہے کہ یہ مرنے سے پہلے اپنے اوپر اور مرنے کے بعد اپنے اندر جگہ دیتی ہے بس۔ اور انسان کا کام تمام۔۔۔ ختم۔۔۔ ختم شُد۔

("ناجانے کونسا گناہ ہوا ہے جو ایسی اولاد پلے پڑ گئی ہے۔" میر فرقان کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا تھا۔

"بس کریں چھوٹا بچہ ہے" سلطانہ بیگم نے میر خلیل کو آغوش میں لیتے ہوئے کہا۔

"بظاہر دکھنے میں یہ بچہ ہے مگر اس کی حرکتیں بچوں جیسی بلکل نہیں ہے۔ رام لال جو ہمارے کھیتوں میں کام کرتا ہے۔ آج اُس کے چھوٹے بیٹے کا سر پھوڑ دیا ہے اس کمبخت نے" وہ بمشکل غصہ ضبط کرتے ہوئے بولے۔

"یہ اللہ یہ کیا کر دیا خلیل" یہ سُنتے ہی بی جان کا دل دہل کر رہ گیا۔ انہوں نے غصے سے میر خلیل کو دونوں بازوؤں سے جھنجھوڑا۔

"بی جان میری کوئی غلطی۔۔۔"

"بس خاموش" میر فرقان کی گرجدار پھنکار سے میر خلیل کے الفاظ ٹوٹ گئے۔ ننھا سا بچہ بی جان سے مزید لپٹ گیا۔

"پڑھائی میں دماغ چلتا نہیں آئے دن کسی نا کسی بات پر کوئی نا کوئی گاؤں والا اس کی شکایت کر رہا ہوتا ہے۔ تم اندازہ نہیں کر سکتی سلطانہ مجھے کتنی شرمندگی اٹھانی پڑی ہے اس کی وجہ سے بس آج سے اس کی پڑھائی بند اب سے یہ میرے ساتھ کھیتوں میں جائے گا اور کام سیکھے گا" میر فرقان غصے سے صحن میں ہاتھ پیچھے باندھے ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے۔

"مگر خلیل تو ابھی چھوٹا ہے اور بچوں سے غلطیاں ہو جاتی ہیں" سلطانہ بیگم نے وضاحت دینا چاہی تو میر فرقان نے گردن نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔

"انسان غلطیاں اگر بار بار دہرانے لگے تو اسے بچپنا نہیں ڈھٹائی کہتے ہیں سلطانہ۔ بس یہ میرا آخری فیصلہ ہے اب سے یہ میرے ساتھ کھیتوں اور زمینوں پر جائے گا۔"

وہ حکم صادر کر چکے تھے۔ ان کی ہر بات حرفِ آخر تھی۔ اس دن کے بعد سے میر خلیل نے کبھی اسکول کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ وہ صبح سے شام تک میر فرقان کے ساتھ ساتھ کھیتوں کے کام دیکھتے۔۔۔ حساب کتاب سے لیکر فصل کی دیکھ بھال تک)

میر سرکار کسی نے قریب سے میر خلیل کو پکارا تو جیسے وہ نیند سے جاگے یکدم ماضی چھوٹ گیا اور فسوں ٹوٹا۔

وہ ہلکا سا کھنکارے "ہاں جلالی بولو" انہوں نے حقے کا کش لیتے ہوئے جواب دیا۔

میر سرکار یہ زمینوں کے کاغذات جو آپ نے منگوائے تھے۔ لال ہلکی داڑھی والے جلالی نے کچھ فائلز انہیں پکڑائیں۔

"ہاں ٹھیک ہے تم جاؤ اور اس سال ہمیں چاولوں کی فصل سے کتنا منافع ہوا ہے اسکا حساب لے کر آؤ"

انہوں نے فائلز ساتھ چارپائی پر رکھیں اور دور اُفق پر چمکتے سورج کو دیکھنے لگے اور ماضی پھر سے آنکھ کی پتلیوں پر کسی فلم کی طرح چلنے لگی۔

(وہ گُم سُم سا زمین پر اپنے کمرے کی ایک دیوار سے ٹیک لگائے اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ پاس اسکول کی چند کتابیں اور ایک میڈل بھی پڑا ہوا تھا۔

"باباجان نے میری کوئی بات نہیں سُنی بس اُس رام لال کے کہنے پر مجھے تھپڑ مار دیا اور اسکول سے بھی نکلوادیا "وہ سسکی لیتے ہوئے جیسے خود سے ہی باتیں کر رہے تھے۔ میر خلیل نے پاس پڑا ہوا میڈل اٹھایا۔ اس سال اس نے پڑھائی میں خوب محنت کی تھی اور اپنے بھائیوں کی طرح اس نے بھی اپنی کلاس میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔ جس پر اُسے یہ میڈل ملا تھا۔ وہ بہت خوش تھا کہ آج میر فرقان کو اس کی وجہ سے شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا بلکہ وہ یہ میڈل دیکھ کر خوشی سے نہال ہو جائیں گے۔

میر خلیل آج بہت خوش تھے۔ وہ اسکول سے حویلی جانے کے بجائے سیدھا کھیت آ گئے تا کہ وہ میر فرقان کو اپنا میڈل دکھا سکے۔ وہ جلدی جلدی قدم اٹھاتے کھیتوں کی جانب بڑھ رہے تھے۔ جب راستے میں اُنہیں اپنے کچھ دوست مل گئے۔ راجُو جو رام لال کا بیٹا تھا اور میر خلیل کی جماعت میں ساتھ پڑھتا تھا۔

میر خلیل کے گلے میں چمکتا ہوا میڈل دور سے ہی آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا اور اس پر میر خلیل کے چہرے پر آئی لاکھوں کی مسکراہٹ ان کی خوشی کی وجہ بیان کر رہی تھی۔

"ارے خلیل اچھا ہوا توں ہمیں راستے میں ہی مل گیا. سنا ہے گاؤں میں میلا لگا ہے چل ہم بھی چلتے ہیں۔" ان میں سے ایک جس کا نام سلمان تھا۔ اس نے پرجوش ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں سلُّو ابھی نہیں کیونکہ ابھی میں کھیت جا رہا ہوں باباصاحب کو اپنا میڈل دکھانے" میر خلیل نے گلے میں جھولتے میڈل کی جانب پرجوشی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا فائدہ خلیل تیرا باپ کونسا تجھے خوشی سے گلے لگا لے گا۔ بلکہ تیرے باباصاحب کو تو یقین ہی نہیں آئے گا کہ ان کی نکمی اولاد جو پچھلے دو سال سے ایک ہی جماعت میں سڑ رہی ہے۔ اس نے پہلی پوزیشن حاصل کی ہے" راجُو (جو پڑھائی میں میر خلیل کے مقابلے میں ہمیشہ سے آگے تھا اور ہر سال جماعت میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے والوں میں سے تھا) نے کُڑتے ہوئے تنز کیا تو میر خلیل کے کان سُرخ ہوئے۔

"مجھے معلوم ہے توں اس طرح کی باتیں کیوں کر رہا ہے۔ کیونکہ ہر سال توں اسکول میں پہلی پوزیشن حاصل کرتا تھا مگر اس سال جماعت میں میری پوزیشن آئی ہے اور توں نے دوسری پوزیشن حاصل کی ہے۔ دراصل تجھے جلن ہو رہی ہے" میر خلیل نے بھی جلتی پر نمک چھڑکا تو راجُو کے ہونٹ بھنچ گئے۔

"ابے چل چل تیری اتنی اوقات نہیں کے میں تجھ سے جلوں۔ اونہوں گھمنڈی باپ کی بیکار اولاد" راجُو نے نادیدہ گرد جھاڑتے ہوئے کہا۔

"کیا۔۔۔ توں نے میرے بابا صاحب کو گھمنڈی کہا؟" میر خلیل نے اُسے گریبان سے پکڑ کر قریب کرتے ہوئے غصے سے کہا اور ایک زبردست مکہ اس کے منہ پر جڑ دیا۔

جواباً راجُو نے بھی تین۔۔ چار تھپڑ میر خلیل کو رسید کئے۔ باقی بچے کھڑے زور زور سے شور مچانے لگے اور اپنے اپنے پسندیدہ دوست کی حمایت میں اونچا اونچا بولنے لگے۔

"ہاں کہا تیرے بابا صاحب کو گھمنڈی بول کیا کرلے گا" راجُو نے میر خلیل کی گرفت سے خود کو چُھڑاتے ہوئے۔ اُسے زور سے دھکا دیا تو وہ زمین پر جا گرے۔

"ابھی بتاتا ہوں رُک" وہ کہنی کے بل اٹھتے ہوئے دوبارہ زمین کی طرف مُڑے اور پاس پڑا پتھر مٹھی میں دبا لیا۔ یہ دیکھتے ہی راجُو نے دوڑ لگائی مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ میر خلیل نے بھاری سا پتھر پوری شدت سے راجُو کی سمت اچھالا جو سیدھا اس کی گُدی سے ذرا اوپر جا کے لگا اور اس کی کمیز کو رنگین کرتا زمین پر گِر گیا۔ اس کی سفید کمیز کو لال رنگ میں تبدیل ہوتا دیکھ کر میر خلیل لمحے بھر کے لئے گھبرا سے گئے مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ پاس کھڑے باقی بچے بھی ڈر کے مارے اپنے اپنے گھر بھاگ گئے تھے۔

راجُو روتا دھوتا کھیت میں اپنے باپ کے پاس پہنچ گیا اور ایک کی چار لگا کر بتائی۔ میر فرقان بھی اس وقت کھیتوں میں موجود تھے۔ راجُو کے بہتے خون اور رام لال کی شکوہ کرتی آنکھوں کو دیکھ کر ان کو میر خلیل پر شدید غصہ آیا۔

میر فرقان گرم مزاج اور کافی دبدبا رکھنے والے شخص تھے۔ ان کے رکھ رکھاؤ اور دریا دلی سے پورا گاؤں واقف تھا۔ وہ اپنی زبان کے پکے شخص تھے اور اپنے انصاف سے پورے گاؤں میں جانے جاتے تھے۔ انہوں نے راجُو کو فوراً طبی امداد فراہم کی اور اس کے علاج کا سارا خرچہ بھی اٹھانے کا وعدہ کیا۔ وہ جو ہمیشہ سر اٹھا کر جینے والوں میں سے تھے۔ آج اپنی ہی اولاد کی حماقت کی وجہ سے انہیں شرمندگی اٹھانی پڑی۔

دوپہر ڈھل کر شام میں بدلنے لگی۔ اس معصوم بچے کی سسکیاں حُقے کی گُڑ گُڑ میں کہی دب سی گئیں اور ماضی آہستہ آہستہ دھواں ہونے لگا۔

غصے سے لال ہوتے بابا صاحب نے ننھے سے بچے کو مارتے ہوئے۔ اس کے گلے میں جھولتے میڈل کو نہیں دیکھا تھا اور نا دکھی بی جان نے میر خلیل سے راجُو کا سر پھاڑنے کی وجہ پوچھی تھی۔ وہ بچہ دیوار سے کمر ٹکائے روتے روتے نا جانے کب سو گیا اور پاس پڑا میڈل اس کو منہ چڑاتا رہا۔)

☆...☆...☆

اگلے روز سے حویلی میں شادیانے بجنا شروع ہو گئے تھے۔ دوپہر ڈھلتے ہی لڑکیاں صحن میں ڈھولک لے کر بیٹھ جاتیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولیں جاتی۔ نت نئے پکوان بنتے اور مہمانوں کی آمدورفت بھی شروع ہو گئی تھی۔

ایسے میں زلیخا اپنے کمرے میں جلے پاؤں کی بلی کی طرح دائیں سے بائیں چکر کاٹ رہی تھی۔ وہ ایسا کیا کرتی کہ آہل کی شادی دل آویز کے بجائے ریما سے ہو جاتی۔۔۔ بی جان نے اس پر سارے دروازے بند کر دیئے تھے۔ میر خلیل نے عینک کے اوپر سے اُسے جھانک کر دیکھا اور ایک افسردہ سی آہ اپنے پھیپھڑوں میں اُتاری۔

"اس عورت کا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔" انہوں نے مایوسی سے سوچ کر اپنا ذہن دوبارہ حساب کتاب میں مبذول کر لیا۔

ان کے کمرے سے نکل کر زینے چڑھ کر اوپر آ ؤ تو میر آہل گُم سم سا اسٹڈی ٹیبل کی کرسی پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ماتھے سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔

کرتے کے اوپر کے دو بٹن کُھلے ہوئے تھے۔ جیسے گھٹن سے بچنے کے لئے کھولے گئے ہوں۔۔۔ میر رحمان اور سمیرا کا انتقال ایک کار ایکسیڈنٹ میں ہوا تھا۔ وہ دونوں کچہری کے کام سے شہر گئے تھے۔ جب واپسی پر گھر آتے ہوئے ان کی گاڑی ایک دوسری گاڑی سے ٹکرا گئ تھی۔ میر رحمان اور سمیرا موقع پر جہاں باک ہو گئے تھے۔ گاڑی کا ڈرائیور حادثے کی سنگینی دیکھ کر موقع پر فرار ہو گیا تھا۔ وہ میر آہل تھا جس کو اپنے والدین کے ایکسیڈنٹ کی خبر سب سے پہلے موصول ہوئی تھی۔ کیونکہ میر رحمان کے کال لاگ میں سب سے پہلا نمبر آہل کا تھا۔ جس سے انہوں نے آخری بار بات کی تھی۔

مٹی سے اٹے چہرے اور کیچڑ میں لتھڑی دو نعشیں۔۔۔وہ منظر جیسے قیامت کا منظر تھا۔وہ ان کے سرہانے پر کھڑا بے یقینی سے اپنے ماں باپ کے بے جان وجود کو اسٹریچر پر رکھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ہاتھ پاؤں شل تھے اور دماغ سُن ہو چکا تھا۔تب اس کی نظر کیچڑ میں پڑے ایک قیمتی پتھر پر پڑی۔۔۔وہ فروزاں پتھر تھا۔اُسے لگا کسی نے اس کے پیروں کے نیچے سے بہت زور سے زمین کھینچی تھی۔وہ لمحے بھر کو سانس نہیں لے پایا۔ارد گرد فضا میں گھٹن سی بھر گئی تھی۔اُسے سانس لینے میں دشواری ہوئی۔

اس روز کے بعد سے اذیتوں کا ایک عجیب نہ تھمنے والا دور شروع ہوا تھا۔اُسے راتوں کو عجیب عجیب سے خواب آنے لگے تھے۔ہر بار وہ اپنے ماں باپ کی کیچڑ میں لتھڑی لاشیں دیکھتا۔یہاں رہ کر دن بدن اس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔وہ زندگی سے دور ہوتا جا رہا تھا۔وہ ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا مگر اس حادثے نے اس کے ذہن کے خانوں کو تتر بتر کر دیا تھا۔

اس کی حالت دیکھ کر میر خلیل اور بی جان نے اُسے اس ماحول سے دور ایک بہتر ماحول میں بھیج دیا۔جس دن سے اُس نے حویلی میں پاؤں رکھا تھا۔

ماضی کے وہ تمام مناظر اس کی آنکھوں کی پتلیوں پر کسی فلم کی طرح چلنے شروع ہو گئے تھے۔آج پھر اس نے خواب میں اپنے ماں باپ کو اُسی حالت میں دیکھا تھا۔

وہ خالی الذہنی کی حالت میں چلتا ہوا بیڈ سائیڈ ٹیبل تک آیا۔جھک کر دراز باہر کھینچی تو اندر ایک سفید مخملی رُمال رکھا تھا۔اس نے وہ رُمال نکالا اور وہیں بستر پر بیٹھ گیا۔اس نے بے جان ہاتھوں سے تہ شدہ رُمال کو کھولا تو اندر وہی آسمانی رنگ کا پتھر رکھا ہوا تھا ایک آنسو خاموشی سے ٹوٹ کر اس کی پلکوں سے گرا تھا۔جو اسکی کالر میں جذب ہو گیا۔

یکدم ماحول میں پر اسراریت سی پھیل گئی۔یہ حویلی اور یہاں کے مکین نا جانے کتنے رازوں کے جنازے اپنے کندھوں پر اٹھائے خاموشی سے زندگی بسر کر رہے تھے۔

آہل نے رُمال کو آہستگی سے تہ کر کے دوبارہ دراز میں رکھ دیا۔یہ وہ راز تھا جسے اس نے ایک عرصے سے اپنے دل کی مُردہ زمین میں گاڑھ رکھا تھا۔

☆...☆...☆

(کہتے ہیں شیر کی ایک دن کی زندگی، گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔)

میر خلیل کی سیاہ رنگ کی پجیرو حویلی کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ پاس کھڑے ملازم نے گاڑی کا دروازہ کھولا تو میر خلیل سر کو خم دیتے ہوئے گاڑی سے باہر نکلے۔ حویلی خوبصورت رنگ برنگی قمقموں کی چادر سے ڈھکی ہوئی تھی۔

(یوں تو جنگل میں بہت سے شیر پیدا ہوتے ہیں۔ مگر اُن میں سے راجا وہی ہوتا ہے۔ جو دوسرے شیروں کو مات دیتا ہے۔ جو زیادہ طاقتور اور ڈومینیٹِنگ ہوتا ہے)

حویلی کی چہل پہل قابلِ دید تھی۔ وہ مہمانوں سے علیک سلیک کرتے آہستہ آہستہ قدم آگے بڑھا رہے تھے۔

"ارے میر صاحب آپ کی مدد کے بغیر ہم کہاں وہ زمین حاصل کر سکتے تھے۔ آپ کا یہ احسان ہے مجھ پر" مہمانوں میں سے کوئی میر خلیل سے مصافحہ کرتے ہوئے بول رہا تھا۔

"میر صاحب کا روعب ہی ایسا ہے کہ" کہیں کوئی دوسرا شخص میر خلیل کی شخصیت پر تبصرہ کر رہا تھا۔ راستے سے گزرتا ہر ملازم میر خلیل کو رُک کر مودبانہ انداز میں جُھک کر سلام پیش کرتا اپنے کام میں مگن آگے بڑھ جاتا اور وہ دونوں ہاتھ پشت پر باندھے سر کے اشارے سے سب کو جواب دیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

(جنگل کی تمام شیرنیاں اُس ایک شیر کے آگے پیچھے گھومتی ہیں۔ اپنے شیر کے لئے شکار کرتی ہیں)

"ارے خلیل تو کب آیا چل اچھا ہوا ضروری موضوع پر بات کرنی تھی" پیچھے سے بی جان نے پکارا تو وہ محض مسکرائے۔

"بابا جی! آپ کو بڑے ماموں یاد کر رہے تھے۔ انہیں بھی آپ سے کام تھا اور وہ میں نے کپڑوں کے لئے آپ سے رقم کا۔۔۔" میر خلیل نے بیٹی کو مسکرا کر آنکھوں سے جواب دیا تو ریما خوشی سے ان کے گلے لگ گئی۔

"شکریہ بابا جی" تو جواباً میر خلیل بھی کھلے دل سے مسکرائے۔

"ہاں ظاہر ہے میرے شوہر ہی زمینوں اور کھیتوں کی بھاگ دوڑ دیکھتے ہیں۔ ان کے سوا ہے ہی کون بس وہی ہمارے سربراہ ہیں۔ اللہ اُن کا سایا ہمارے سروں پر سلامت رکھے" کہی پاس سے زلیخا کی بھی آواز سنائی دی تھی۔ وہ

خاموشی سے چلتے ہوئے سہن سے مُلحقہ زینوں کی طرف بڑھ گئے۔ چھوٹی سی راہداری کو عبور کر کے دائیں جانب مڑتے ہی ایک مختصر سا زینا تھا جو اوپر چھت کی طرف جاتا تھا۔

اُن کے چہرے پر کچھ لمحے پہلے والے تاثرات کا اب شائبہ تک نہ تھا۔ وہ چھت کی منڈیر پر دونوں ہاتھ جمائے تھوڑا سا آگے کو جُھکے تو نیچے ہرا بھرا روشن سا لان دکھائی دے رہا تھا۔ دور دور تک خاموش کھیت لہلہا رہے تھے۔ نیچے سے سر اٹھا کر دیکھو تو اوپر ایک ہیولہ سا نظر آتا تھا۔ تیز روشنی درمیاں میں حائل ہو رہی تھی۔ جس کی وجہ سے اُن کا وجود اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔

(مگر جب کوئی دوسرا طاقتور شیر اُس شیر کو مار کر اُس کی جگہ لے لیتا ہے تو وہی شیر نیاں اُس کی آنکھوں کے سامنے اقتدار میں آئے نئے شیر کے ساتھ جا ملتی ہیں۔۔۔ یہ طاقت اور اقتدار کا وہ چکر ہے جو صدیوں چلتا ہے اور چلتا رہتا ہے۔)

کہنے کو انسان ایوالو ہو چکا ہے مگر فطرت کبھی نہیں بدلتی۔ انسان بھی صدیوں سے اقتدار اور طاقت کے اس چکر میں خوار ہوتا آرہا ہے۔ اس کے پیچھے بھاگتا آرہا ہے۔ یہ وہ حوس ہے جو انسان کو انسانیت کے درجے سے بھی نیچے گرا دیتی ہے۔ لال سرخ خون کو سفید کر دیتی ہے۔ جو بغاوت سکھاتی ہے۔ جو خون بہاتی ہے۔ طاقت کا نشا دنیا کا وہ واحد نشا ہے جو حرام نہیں ہوتا

برق قمقمے ماضی کے اندھیرے میں ڈوبنے لگے، اردگرد مہمانوں کے قہقہے، ملازموں کے کام کرنے کا شور اور ڈھولک کی آوازیں مدہم ہوتی چلی گئیں اور میر خلیل اپنے ماضی کے دروازوں کے پٹ وا کر کے اندر داخل ہو گئے۔

("میرے خیال سے ہمیں ملتان والی زمین کے بارے میں سوچنا چاہئے وہاں فیکٹری لگائیں گے تو لوگوں کو روزگار ملے گا۔ نئے تعلقات بنے گے ہزاروں لوگوں کی دعائیں لگیں گی اور تو اور ہمارے بابا صاحب کا نام اور ساکھ دونوں مضبوط ہو گی" میر فیصل اپنے بابا صاحب کے روبرو صوفے پر براجمان تھے ان کے برابر والے صوفے پر میر رحمان بھی براجمان تھے۔ لاؤنج میں بلکل خاموشی تھی۔ سب خاموشی سے میر فیصل کے مشورے کو سُن رہے تھے۔

"تمہیں کیا لگتا ہے رحمان؟" میر فرقان نے فیصل کی بات ختم ہونے کے بعد آہستگی سے گلہ کھنکارا اور رحمان کو مخاطب کیا، چہرے پر محظوظ سے تاثرات تھے۔ انہیں میر فیصل کا مشورہ پسند آیا تھا۔ میر خلیل دونوں ہاتھ مودبانہ انداز میں باندھے میر فرقان کے صوفے کے پیچھے کھڑے باپ اور بھائیوں کی گفتگو سن رہے تھے۔

"میرے خیال سے ہمیں جلد بازی میں فیصلہ نہیں۔۔۔"

"اس زمین کی لوکیشن بہت اچھی ہے۔ اس سے بہتر جگہ چاولوں کی فیکٹری ڈالنے کے لئے ہمیں نہیں مل سکتی اگر ہم دیر کرے گے تو زمین ہاتھ سے نکل جائے گی اور وہاں ہمارے بہت سے لوگ ہیں۔ جو ہمارے پیچھے سے سارے انتظامات اور فیکٹری کی دیکھ بھال کے لئے موجود ہونگے۔ میرے خیال سے ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے" میر فیصل نے میر رحمان کی بات درمیان میں کاٹی۔۔۔ میر رحمان کچھ کہتے کہ میر فرقان کلف لگے سفید کاٹن کی کمیز کا دامن جھاڑتے ہوئے صوفے سے کھڑے ہو گئے تو میر فیصل اور میر رحمان نے بھی اُن کی تقلید کی۔ میر فرقان جیسے فیصلہ کر چکے تھے۔

"رحمان ملتان والی زمین کا سودا کرو یہ زمین ہاتھ سے جانی نہیں چاہئے" میر فرقان حکم صادر کر چکے تھے۔ میر رحمان نے ایک گہری سانس کھینچی پھر بھائی کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے مسکرائے۔ میر فیصل نے بھی جواباً مسکراہٹ کا تبادلہ کیا۔

میر رحمان لاؤنج سے باہر نکلے تو ان کے تاثرات بلکل بدل گئے۔ چہرے پر برفیلا سا تاثر تھا۔ میر خلیل اب لاؤنج میں میر فیصل کے ہمراہ تنہا کھڑے تھے۔ جب رابعہ نے دو انگلیوں سے دروازے پر دستک دی تھی۔ دونوں نے بروقت مُڑ کر دروازے پر کھڑی سر کو ڈوپٹے سے ڈھانکے رابعہ کو دیکھا تھا، دراز قد اور خوبصورت نقش والی لڑکی کی نظریں زمین کو گھور رہی تھی۔

"بی جان منجھلے میر صاحب کو یاد کر رہی ہیں" گلابی ہونٹوں میں زنبش پیدا ہوئی۔

"آپ چلیں میں آتا ہوں" رعب دار مگر انتہائی نرم لہجے میں جواب دیا گیا تو لمحے بھر کے لئے رابعہ نے خوبصورت لمبی پلکیں اٹھا کر میر فیصل کے جاذب نظر سراپے کو دیکھا جو مکمل توجہ سے آنکھوں میں ایک نرم سا تاثر لئے اُسے ہی دیکھ رہے تھے۔ وہ سر کو ہلکا سا خم دیتے ہوئے وہاں سے فوراً چلی گئی۔)

کوئی آہستگی سے بنا چاپ پیدا کئے میر خلیل کے عقب میں آکر کھڑا ہوا تو میر خلیل ماضی کے دروازے کو مقفل کر کے جلدی سے حال میں داخل ہوئے۔ مہمانوں کے قہقہے، ملازموں کے کام کرنے کا شور اور ڈھولک کی آوازیں دوبارہ سُنائی دینے لگی۔

"یہاں تنہا کھڑے کیا سوچ رہے ہیں چاچو؟" میر آہل کسرتی بازوؤں کو سینے پر لپیٹتے ہوئے مستفسر ہوا۔ وہ ان کے شانہ بشانہ منڈیر پر کھڑا دود کھیتوں کو دیکھ رہا تھا۔

"وقت کتنی جلدی گزر گیا ہے" انہوں نے کھوئے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"اور بدل بھی گیا ہے" میر آہل کے انداز میں کچھ ایسا تھا کہ میر خلیل نے رُخ اُس کی جانب کیا۔

"وقت" آہل نے فقرا مکمل کیا اور میر خلیل کو دیکھے بغیر واپس مڑنے لگا جب میر خلیل نے اُسے پیچھے سے پکارا۔

"آہل بیٹے" نا جانے کیا تھا ان کے لہجے میں کہ آہل کے قدم زنجیر ہوئے۔ لب کے کنارے تھر تھرائے مگر اُس نے رُخ نہیں پھیرا کہ شاید وہ پتھر کا نا ہو جائے۔ وہ ہنوز جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا رہا۔

"اِن نو سالوں نے ہمارے درمیان صدیوں کا فاصلہ حائل کر دیا ہے بیٹا" میر خلیل کی آواز میں عجیب سی تھکن واضح تھی۔

"تصیح کیجئے چاچو فاصلہ ان سالوں نے نہیں بلکہ۔۔۔" الفاظ ادا کرنا مشکل سا ہوا۔ اُسے لگا کسی نے اُس کا دل مٹھی میں لیا ہے۔

"بلکہ؟" انہوں نے نا جانے کس بات کی تصدیق کرنا چاہی۔

آہل کے لئے وہاں مزید ٹھہرنا ناگزیر ہو رہا تھا۔

"تنہائی کے احساس نے ہمارے درمیان صدیوں کا فاصلہ کھینچا ہے چاچو" اس وقت یہی جواب اُسے مناسب لگا تھا۔ میر خلیل نے دکھ سے گہری سانس ہوا میں خارج کی۔

"اگر تم چاہو تو یہ فاصلہ ہم مل کر طے کر لیں گے آہل۔ کچھ قدم تم طے کر لینا اور کچھ قدم میں آگے بڑھا لوں گا آہستہ آہستہ سارے زخم سِل جائیں گے۔ ہر درد کی دوا مل جائے گی۔ سب پہلے جیسا ہو جائے گا اگر تم۔۔۔" وہ کہتے

کہتے دو قدم آگے بڑھے۔ نیم اندھیرے میں ڈوبی چھت کے فرش پر میر خلیل کا سایہ اُسے اپنی جانب بڑھتا دکھائی دیا۔

"اگر" وہ ہنوز جیب میں ہاتھ ڈالے میر خلیل کی جانب پشت کئے سامنے والی منڈیر کو تکتے ہوئے بول رہا تھا۔

"بات ساری اس لفظ (اگر) پر اکر ٹھہر جاتی ہے چاچو اور میں"۔۔۔۔ لمحے بھر کی خاموشی۔۔۔۔ "میں (اگر مگر) کے چکر میں اپنا وقت پہلے سے ضائع ہو چکے وقت پر مزید ضائع نہیں کرتا" بات مکمل کر کے وہ زینے پھلانگتا نیچے اُتر گیا تھا اور میر خلیل اندھیرے میں کھڑے چاند کی روشنی میں نا جانے کونسا داغ دیکھنے میں کھو گئے۔

☆...☆...☆

وہ بی جان کے پاس بیٹھا اُن کے پیروں کو اپنی گود میں رکھ کر نہایت محبت اور نرمی سے دبا رہا تھا۔

"ارے پُتر کیوں خود کو ہلکان کرتا ہے مت بگاڑ میری عادتیں" انہوں نے شفقت سے کہتے ہوئے اپنے پیر کھینچنے چاہے۔

"کر لینے دیں مجھے آپ کی خدمتیں مت روکیں۔ آپ کو نہیں معلوم اتنے سال آپ سے دور پردیس میں آپ کا یہ لمس میں نے سب سے زیادہ یاد کیا ہے۔" میر آہل نے ان کے پیروں پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے عقیدت سے کہا۔

"تو رُک جا پتر" اس التجا میں مان تھا، آس تھی، محبت تھی۔ میر آہل کے پیر دباتے ہاتھ سُست ہوئے۔ نظریں ہنوز پیروں پر جمی رہی۔

" آپ کے کہنے پر میں دل آویز سے شادی کر رہا ہوں بی جان حالانکہ میں اُسے کبھی بھی اپنی زندگی میں شامل کرنے کے حق میں نہیں تھا مگر" اُس نے نظر اٹھا کر بی جان کی غمگین آنکھوں میں جھانکا۔۔۔ "مگر اس حویلی نے مجھ سے میرا بہت کچھ چھینا ہے۔ یہاں کی ہر دیوار میرے جگر کا لہو مانگتی ہے۔ آپ کو نہیں معلوم یہاں بِتائے جانے والا ایک ایک لمحہ کسی آزمائش کی طرح گزر رہا ہے مجھ پر۔ پلیز بی جان میری آزمائش کو مزید نا بڑھائیں۔ یہ میری آپ سے پہلی اور آخری درخواست ہے" اس نے نرمی سے بی جان کے پیروں کو چوما تو سلطانہ بیگم کی آنکھ میں برسوں کے ٹھہرے آنسو بند توڑ کر رخساروں پر بہ نکلے۔

انہوں نے میر آہل کے جھکے ہوئے سر پر شفقت سے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ انہیں اپنے پیروں پر نمی محسوس ہوئی تھی۔

یہ وہ شخص تھا جس سے پہاڑ بھی ٹکرانے سے پہلے سوچتا تھا۔ جذباتوں کو تو اُس نے ایک عرصہ پہلے ہی قفل لگا کر دل کے کسی خانے میں پھینک دیا تھا۔

وہ میر آہل تھا پتھر جیسا سخت اور چٹان سے بھی زیادہ مضبوط۔

مگر اس وقت بی جان کے پیروں پر سر جھکا کر روتے ہوئے وہ دس سال پہلے والا کم عمر معصوم سا بچہ لگ رہا تھا۔ جس کے اپنوں نے ہی اُسے یہ روگ دیئے تھے۔ ماں باپ کے انتقال کے بعد وہ یکدم اکیلا ہو گیا تھا۔ پردیس میں ایک لمبا عرصہ تنہائی میں کاٹنے کے بعد۔۔۔ جذبات جیسی کوئی بھی شہ اس کے اندر باقی نہیں رہی تھی۔

کمرے کا ماحول کافی سنجیدہ اور سپاٹ تھا۔ جب کمرے کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔

"ارے میری بیٹی بھی آگئی دیکھو کتنی پیاری لگ رہی ہے ماشاء اللہ" بی جان نے دودھ کا گلاس تھامے مسٹرڈ رنگ کی شلوار قمیض میں ملبوس دل آویز کو دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ گھر کے سیدھے سادھے سے حُلیے میں بھی بہت پرکشش دکھائی دے رہی تھی۔ میر آہل نے سر نہیں اٹھایا۔ حتیٰ کہ چہرے پر پھیلی نمی خشک ہو گئی۔ وہ یوں ہی سر جُھکائے بی جان کے پیروں کو نرمی سے دباتا رہا البتہ نظریں دل آویز کے دودھیا پیروں پر تھیں۔

"اور کچھ چاہیئے آپ کو بی جان" وہ سراپا سوال بن گئی۔

"مجھے تم دونوں کی خوشیاں دیکھنے کے سوا اب اور کچھ نہیں چاہیئے بیٹا جی" انہوں نے حسرت بھری نگاہوں سے باری باری میر آہل اور دل آویز کو دیکھا۔ دونوں کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا مگر کسی نے بھی نظر اٹھا کر ایک دوسرے کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔

میر آہل ہنوز بی جان کے پیر دباتا رہا اور دل آویز دودھ کا گلاس رکھ کر خاموشی سے دروازہ مقفل کر کے وہاں سے چلی گئی۔ یکدم اُسے گھٹن سی محسوس ہوئی تھی۔ ناجانے کیوں آج بی جان کی بات سن کر اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز نہیں ہوئی تھیں۔ اس بھنور میں ہچکولے کھا کھا کر اب اس کا سر اور دل دونوں دُکھنے لگے تھے۔

یہ کیسا رشتہ تھا۔ جس میں زبردستی اُسے دھکیلا جا رہا تھا۔ نا چاہے جانے والا احساس کیا ہوتا ہے۔ یہ اُسے اب سمجھ آنے لگا تھا۔

کل اُس شخص کے ساتھ اس کا نکاح تھا۔ جس شخص کی زندگی میں اُسے زبردستی شامل کیا جا رہا تھا۔

کل کے بعد زندگی بلکل بدلنے والی تھی۔

☆...☆...☆

کمرے میں کافی اندھیرا تھا۔ اُس نے دیوار پر ہاتھ مار کر بٹن آن کیا تو کمرہ تیز روشنی میں نہا گیا۔ وہ کمرہ مقفل کر کے پلٹا ہی تھا کہ سامنے نا جانے کہاں سے ریما اس کے کمرے میں نمودار ہوئی۔

آہل کے تاثرات سخت ہوئے اور لب سختی سے بھنچ گئے۔

"رات کے اس پہر میرے کمرے میں کیا کر رہی ہو تم" اس نے برفیلے لہجے میں کہا تو ریما کی رنگت پھیکی پڑی۔

"وہ میں آپ کے کمرے کا جائزہ لینے آئی تھی کہ کہی کسی چیز کی کمی تو نہیں" اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا مگر درحقیقت اس کا مارے خوف کہ بُرا حال ہو رہا تھا۔

"یہ امی بھی نہ نجانے کیسے کیسے خُرافاتی ترکیبیں لاتی ہیں۔ شادی تڑوانے کے اور بھی بہت سے طریقے تھے۔ مجھے پتہ نہیں کیوں اس بھوکے شیر کے آگے ڈال دیا یہ اللہ مدد" ریما نے دل ہی دل میں اپنی اماں زلیخا کو کوسا۔ آہل کی خون رنگ آنکھیں کمرے میں ہیجان پیدا کر رہی تھیں۔

"نکلو میرے کمرے سے" یہ کہتے ہوئے میر آہل نے ہینڈل نیچے کیا ہی تھا کہ اُسے زور کا جھٹکا لگا۔ کسی نے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔ اُس نے یقین دیہانی کرنے کے لئے ہینڈل کو سختی سے ایک بار پھر نیچے کیا مگر دروازہ نہیں کُھلا۔

اُس نے دانت پیستے ہوئے دروازے کو زور سے پاؤں سے ٹھوکر ماری اور مُٹھی بھنچتے ہوئے ریما کو خون رنگ آنکھوں سے دیکھا۔

"بتاؤں کس مقصد سے آئی تھی یہاں تم" وہ غصے سے چلایا تھا۔

"و۔۔۔و۔۔وہ میں" ریماڈر کے مارے دو قدم پیچھے ہٹی۔

دروازے کے پیچھے سے دبی دبی سی آوازیں ابھریں۔۔۔کسی نے ہینڈل نیچے کیا اور ہلکی سی چر چراہٹ کے ساتھ دروازہ کُھلا۔

"آئے میر صاحب آپ کو میری بات کا تو اعتبار نہیں تھا نہ تو اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اپنے پیارے بھتیجے کے کرتوت "زلیخا دندناتے ہوئے کمرے میں ایسے داخل ہوئیں جیسے پولیس چور کو پکڑنے کے لئے پوری تیاری کے ساتھ چھاپا مارتی ہے۔

"آپ بھی آنکھ کھول کر دیکھ لیں بی جان آپ کا پوتا شادی تو دل آویز سے کر رہا ہے مگر رات کے اس پہر میری بیٹی کو بھی ورغلا رہا ہے "زلیخا نے کینہ توز نظروں سے بی جان کو دیکھا اور پھر ایک نظر پیچھے کھڑی دل آویز(جو مسلسل ڈوپٹے کے کونے کو مڑوڑ رہی تھی) کو دیکھا اور شیطانی سا مسکرائیں۔

"اور آپ سب چوروں کی طرح آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں مگر میر صاحب اتنا یاد رکھیں کہ میں اپنی بیٹی کو اس طرح رُسوا نہیں ہونے دوں گی"بس لمحے لگے تھے بی جان، میر خلیل اور میر آہل کو زلیخا کے ارادے سمجھنے میں میر آہل جو کھنچے ہوئے تاثرات لئے کھڑا تھا یکدم ڈھیلا پڑا اور بے نیازی سے کان کی لو مسلی۔

"تو آپ کیا چاہتی ہیں؟"میر خلیل نے پر سکون انداز میں زلیخا سے استفسار کیا۔

میر آہل نے آئی بروز اچکائیں۔۔۔بی جان نے بھی رُخ موڑ کر میر خلیل کے چہرے کو ٹٹولا مگر وہاں ایک نرم سا تاثر تھا۔

"میں۔۔۔میر صاحب میں ایک ماں ہونے کی حیثیت سے یہ چاہتی ہوں کہ جو داغ (نظر موڑ کر میر آہل کو دیکھا جو اب بلکل شانت اور بے نیاز سا نظر آرہا تھا) آپ کے بھتیجے نے میری بیٹی پر لگایا ہے اُسے صاف بھی یہی کرے "ڈوپٹے کے پلُو سے آنکھ کے کنارے کو رگڑتے ہوئے انہوں نے مظلومیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے تھے۔

"داغ؟"

"how dramatic .... Huhh" ناخُن سے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے آہل نے دل ہی دل میں سوچا تھا۔

"ہمم "میر خلیل نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گہری سانس لی اور زلیخا کا سر سے لیکر پاؤں تک جائزہ لیا۔

"سہی کہہ رہی ہیں آپ زلیخا غلطی کی ہے تو خمیازہ بھی بھگتنا پڑے گا" یہ سن کر زلیخا کے چہرے پر ایک دم فاتحانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

ریما نے حیرت سے باری باری زلیخا اور پھر میر خلیل کو دیکھا۔ دل آویز کی گرفت ڈوپٹے پر مزید گہری ہوئی اور بی جان نا سمجھی سے میر خلیل کو دیکھنے لگیں جیسے اپنی سماعتوں پر یقین نا آیا ہو۔

خاموش کمرے میں اچانک "ٹھاں" کی زوردار آواز گونجی اور ہر شے لمحے میں ویران ہو گئی۔

سب نے بے یقینی سے پہلے میر خلیل کو دیکھا جن کے تاثرات اب برفیلے ہو چکے تھے۔ زلیخا نے سسکتے ہوئے اپنے سُرخ ٹمٹماتے ہوئے گال پر ہاتھ رکھا جہاں میر خلیل کی انگلیوں کے نشان ثبت ہو چکے تھے۔

بی جان نے ایک گہری سانس اندر کی جانب کھینچی جیسے درد میں اچانک کرار آگیا ہو۔

"Wow ! What a shot" میر آہل نے ہونٹ دباتے ہوئے گردن مسلی جیسے چہرے پر آئی مسکراہٹ دبانے کی کوشش کر رہا ہو۔

یہ تھپڑ کچھ سال پہلے مارا ہوتا تو آج حالات کچھ مختلف ہوتے۔ شادی والا گھر ہے۔ گھر مہمانوں سے بھرا پڑا ہے اور آپ...؟ انہوں نے شرمندگی سے الفاظ ادھورے چھوڑ دیئے اور ایک ملامتی نظر زلیخا پر ڈالتے ہوئے کمرے سے فوراً باہر نکل گئے۔

زلیخا نے ندامت سے نظریں نیچے جھکاتے ہوئے چہرے پر بہتے آنسوؤں کو صاف کیا اور بنا کچھ کہے وہاں سے خاموشی سے چلی گئیں۔ سارا پلین چوپٹ ہو گیا تھا اور بیٹی کی رسوائی الگ۔

انہوں نے تو میر خلیل کی سہی رگ دبائی تھی پھر ایسا کیا تھا جو اس کا نشانہ چُوک گیا تھا۔ اب وہ کیسے گھر میں کسی سے نظریں ملاتی۔

"تمہیں الگ سے انویٹیشن دینا پڑے گا؟" میر آہل نے ریما کو گھورتے ہوئے کہا تو ریما بھی فوراً کمرے سے نو دو گیارہ ہو گئ۔

میر آہل نے رُخ بی جان کی جانب موڑا تو نظریں پھسل کر پیچھے دروازے پر کھڑی خاموش اور سہمی ہوئی لڑکی سے ٹکرائیں۔

دل آویز نے فوراً نظریں نیچے کی اور وہاں سے چلی گئی۔ اس خاموش کمرے میں اب بی جان اور میر آہل کے سوا دل آویز کی مہندی کی خوشبو باقی رہ گئی تھی۔

"آہل پُتر مجھے تجھ سے کچھ بات کرنی ہے" بی جان نے کندھے سے تھامتے ہوئے کہا۔

☆...☆...☆

آج فضا میں عجیب یاسیت گھُلی تھی۔ وہ ہر شے سے بیگانی آئینے کے سامنے کاجل سے سجی آنکھوں میں اپنے ارمانوں کے جنازے کو کندھا دے رہی تھی۔ سرخ مائل چہرہ بلکل سپاٹ تھا۔ سفید رنگ کے گرارے میں ملبوس وہ زندہ لاش لگ رہی تھی۔ جس کا جنازہ کچھ دیر بعد نکاح کی صورت پڑھائے جانے والا تھا۔

"آپ کے کہنے پر میں دل آویز سے شادی کر رہا ہوں بی جان حالانکہ میں اُسے کبھی بھی اپنی زندگی میں شامل کرنے کے حق میں نہیں تھا" دن کی روشنی میں میر آہل کی آواز ہیولے کی صورت اس کے سامنے نمودار ہوئی۔ جو اُس نے کل رات دروازے کی اوٹ سے سُن لی تھی۔ اس نے ٹھٹک کر شیشے میں اپنے بے حال وجود کو دیکھا۔۔ نکاح کا سرخ ڈوپٹہ، ہاتھ میں پہنے گجرے اور کانوں میں لٹکتے جھمکے۔۔۔ سر سے لیکر پاؤں تک ہر شہ اس کا منہ چِڑا رہی تھی۔ اس کے خوابوں کی بکھری تعبیر پر بین کر رہی تھی۔

"ماشاءاللہ دل آویز دلہن بن کر کتنی حسین لگ رہی ہو" دروازے پر کھڑی اریبہ نے دل آویز کے سجے سنورے روپ کو دیکھ کر بے ساختہ کہا تو دل آویز نے ویران نظروں سے آواز کا تعاقب کرتے ہوئے اریبہ کو دیکھا۔

اریبہ اور دل آویز پانچویں جماعت سے ساتھ پڑھ رہے تھے۔ بی جان کے بعد اس کا ہمدرد اور غم گزار کوئی تھا تو وہ اریبہ ہی تھی۔ جس سے وہ اپنی دل کی باتیں کھُل کر کر لیتی تھی۔

"کیا ہوا ہے دل آویز آج تو تمہاری زندگی کا سب سے بڑا اور خاص دن ہے اور تم اتنی اداس دکھائی دے رہی ہو" اس کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

"کسی کو زبردستی کسی کی زندگی میں شامل کر دیا جائے تو وہ کیسے خوش ہو سکتا ہے اریبہ؟" دل آویز نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔

"مگر دل آویز آہل بھائی سے تو تمہارا رشتہ بچپن۔۔۔" وہ نا سمجھنے والے انداز میں بولی "اور تم نے پہلے کبھی یہ خیال بھی ظاہر نہیں کیا کہ تم اس شادی سے خوش نہیں ہو بلکہ تم تو اُن کی آمد پر کافی خوش اور اِکسائیٹڈ تھی اب وہ اس کی پشت پر کھڑی آئینے میں اُسے گھور رہی تھی۔

دل آویز یوں ہی کچھ دیر یاسیت سے اُسے دیکھتی رہی در حقیقت وہ اُسے نہیں بلکہ کسی اور ہی خلا میں کھو گئی تھی۔

"تم فکر مت کرو شادی کے بعد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اور نکاح میں بہت برکت ہوتی ہے۔ نکاح کے بعد محبت ہو ہی جاتی ہے" اس نے خود ہی بات کا آغاز کرتے ہوئے دل آویز کو تسلی دینی چاہی۔

"دل کی تسلی کے لئے خیال اچھا ہے مگر محبت کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ محبت یہ تو ہوتی ہے یہ پھر نہیں ہوتی۔ محبت کوئی میٹنگ نہیں ہے جس کے لئے اپائنٹمنٹ لینا پڑے۔

جو لوگ دماغی طور پر مفلوج ہوتے ہیں۔ اُن لوگوں کو یہ تسلیاں دے کر شادی کے بندھن میں باندھ دیا جاتا ہے اور ان کے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں بچھتا اس لئے وہ اس مجبوری کو محبت کا نام دے کر اپنی زندگی گزار دیتے ہیں۔" وہ عجیب سی کیفیت میں بڑبڑا رہی تھی۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے دل آویز؟" اریبہ نے اُسے اِس کیفیت میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"مجھے؟" دل آویز نے آنکھ زور سے بند کی تو شبنم کا ایک قطرہ پھسل کر رخسار پر آ کے ٹھہر گیا۔۔۔ "مجھے محبت ہو گئی ہے اریبہ اور" وہ ایک بار پھر ٹھہر گئی۔ ان الفاظوں کو ادا کرنے کے لئے بہت حوصلہ چاہئے تھا۔

"اور؟" اریبہ نے جملہ دہراتے ہوئے دل آویز کو مستفسرانہ نظروں سے دیکھا۔

"اور میر آہل کو نہیں ہوئی ہے" یکا یک آنسوؤں کا ایک ریلہ اس کے اتنے دِنوں میں تعمیر کردہ آشیانے کو بہا کر لے گیا۔

☆...☆...☆

(اور انسان کو وہی سب ملتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرتا ہے)

زلیخا نیوی بلیو رنگ کی ساڑھی کا پلو ٹھیک کرتے ہوئے ذو معنی انداز میں آئینے کے سامنے کھڑی خود کا جائزہ لے رہی تھی۔ ساڑھی کے پلو پر سلور رنگ کے بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ کانوں میں بھاری جھمکے لٹک رہے تھے۔ آنکھ کے نیچے نیل کے نشان کو چھپانے کے لئے فائونڈیشن کی تہہ بہت مہارت سے لگائی گئی تھیں تاکہ کوئی اندر کی بات چہرے سے نہ بھانپ لے۔ زلیخا نے اپنی تیاری کو اختتامی مرحلے میں ڈالتے ہوئے ایک آخری نگاہ شیشے میں دیکھتے ہوئے خود پر ڈالی۔

(کوشش ہی تو جیت کی پہلی سیڑھی ہوتی ہے)

وہ چہرے پر گہری مسکان سجائے۔۔۔ مہمانوں سے ملتیں، مصافحہ کرتیں آگے بڑھ رہی تھیں۔ کل رات والے واقعے کے آثار چہرے سے بلکل غائب ہو گئے تھے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ وہ کافی مطمئین اور خوش نظر آرہی تھیں۔

(کہتے ہیں فیصلوں کا اختیار ہمیشہ انسان کے ہاتھ میں ہوتا ہے)

انہوں نے انگلی سے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور اجازت کی منتظر دروازے کو گھورنے لگیں۔ وہ میر خلیل کی بیوی تھیں۔ وہ شخص جو اُن کی رضامندی سے انکی زندگی میں شامل نہیں کیا گیا تھا مگر پھر بھی وہ ان کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور تھیں اور اب وقت آگیا تھا کہ وہ زلیخا میر خلیل بن کر اپنے سارے حق ادا کرتیں۔

(نیکی اور بدی۔۔۔ یہ دو راستے ہیں چاہے تو نیکی کو چُن کر صراط مستقیم پر چلو یا پھر بدی کو اپنا کر نیکی کو مات دو مگر)

"بی جان آپ تیار ہو گئیں تو چلیں؟ سب آپ کے منتظر ہیں" وہ معنی خیز انداز میں مسکرائیں۔۔۔ اس مسکراہٹ میں بہت کچھ تھا۔ اتنے سالوں کی عداوتیں، یاسیت اور ایک انجان سا تاثُر۔۔۔

بی جان بستر پر سرہانے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں گویا کسی کی منتظر ہوں کیونکہ طبیعت کی ناسازی نے ان کے جسم کو کمزور کر دیا تھا۔

"ارے زلیخا بہو تم مجھے لگا دل آویز آئی ہے پھر یاد آیا میری بچی کی تو آج شادی ہے۔ وہ تو تیار ہو رہی ہو گی۔ ایک مُدت انتظار کیا ہے اپنی بچی کو دلہن بنتے دیکھنے کا۔ آج جا کر وہ خواہش پوری ہو گی"

انہوں نے اچانک یاد آنے پر مسکرا کر کہا۔ اس مسکراہٹ میں ایک نرم سا تاثر تھا۔ جیسے کل رات والا قصہ بھول بھال گئیں ہوں۔

"جی بی جان صحیح کہا آپ نے کچھ خواہشات بڑی دیر سے پوری ہوتی ہیں" وہ زمین کو چھوتا پللو پیچھے سے سمیٹتے ہوئے قدم بقدم چلتی بستر کے قریب آئیں۔

"اور کچھ خواہشات"

جھک کر بستر پر رکھا تکیہ اٹھایا اور جھکی گردن کے ساتھ نظر اٹھا کر بی جان کے جھریوں سے ڈھکے چہرے کو دیکھا

"کبھی پوری نہیں ہوتیں"

بی جان نے مستفسرانہ نگاہوں سے زلیخا کو دیکھا اور بس لمحے لگے تھے اُنہیں سمجھنے میں مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

(مگر نیکی کو کبھی کوئی مات دے سکا ہے بھلا؟)

"کچھ خواہشوں کی تکمیل انسان کو قبر تک پہنچا دیتی ہے" وہ بی جان پر جھکی تکیے سے اُن کا منہ دبائے ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہی تھیں۔

"افسوس بی جان آپ کا صبر کبھی ختم نہیں ہو گا" بی جان کی آنکھیں آہستہ آہستہ سُرخ ہونے لگیں۔ زلیخا کے الفاظ ان کے سینے میں پیوست ہو رہے تھے۔

"دل آویز کو دلہن بنا دیکھنے کی آپکی یہ خواہش۔۔۔ خواہش ہی رہ جائے گی۔ آج بی جان آپ ناانصافی نہیں کر سکیں گی۔۔۔ میرے ساتھ۔۔۔ میری بیٹی کے ساتھ" زلیخا کے چہرے پر ایک پُراسرار سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ بی جان کے کمزور ہاتھ سائیڈ ٹیبل کے شیشے کو پوری قوت سے تھپتھپا رہے تھے۔

تکیے پر دباؤ مزید بڑھا، سانسیں اندر ہی کہی الجھ کر رہ گئیں، آنکھوں میں زندگی کی جوت بُجھتی ہوئی محسوس ہوئی اور یکدم جسم ٹھنڈا پڑ گیا۔

بس اتنی سی دیر لگتی ہے روح کو جسم چھوڑنے میں اور انسان اِس جہاں سے اُس جہاں منتقل ہو جاتا ہے۔

بی جان کا مزاحمت کرتا ہاتھ ایک دم پہلو میں جا گرا۔

زلیخا نے ایک جھٹکے سے تکیہ بی جان کے چہرے سے ہٹایا اور گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے ایک قدم دور ہٹی اور تکیے کو بستر پر پھینکا۔

بی جان کے ہونٹ خشک ہو چکے تھے۔ آنکھیں اوپر کو چڑھی ہوئی تھیں۔ زلیخا نے بی جان کا پہلو میں جھولتا ہاتھ آہستگی سے اٹھا کر بستر پر رکھا۔

بی جان کی کھلی ہوئی آنکھیں زلیخا کے اندر انتشار پیدا کر رہی تھی۔ انہوں نے طنزیہ انداز میں جھک کر بی جان کی کھلی آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر انہیں بند کر دیا۔

"اللہ آپ کو میرے ساتھ کی گئی زیادتیوں کے لئے معاف کرے بی جان" وہ نفرت آمیز لہجے میں بڑبڑائی اور حقارت سے ان پر ایک آخری نگاہ ڈالی۔

☆...☆...☆

دروازے پر پڑتی مسلسل دستک نے دل آویز اور اریبہ کی گفتگو میں خلل ڈالا تھا۔ دل آویز نے فوراً ہتھیلی سے گال پر بہتے آنسوؤں کو صاف کیا۔

"اندر آجائیے" اس نے دروازے کو دیکھتے ہوئے آواز میں بہتی نمی کو خشک کرنے کی کوشش کی۔

"دل آویز بی بی قیامت آگئی ہے" ملازمہ اندر آتے ہی پریشانی سے بولی۔

"خیریت ہے کیا ہو گیا آچانک؟" دل آویز کے ماتھے پر بل پڑے چند لمحے پہلے والے غمگین تاثرات کا اب اس کے چہرے پر شائبہ تک نہ تھا۔ غم کی جگہ فکر مندی نے لے لی تھی۔

"دل آویز بی بی وہ بی جان۔۔۔" ابھی جملا ملازمہ کے حلق میں تھا کہ دل آویز فوراً اُٹھی اور بی جان کے کمرے کی طرف لپکی۔ اس کے پیچھے اریبہ اور ملازمہ بھی بی جان کے کمرے کی جانب دوڑی تھیں۔ حویلی یکدم سناٹوں کی زد میں آگئی تھی۔ ہر ایک کی آنکھ اشک بار تھی۔

کمرے کے نزدیک پہنچتے ہی دل آویز کے قدم سُست ہوئے۔ راہداری میں کچھ مہمان کھڑے افسوس اور تلخی کے مِلے جُلے تاثرات لئے دل آویز کو دیکھ رہے تھے۔

"بیچاری اب کیا ہو گا اس کا آہل تو سُنا ہے دو دن بعد واپس جا رہا ہے؟" کسی نے افسوسناک لہجے میں آہستگی سے سرگوشی کی تھی۔

"یہ تو ہے ہی منحوس اپنے ماں باپ تک کو چھوڑا نہیں اس نے اونہوں"

ایک عجیب سے احساس نے اس کے دل کو آگھیرا تھا۔ کمرے سے زلیخا کے بین کرنے کا شور آرہا تھا۔

وہ غرارے کو پہلو سے اُٹھائے بمشکل کمرے کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی تھی۔

اور اُسے لگا کسی نے ساتوں کے ساتوں آسمان ایک ساتھ اس کے اوپر ڈھا دیئے ہیں۔ گجرے پہنے ہاتھ یکدم پہلو میں جا گرے تھے۔

جب خاموشی بھی خاموشی اختیار کر لے تو آنکھ سے بہتے آنسوں کا احساس بھی سماعتوں کو شور کی طرح چبھنے لگتا ہے۔

وہ خُراماں خُراماں صدمے کی کیفیت میں چلتی بستر کے نزدیک آئی جہاں بی جان کا ٹھنڈا جسم چادر کی اوٹ میں رکھا ہوا تھا۔

جب روح جسم کو چھوڑتی ہے تو ایک شور برپا ہوتا ہے۔ اُس شور میں دم توڑتی زندگی کی خاموشی سُنی ہے کبھی؟ وہ خاموشی اتنی اذیت ناک اور جان لیوا ہوتی ہے کہ انسان کے دماغ کی شہہ رگ پھاڑ دیتی ہے۔

خوشی کے ماحول میں پراسراریت سی چھاگئی۔ جہاں شادیانے بجنے تھے وہاں صفِ ماتم بچھ رہے تھے۔

"یہ سب کیسے ہوا"

"جی وہ بی جان کو بلانے آئی تھی تو دیکھا کہ وہ۔۔"

"بیچاری کتنی بدنصیب ہے"

دل آویز کی سماعتیں ان تمام سرگوشیوں سے بے نیاز ہو گئی تھیں۔ منظر سے ہر ایک شخص غائب ہو گیا تھا۔ وہ آج ایک بار پھر سے یتیم و مسکین ہو گئی تھی۔

"حئے بی جان کتنی جلدی چلی گئیں آپ ہم سب کو چھوڑ کر" زلیخا دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹتے ہوئے بولی۔

میر خلیل جو نم آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے یکدم ہمت کرتے ہوئے بولے۔۔۔"جلالی بی جان کے جنازے اور تدفین کے انتظامات دیکھو" کہتے ہی میر خلیل نے ساتھ کھڑے آہل کی جانب نظر اٹھائی جس کا چہرہ سپاٹ مگر آنکھوں میں صدیوں کا کرب سمٹ آیا تھا۔ لب سِل گئے تھے مگر آنکھیں ماتم کر رہی تھیں۔

جب کوئی مر جائے تو محض وہ ایک شخص نہیں مرتا اُس شخص سے جڑا ہر شخص مر جاتا ہے۔

"جلالی رُکو" آہل نے ضبط سے آنسوؤں کو آنکھ کے کنارے پر ٹھہراتے ہوئے جلالی کو مخاطب کیا۔

"جی چھوٹے میر صاحب" جلالی جاتے جاتے رُکا اور ادب سے سر کو خم دیتے ہوئے بولا۔

"بی جان کی تدفین کی تیاری ہمارے نکاح کے بعد ہو گی"

لمحے بھر کی خاموشی

"دل آویز اور میرا نکاح بی جان کا جنازہ اٹھنے سے پہلے ہو گا۔ آج، اِسی وقت اس کمرے میں بی جان کی موجودگی میں" میر آہل نے ہر لفظ ضبط سے ٹھہر ٹھہر کر ادا کیا۔

زلیخا نے حیرت سے گنگ پھٹی پھٹی نظروں سے میر آہل کو سر تا پاؤں دیکھا جیسے اُسے سُننے میں غلطی ہوئی ہو۔

میر خلیل جہاں تھے وہی کے وہی کھڑے رہ گئے۔ دل آویز سمیت کمرے میں موجود ہر شخص اپنی جگہ پر منجمد رہ گیا۔

میر آہل کا لہجہ اس قدر مضبوط تھا کہ میر خلیل چاہتے ہوئے بھی مداخلت نہیں کر سکیں۔ وہ اس انداز کو بخوبی پہچانتے تھے۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ اس خاندان کے مرد ایسے ہی تھے۔ لمحوں میں فیصلے کرتے تھے چاہے پھر خمیازہ جو بھی بھگتنا پڑے۔

دل آویز نے بھیگی پلکیں اٹھا کر سامنے کھڑے اس مغرور شخص کو دیکھا تھا۔ میر آہل کی پشت پر کھڑکی سے چھن کر آتی سورج کی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ بظاہر مضبوط اور خاموش دکھنے والے اِس شخص کی آنکھوں میں کرب اور یاسیت کا ایک طوفان بپا تھا۔

اور جو لوگ یہ کہتے ہے نہ کے مرد روتا نہیں ہے وہ غلط کہتے ہیں۔

نمی کا بوجھ دل آویز کی پلکیں اٹھا نہیں پا رہی تھیں اور اب دیکھنے کو رہ کیا گیا تھا۔ آگے سب کچھ ایک دم سِلو موشن میں ہوتا محسوس ہوا۔

کسی نے اُسے سہارا دے کر پاس رکھے صوفے پر بٹھایا تھا۔ کسی نے نکاح کا لال دوپٹہ اس کے سر پر اوڑھایا تھا۔ ایک مضبوط اور مستحکم سا شخص اس کے پہلو میں آ کر بیٹھا تھا۔ سماعتوں میں قاضی کی سوال کرتی آواز ٹکرائی تھی۔

اس نے خود کو " قبول ہے "کا ورد کرتے سنا تھا اور پھر باقی تمام آوازیں اور سرگوشیاں دم توڑ گئی تھیں۔

زلیخا کی مزاحمت و مداخلت، لوگوں کی طرح طرح کی باتیں اور خاندان کی سوال کرتی آنکھیں۔۔۔ سب پسِ منظر سے اوجھل ہو گئے تھے۔

باقی رہ گیا تھا تو میر آہل، دل آویز اور کان کے پردے پھاڑ دینے والی طویل اور گہری خاموشی۔

☆...☆...☆

رات کا تیسرا پہر تھا جب ہوا کا تیز جھونکا کھڑکی کے پٹ سے ٹکرایا تو پردے پھڑپھڑانے لگے۔ وہ اچانک کچی نیند سے ڈر کر اُٹھی تو دیکھا کہ کمرہ زیرو لائٹ کی ہلکی سی زرد روشنی میں ڈوبا ہوا ہے۔ دل آویز نے ارد گرد کمرے کی در و دیوار کا جائزہ لیا تو اُسے اندازہ ہوا کہ یہ اُسکا کمرہ نہیں ہے۔

میر آہل سفید رنگ کی شلوار قمیض میں ملبوس دنیا سے بے خبر کھڑکی کے سامنے رکھے صوفے پر بے نیازی سے سو رہا تھا۔ چاند کی روشنی میں بھیگا اس کا چہرہ بے حد معصوم لگ رہا تھا۔ کچھ گھنٹے پہلے والا منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے کسی فلم کی طرح چلنے لگا۔

وہ نورانی سا سرد چہرہ، لوگوں کی سوال کن آنکھیں اور زلیخا چچی کی ملامت کرتی صدائیں مگر اُن سب چیزوں میں ایک چیز اور بھی تھی جس نے آج تنہا ہو جانے کے بعد بھی دل آویز کو تنہائی کا احساس ہونے نہیں دیا تھا۔

وہ تھا میر آہل کا ساتھ۔۔۔ وہ محض ساتھ نہیں تھا۔ وہ دل آویز کی مصیبت میں آڑے آ جانے والی ڈھال تھا۔ اس کی کُل کائنات تھا۔

وہ گھٹنے پر ٹھوڑی ٹکا کر بازوؤں کو گھٹنوں کے گرد حمائل کرتے ہوئے سامنے کھڑکی سے نظر آتے جھل ملاتے چاند کو دیکھنے لگی۔

آنسوں کے چند قطرے بستر کی سلوٹ میں گُم ہوئے۔

"میں اس پورے چاند کو گواہ بنا کر قسم کھاتی ہو کہ جس طرح آج آپ میری ڈھال بنے اِسی طرح میں بھی آپ کے ہر آنسوں کو اپنی آنکھوں میں چُھپا لوں گی" وہ چاند کی روشنی میں نظر آتے میر آہل کے روشن چہرے کو دیکھتے ہوئے من ہی من میں بولی تھی اور گواہ آسمان پر اداسی سے مسکراتا چاند بنا تھا۔

وہ روتے روتے کب دوبارہ خواب خرگوشی میں اُتری پتا نہیں چلا اور رات کا تیسرا پہر آخری مرحلوں میں منتقل ہونے لگا۔ رات کا گہرا اندھیرا صبح کی روشنی سے آہستہ آہستہ ملنے لگا تب میر آہل کی آنکھ کُھلی۔۔۔ وہ خمار آلود آنکھوں کو مسلتے ہوئے اٹھ کر بیٹھا تو میر آہل کی نگاہیں سامنے بستر پر دراز دل آویز پر بے ساختہ جا کر ٹھہر گئیں۔

کسی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ دو وقتوں کے ملنے کا پہر بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ وہ بے ساختہ سا دل آویز کو دیکھتا ہی چلا گیا یہاں تک کہ صبح کا اُجالا رات کے اندھیرے کو مکمل طور پر چیرتے ہوئے پورے آسمان پر پھیل گیا۔

وہ کہنیاں گھٹنے پر ٹکائے دونوں ہاتھوں کو باہم جوڑتے ہوئے انگلیاں ہونٹوں سے لگائے پورے انہماک سے دل آویز کو ہر شہہ سے بے نیاز سوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

لرزتی پلکیں، سرخ صبیح چہرہ، اور گلابی متورم ہونٹ۔۔۔ رخسار پر رونے کی وجہ سے آنسوؤں کی لکیریں تھیں۔ جیسے وہ پوری رات نیند میں بھی روتی رہی ہوں۔

دل آویز دائیں کروٹ پر یوں لیٹی ہوئی تھی کہ اُس کے لمبے گیسو جیسے چمکدار بال تکیہ سے پھسل کر بستر پر بکھر گئے تھے۔

میر آہل کے دل میں بے ساختہ اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھنسانے کی خواہش جاگی تھی۔ وہ صوفے سے اٹھا اور کھوئے ہوئے انداز میں چلتے ہوئے بستر کے سرہانے تک آکر رُک گیا۔

دل آویز کی کروٹ اس کی جانب تھی۔ اتنے نزدیک سے اس کا نازک سراپہ مزید دلکش اور خوبصورت لگ رہا تھا۔ وہ دل آویز پر جُھکا تو ایک مسحور کن سی خوشبو اس کے دل و دماغ کو تقویت دینے لگی ابھی اس کا ہاتھ ہوا میں ہی تھا کہ دروازے پر کسی نے آہستہ سے دستک دی۔

میر آہل کا فسوں ٹوٹا اور دل آویز کی نیند بھی۔۔۔ میر آہل کا دل آویز کے بالوں کو چھوتا ہاتھ رکا اور رُخ سائیڈ ٹیبل پر رکھی گھڑی کی جانب مُڑ گیا۔ دل آویز کو کچھ سمجھ آتا اس سے پہلے ہی وہ خود کو سنبھال چکا تھا۔ میر آہل کو اپنے سر پر کھڑا دیکھ کر دل آویز ٹھٹکی پاس رکھا ڈوپٹہ اٹھایا اور فوراً سے پیشتر اپنا حلیہ درست کرتے ہوئے بستر سے اُتر گئی۔

"اندر آجائے" میر آہل ہوں ہی بلاوجہ ہاتھ میں پکڑی گھڑی سے الجھتے ہوئے بلند آواز میں بولا۔

"چھوٹے میر آپکو اور دل آویز بی بی کو میر صاحب ناشتے پر بلا رہے ہیں" ملازمہ دروازے پر کھڑی کہہ رہی تھی۔

"ان سے کہہ دیجئے کہ ہم تھوڑی دیر میں آتے ہیں" میر آہل نے گھڑی کے شیشے پر انگھوٹا پھیرتے ہوئے کہا اور ایک نظر پلٹ کر دل آویز کو دیکھا وہ سہمی سہمی سی الماری کے پاس ڈوپٹے کے پلّو کو مروڑ رہی تھی۔

"اونہوں۔۔۔! اکیسوی صدی۔۔ میں بھی کوئی اس طرح سے پلّو مروڑتا ہے؟" میر آہل نے اندر ہی اندر سوچتے ہوئے آنکھیں سکوڑ کر اُسے دیکھا۔

اس نے گھڑی آہستگی سے واپس اپنی جگہ پر رکھی اور رسان سے چلتا ہوا الماری کے پاس آیا۔ دل آویز کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہہ گیا۔ دل میں بہت سے خدشات ابھرے اور پھر میر آہل کی سنجیدہ سی آواز سماعتوں سے الجھی۔

"مجھے کپڑے نکال نے ہیں" وہ سنجیدہ چہرہ لئے سینے پر ہاتھ باندھے تند مزاجی سے اس کی گھبراہٹ کو محسوس کرتے ہوئے بولا

"ہاں ک۔۔ کیا؟" دل آویز تذبذب کا شکار ہوئی۔

"آپ اونچا سنتی ہیں؟" وہ سابقہ انداز میں کہتے ہوئے دو قدم مزید آگے آیا۔

"ج۔۔۔جی۔۔ن۔۔نہیں" وہ رستہ چھوڑتے ہوئے شرمندگی سے منمنائی۔

یہ شخص بہت عجیب ہے۔۔۔۔بہت ہی عجیب۔۔۔دل آویز نے اتنی دھیمی آواز میں کہا کہ اُسے خود بھی سنائی نہیں دیا مگر میر آہل کے کپڑے نکالتے ہاتھ ٹھٹکے اُس نے گردن ترچھی کر کے تھوڑے فاصلے پر کھڑی دل آویز کو دیکھا۔

"آپ نے کچھ فرمایا؟" وہ سراپا سوال بن گیا۔

"اور اس شخص کے کان بھی بہت تیز ہیں" اب کی بار اس نے سرگوشی کرنے سے بھی اجتناب کیا تھا۔

"آپ پھر کچھ بولیں؟" میر آہل ہنوز بولا

"ہمم۔۔۔دماغ بھی تیز ہے" وہ دل ہی دل میں کہتے محض لب کاٹتی رہ گئی۔

☆...☆...☆

حویلی میں خاموشی کا پہرہ تھا۔بی جان کو گزرے ابھی ایک رات ہی گزری تھی۔ملازم ایک ایک کر کے ناشتے کے لوازمات ڈائننگ ٹیبل پر رکھ رہے تھے۔میر خلیل ٹیبل پر دونوں ہاتھ باہم پھنسائے سامنے رکھی تشتری کو گھور رہے تھے۔

بائیں جانب زلیخا بیٹھی تھی۔صبر کے گھونٹ پیتی کبھی دیوار پر لگی گھڑی تو کبھی پاس بیٹھے میر خلیل کے سپاٹ چہرے کو دیکھتی۔

ایک آتش فشاں تھا جس میں وہ جل بُھن رہی تھی۔لاکھ کوششوں کے باوجود بھی وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

ہاں آپ نے بلکل صحیح سنا ہے۔آپ چاہ بھی نہیں سکتے اگر وہ نہ چاہے تو۔۔۔اور کوششیں اگر نیک کاموں کے لئے کی جائے تو کامیاب ہو بھی جاتی ہیں اور جس کا نگہبان اللہ ہو تو اس شخص کے اردگرد موجود ہوا بھی اس کی حفاظت کرتی ہے۔

"ریما نیچے ناشتے کے لئے کیوں نہیں آئی" میر خلیل نے خاموشی چاک کی۔

"و۔۔وہ بیمار ہے کچھ بخار تھا" وہ پانی کا گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے بولیں۔

"کیا۔۔؟ میری بیٹی بیمار ہے اور آپ مجھے اب بتا رہی ہیں؟ کیا ہوا ہے میری بچی کو" وہ پریشانی سے ٹیبل چھوڑ کر اٹھنے لگے تب میر آہل اور دل آویز ڈائننگ روم میں ساتھ ساتھ داخل ہوئے۔

زلیخا نے کینہ توز نظروں سے دونوں کو باری باری دیکھا میر خلیل اٹھتے اٹھتے رک گئے۔

"گھبرانے کی بات نہیں ہے میں نے دوا دے دی ہے شاید بی جان کے انتقال کا غم لے لیا ہے" وہ دوبارہ اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے بولیں تو میر خلیل بادل ناخواستہ دوبارہ بیٹھ گئے۔

ناشتہ سوگوار ماحول میں کھایا گیا۔ بھوک تو کسی کو بھی نہیں تھی۔ مگر سانس لینے کے لئے چند لقمے حلق سے اتارنا لازمی تھے۔

میر آہل نے بمشکل دو تین نوالے حلق سے اتارے اور کھانے کی ٹیبل سے اٹھنے لگا۔ جب میر خلیل نے ہاتھ جھلا کر اُسے دوبارہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ نیپکن سے ہونٹوں کے کنارے صاف کرتا دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آہل بیٹا دل آویز کے کاغذات مکمل ہو گئے ہیں مگر کل کی ٹکٹ نہیں مل سکی۔۔۔ ایک ہفتہ بعد کی ٹکٹ ملی ہے۔" وہ اُبلے ہوئے انڈے کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے بولے۔

"ہمم۔۔۔ کوئی مسئلہ نہیں چاچو۔۔۔ دل آویز" رک کر پہلو میں بیٹھی آسمانی رنگ کی شلوار قمیض میں ملبوس نازک سے سراپے کو دیکھا.... "میری امانت ہے اور مجھے امید ہے کہ میری امانت کو آپ سنبھال کر رکھے گے" میر آہل نے سامنے بیٹھی زلیخا کو اتنے ٹھنڈے انداز سے دیکھتے ہوئے کہا کہ پانی کے گھونٹ بھرتی زلیخا کا حلق پھر سے سوکھ گیا۔ کڑواہٹ اندر تک پھیل گئی۔

انہوں نے تکلیف سے پہلو بدلا اور دل آویز کا کپ میں چائے ڈالنے والا ہاتھ بھی ساکن رہ گیا۔

اس نے بہت مشکل سے چائے کا کپ اٹھا کر میر آہل کے سامنے رکھا اور نمکین پانی سے بھرتی آنکھوں کو اٹھا کر میر آہل کو ایسے دیکھا جیسے دنیا کی ہر شے اپنی ترتیب سے ہٹ گئی ہوں۔

میر آہل نے اس کی نظروں کی تپش اندر تک محسوس کی تھی۔ صرف وہی تھا اس لمحے جو دل آویز کی نظروں کا ارتکاز سمجھ سکتا تھا۔ ان آنکھوں میں مقناطیسیت سی کشش تھی۔

اور برسوں خود میں جلتی سسکتی آگ کی تپش بھی اُسے اپنا آپ بہت وزنی محسوس ہوا۔ جیسے کسی اور کا بوجھ بھی اپنے ہی کندھوں پر اٹھالیا ہو مگر نا چاہتے ہوئے بھی وہ بوجھ غیر آرام دہ نہیں لگا تھا۔ اس میں اپنائیت تھی، ایک عجیب کھچاؤ تھا۔

وہ اٹھا۔۔۔ نیپکن کو آہستگی سے فولڈ کیا۔۔۔ کرسی کو کندھوں سے پکڑ کر آگے کو کھسکایا اور ایک آخری نگاہ دل آویز کی لرزتی پلکوں پر ڈالی۔

☆...☆...☆

دل آویز نے خود کو اتنا مضبوط پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ ایک ایسا مرد جس کی زندگی میں وہ کسی انچاہی چیز کی طرح داخل کی گئی تھی۔ اس شخص کا ساتھ دل آویز کو اتنے تحافظ کا احساس دے گا۔ اس نے یہ کبھی بھی نہیں سوچا تھا۔

وہ بی جان کے بستر پر پاؤں سمیت کر ان کے تکیئے کو بانہوں میں بھینچے سوچ رہی تھی۔

(توں جانتی ہے تجھ میں اور میر آہل میں مشترکہ کیا ہے؟ تم دونوں کی رگوں میں بہتا خون) ایک نرم سی آواز نے دل آویز کو اپنی جانب راغب کیا تھا۔ وہ آواز دل آویز کروڑوں میں بھی پہچان سکتی تھی۔

(یہ خون بڑی بڑی دیواریں گرا دیتا ہے بڑے بڑے پہاڑ اور چٹانوں سے ٹکرانے کی طاقت ہوتی ہے اس میں) چند دن پہلے اسی بستر پر بیٹھ کر بی جان نے اُسے کہا تھا۔ آج وہ نہیں تھیں مگر ان کی باتیں بلکل درست ثابت ہو رہی تھیں۔

(وہ کبھی تجھ پر آنچ نہیں آنے دیگا) بی جان سامنے بیٹھی محبت سے دل آویز کو بول رہی تھیں اور دل آویز بھیگی آنکھوں سے مسکراتے ہوئے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

جن کو آپ سے محبت ہو وہ کبھی آپ کو تنہا نہیں چھوڑتے۔۔۔ مرنے کے بعد بھی۔۔۔ دل آویز ان کے احساس کو محسوس کر سکتی تھی۔ اُن کا لمس آج بھی اُس کے آنسوؤں سے تر رخساروں پر موجود تھا۔

وہ دعاؤں اور محبت سے لبریز آنکھیں اور چاشنی جیسا لہجہ۔۔۔وہ چاہ کر بھی خود کو رونے سے روک نہیں پائی۔

☆...☆...☆

کمرے کی حالت ابتر تھی۔ سیاہ رنگ کی ہائی ہیلز بے ترتیب انداز میں کاؤچ کے پاس پڑے تھے۔ بستر کی چادر پر سلوٹیں تھیں اور کمرے میں بہت سی کانچ کی بوتلیں کاؤچ کے ارد گرد گری ہوئی تھیں۔ کمرے کی فضا میں اے-سی کی ٹھنڈک کے ساتھ ساتھ سگریٹ کی بُو بھی پھیلی ہوئی تھی۔ سینٹر ٹیبل پر رکھا ایش ٹرے بھرا ہوا تھا اور چند بُجھے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑے ٹیبل پر پڑے ہوئے تھے۔ سامنے دیوار پر پچاس انچ کا ایل-ای-ڈی نصب تھا۔ جس پر صرف ایک ہی شخص کی تصویریں سلائیڈ شو کی صورت رقص کر رہی تھیں۔

اینا اورنگزیب کاؤچ پر غیر آرام دہ انداز میں ٹیک لگائے دونوں پیروں کو کینچی کی صورت سامنے رکھے ٹیبل پر پھیلائے بیٹھی تھی۔ ایک ہاتھ میں ریڈ وائن کا گلاس تھامے وہ مسلسل ٹی وی پر اُبھرنے والے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ سرخ صبیح چہرے پر اداسی تھی۔ آنکھوں کا کاجل پھیلا ہوا تھا۔ جیسے وہ وقفے وقفے سے روئی ہو۔ ناک اور آنکھیں ریڈ وائین کی طرح سرخ لال ہو گئی تھیں۔ اس نے پاس پڑے موبائل پر چند ہندسے دبائے اور فون کو لاؤڈ اسپیکر پر ڈالا

(The number you have dialed is currently unavailable. Please try later)

ایک مشینی آواز کمرے میں گونجی۔ اُس نے طیش میں آکر موبائل کو کھینچ کر زمین پر پھینکا۔ زمین پر گرتے ہی موبائل تین حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اینا نے لال مائع اپنے حلق میں انڈیلا بہ مشکل خود کو گھسیٹتے ہوئے اس نے سینٹر ٹیبل پر رکھے ریموٹ کو اٹھایا اور ریموٹ کا رخ ایل-ای-ڈی کی جانب کرتے ہوئے اسکرین پر چلتے سلائیڈ شو کو پوز کیا۔

اینا لڑکھڑاتے ہوئے کاؤچ کی ہتی کا سہارا لیتے ہوئے اٹھی اور دیوار پر لگی ایل-ای-ڈی کے نزدیک جا کر کھڑی ہو گئی۔

آنکھوں میں عجیب ساخمار لئے وہ اسکرین پر نظر آتی میر آہل کی تصویر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔اس تصویر میں میر آہل نے سیاہ رنگ کا فارمل سوٹ پہن رکھا تھا۔ہاتھوں کو جیب میں مقید کئے، آنکھوں پر سیاہ چشمے ٹکائے وہ ایک جاذب نظر شخصیت لگ رہا تھا۔

"تم میر آہل۔۔۔تم صرف میرے ہو"

اینا اورنگزیب مغرور انداز میں ایل-ای-ڈی کی اسکرین پر انگشت شہادت رکھتے ہوئے نشے میں دھت بلند آواز میں بڑبڑائی۔

"تم میرے سوا کسی کہ نہیں ہو سکتے اور اگر ہمارے درمیان کوئی بھی آیا"

رک کر لبوں کو اسکرین سے لگایا اور دھیمے انداز میں مسکرائی

"تو اینا اورنگزیب اُسے فنا رسید کر دے گی"

اگلے ہی پل اینا اورنگزیب کی مسکراہٹ تلخ ہو گئی وہ اسکرین سے سر ٹکا کر تصویر کو دیکھتی چلی گئی۔

☆...☆...☆

آج شام میر آہل کی انگلینڈ واپسی تھی اور ایک ہفتے بعد دل آویز نے بھی انگلینڈ میر آہل کے پاس چلے جانا تھا۔ سب سہی تھا۔بی جان کی کمی اپنی جگہ مگر درمیان میں حائل یہ ایک ہفتہ بس یہ ایک ہفتہ بہت مشکل تھا۔

وہ باہر باغیچے میں ہلکی دھوپ میں ٹہل رہی تھی۔گھر آئے مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے تھے۔ حویلی بلکل خالی ہو گئی تھی۔گنتی کے چند ملازم اور گھر والے بس۔

"کیا بات ہے شادی کے بعد تو تمہارا حسن مزید نکھر گیا ہے" دل آویز کو تنہا دیکھ کر کریم نا جانے کدھر سے ٹپک گیا تھا۔

کچھ لوگ بہت ڈھیٹ ہوتے ہیں جتنا بھی ذلیل کر لو بعض نہیں آتے۔۔۔دل آویز نے دل ہی دل میں تبصرہ کیا۔وہ کم از کم آج کے دن اس کی کسی بھی بکواس کو سننا نہیں چاہتی تھی۔

وہ کریم کی جانب پشت کئے پھولوں کی کیاری کو دیکھتی رہی۔

"تمہارا آہل تو جا رہا ہے آج اب ایک ہفتہ تنہا یہاں کیا کرو گی تم؟" وہ دل آویز کے کان کے پاس جھک کر بولا تو دل آویز غصے سے ایڑیوں کے بل گھومی مگر اسکا غصہ منٹو میں اُڑن چھو ہو گیا۔

میر آہل ڈھاڑتے ہوئے کمیز کے آستین چڑھاتا ہوا اچیل کی کریم پر جھپٹا۔ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ کریم کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملا۔ دل آویز سہم کر دو قدم پیچھے ہوئی۔

"ہمت کیسے ہوئی میری بیوی کے نزدیک جانے کی" میر آہل بھوکے شیر کی طرح ڈھاڑ رہا تھا۔

آہل نے کریم کو گُدی سے پکڑ کے اس کے چہرے کو زمین کے قریب لے گیا۔ ملازم ہکا بکا کھڑے یہ منظر دیکھتے رہہ گئے۔ ان میں سے ایک ملازم حویلی کی جانب بھاگا شاید میر خلیل کو صورت حال سے آگاہ کرنے۔

"دل آویز میری بیوی ہے، میری عزت اور میر آہل اپنی عزت پر آنچ نہیں آنے دیتا" میر آہل کریم کے کان کے پاس جھک کر ایسے غرا رہا تھا۔

(اگر میں بی جان کی جگہ ہوتا تو اس کے جسم کی ایک بھی ہڈی سلامت نہیں چھوڑتا)

میر آہل کی خون رنگ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دل آویز کو یہ الفاظ یاد آئے تھے۔

آہل نے کریم کے پیٹ میں گھٹنے سے ضرب لگائی۔ کریم کراہنے لگا مگر میر آہل نے اُسے گدی سے دبوچ رکھا تھا۔

"آہل بھائی معاف کر دیں غلطی ہو گئی آئندہ ایسے...." کریم ملتجیانہ انداز میں بولا مگر آہل نے بنا کچھ سُنے اس کا منہ فوارے سے گرتے پانی میں دھکیل دیا۔

کریم مچھلی کی طرح پھڑ پھڑانے لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ فوارارے کے درمیانے قد کی دیوار پر جمے تھے۔ وہ مسلسل مزاحمت کرنے میں ناکام ہو رہا تھا۔

"پلیز آہل کریم بھائی مر جائے گے انہیں چھوڑ دیں" دل آویز کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھرنے لگی آواز کانپنے لگی وہ سہمی ڈری سی میر آہل سے التجا کر رہی تھی۔

زلیخا چچی اور میر خلیل بھی ملازم کے خبر کرنے پر ننگے پاؤں باہر بھاگے تھے اور باغیچے کا منظر دیکھ کر ان کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔

میر آہل نے غصے سے لال ہوتی آنکھیں دل آویز کے سرخ صبیح چہرے پر مرکوز کر لیں اور دیکھتے ہی دیکھتے آس پاس کا منظر بدلتا چلا گیا۔

کریم کی گُدی پر میر آہل کی گرفت اب بھی مضبوط تھی۔ مگر اُسے لگا کہ وہ کبھی اپنی نظریں سامنے کھڑی روتی بلکتی لڑکی کے چہرے سے ہٹا نہیں پائے گا۔

اردگرد ملازم، میر خلیل اور زلیخا چچی کی التجاؤں کی آوازیں سماعتوں میں اترنے سے پہلے ہی راستے میں غرق ہو گئیں۔ منظر میں حائل ہر شہہ دھندلی ہو گئی تھی۔ کچھ واضح تھا تو صرف دل آویز کا معصوم چہرہ، دل آویز کی التجاء کرتی آواز۔۔۔ اور یکدم میر آہل نے کریم کی گُدی کو جھٹکے سے چھوڑا۔

ہر شہہ نارمل ہو کر اپنی جگہ پر آ گئی۔ میر آہل نے چہرے پر پڑی پانی کی چھینٹوں کو ہاتھ کی پُشت سے صاف کیا۔

کریم ہانپتا ہوا لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے زمین پر جا گرا۔۔ زلیخا فوراً کریم کی جانب لپکی اور زمین پر پنجوں کے بل بیٹھی اور کریم کے گیلے چہرے کو اپنے آنچل سے تھپتھپانے لگی۔

"ابھی کل تک تو اس منحوس ماری سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا تُوں اور اب ایک دن میں ایسا کیا ہو گیا ہے کہ تو مرنے مارنے پر آ گیا ہے" ایک آتش فشاں تھا زلیخا کے اندر جو اب پھٹا تھا۔

"زبان سنبھال کر بات کیجئے میں دل آویز کے لئے ایسے الفاظ ہرگز برداشت نہیں کروں گا" میر آہل نے برفیلے لہجے میں خبردار کیا۔

"اچھا۔۔ اگر زبان نہ سنبھالی تو کیا کریگا تُوں۔۔ مجھے بھی جان سے مار دیگا" زلیخا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا۔ وہ مزید ضبط سے کام نہیں لے سکتی تھی۔

"زلیخا خاموش ہو جاؤں" میر خلیل نے ہاتھ کے اشارے سے زلیخا کو ٹوکا۔

"آپ اب بھی اس کی طرفداری کر رہے ہیں" زلیخا کے اعصاب بھاری ہوئے۔ اس سے مزید برداشت کرنا ناممکن سا لگ رہا تھا۔

"جب اپنا ہی سکہ کھوٹا نکلے تو دوسروں سے کیا گلہ کرنا" میر خلیل نے دونوں ہاتھ پشت پر باندھتے ہوئے کہا۔

"کریم کو مجھ سمیت بی جان نے بھی خبردار کیا تھا مگر وہ بعض نہیں آیا۔ آہل نے جو کیا بلکل ٹھیک کیا" میر خلیل کی بات پر آہل نے چونک کر ان کے تکان زدہ چہرے کو دیکھا۔

"میں مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا بی جان کو گزرے ابھی دو دن بھی ٹھیک سے نہیں ہوئے ہیں۔ اس حویلی میں اب مزید کوئی تماشا میں برداشت نہیں کر سکتا۔" تامل سے کہتے ہوئے وہ لان عبور کر کے پورچ میں کھڑی اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گئے۔

ان کے ایک اشارے پر ڈرائیور بھاگتے ہوئے آیا اور پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ شاید میر خلیل کھلی فضا میں سانس لینا چاہتے تھے۔ حویلی کی اداسی اور بدمزگی سے دور۔

میر خلیل کی گاڑی فراٹے مارتے ہوئے حویلی کے گیٹ سے باہر نکلی۔ زلیخا نے کریم کا بازوں پکڑتے ہوئے ایک زہر آلود نگاہ دل آویز کے سراپے پر ڈالی۔

"کاش بی جان کو مارنے کے بجائے۔ اس منحوس ماری کو مار دیا ہوتا" اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ دل آویز کو کھڑے کھڑے موت کی وادیوں میں پہنچادے۔

میر آہل اندر جانے لگا جب اس نے زلیخا چچی کی نظروں کو دیکھا وہ دل آویز کو قہر برسانے والی نظروں سے گھور رہی تھی۔ ناجانے کیوں وہ جاتے جاتے رُکا اور دل آویز کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔

دل آویز کی سانسیں ساکن ہوئی۔ وہ بلکل بھی اس چیز کی توقع نہیں کر سکتی تھی۔ اس سمیت زلیخا اور کریم بھی میر آہل کی اس حرکت پر ہکّا بکّا رہ گئے۔

کسی کا خیال کرنا محبت کرنے سے زیادہ پیارا عمل ہے اور محبت کی منزل تک جانے والی سیڑھیوں میں سب سے پہلی سیڑھی خیال اور پرواہ کی ہے۔

اور میر آہل اس سیڑھی پر اپنے قدم رکھ چکا تھا۔

محبت جادو نہیں جس کے لئے عمل کرنا پڑے، محبت ہنر بھی نہیں جِسے سیکھنا پڑھے۔ یہ جنون ہے جو اپنا سر پھرا خود چُنتا ہے۔ یہ سکون ہے جو کسی کسی کو ملتا ہے۔ یہ آگ ہے، جس آگ میں محض ایک عاشق جلتا ہے۔

دل آویز روئی کے بادل کی طرح کھنچتی چلی گئی۔ میر آہل اس سے ایک قدم آگے تھا۔ کسی مضبوط دیوار کی طرح میر آہل نے اُسے اپنی اوٹ میں چُھپا لیا تھا۔ دل آویز کا ہاتھ اُس کی گرفت میں تھا۔ یہ احساس دنیا کے باقی تمام احساسات پر حاوی تھا۔

وہ اس کے قدم پر قدم رکھتی اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔

میر آہل کے ماتھے پر شکنوں کا جال بچھا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ اب بھی سرخی لئے ہوئے تھا۔ کمیز کے آستین کہنی سے ذرا نیچے تک فولڈ تھے۔ ہاتھ کی نسیں باقاعدہ دکھائی دے رہی تھیں۔

اُس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور دل آویز کو اتنی زور سے اندر دھکیلا کہ لمحے بھر کے لئے اُسے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ دروازہ مقفل کر کے وہ غصے سے ایڑیوں کے بل گھوما۔۔ دل آویز نے بہ مشکل خود کو سنبھالا تھا۔ میر آہل غصے سے فاصلہ طے کرتا اس کے نزدیک آیا۔۔ اور وہ سمٹتے ہوئے پیچھے دیوار سے جا لگی۔

"کیا ضرورت تھی تمہیں حویلی سے باہر قدم رکھنے کی تمہیں معلوم ہے نہ کے کریم باہر لان میں ہی پڑا رہتا ہے" وہ دبی دبی آواز میں چیخا۔

دل آویز اُسے خطا اوسانوں کے ساتھ دیکھتی رہ گئی۔

"م۔۔ میں وہ" وہ ہچکچائی۔

"خاموش" اس نے دل آویز کو بازوؤں سے بھینچ لیا۔

دل آویز کے لبوں سے سسکی نکلی مگر دل میر آہل کے نام کی سرگم پر رقص کر رہا تھا۔

"میری آج انگلینڈ کی فلائٹ ہے تمہیں اندازہ ہے تمہیں یہاں تنہا چھوڑ کر جانا کتنا بڑا رسک ہے" وہ تند مزاجی سے اسے دیکھتے ہوئے خفگی سے بول رہا تھا۔

"رسک؟؟ میں اتنا عرصہ یہاں تنہا ہی رہ رہی تھی پھر رسک کیسا" دل آویز نے دل ہی دل میں کہا۔ لب تو جیسے حرکت کرنا بھول گئے تھے۔

"زلیخا چچی اور کریم کی موجودگی میں۔۔۔ تمہیں احتیاط کرنی چاہئے" وہ ہنوز سابقہ انداز میں بول رہا تھا۔

"زلیخا چچی اور کریم بھائی تو پہلے بھی تھے" اور دل آویز آنکھوں میں نمی سمیٹے اسے سنتے سنتے بنا آواز کے کہہ رہی تھی۔

"اوہ اچھا پہلے۔۔۔ میر آہل نہیں تھا۔" وہ بھیگی آنکھوں سے مسکرائی۔

"میرے بہت سے کام ہیں۔ جس کی وجہ سے میں رُک نہیں سکتا مگر میں نے دو دن بعد کی ٹکٹ بُک کروالی ہے۔ اب تمہیں ایک ہفتہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا" اس کی گرفت دل آویز کے بازوؤں پر ڈھیلی پڑ گئی۔ پہلے کی بانسبت لہجہ بھی دھیما ہو گیا تھا۔

وہ اہم تھی اس کی پرواہ کرنے والا بھی کوئی تھا۔ اب کوئی تھا جو اسے تحافظ فراہم کر سکتا تھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندھیرے سے اجالے میں لا سکتا تھا۔ سرما کی دھوپ میں اس کے سر پر سائے کی طرح بکھر سکتا تھا۔

"کیا آپ مجھے بی جان کی قبر پر لے جا سکتے ہیں جانے سے پہلے" وہ اچانک بولی۔۔۔ میر آہل نے چونک کر اُسے دیکھا۔ وہ کیا بات کر رہا تھا اور دل آویز کیا بول رہی تھی۔

"آ۔۔۔ ام۔۔ ہاں" اُس نے ہامی بھر لی

"عجیب لڑکی ہے یہ مطلب میں جو بکواس کر رہا تھا اس نے ایک لفظ نہیں سُنا۔۔۔ سیریسلی؟" وہ خفا خفا سا خود سے کہنے لگا۔

☆...☆...☆

وہ مہندی لگے ہاتھوں کو دعا کے انداز میں جوڑے ایک نئی قبر کے سامنے کھڑی تھی۔ جس پر بکھرے پھولوں کی مہک چارسُو پھیلی ہوئی تھی۔

"بی جان میں یہاں غم کے ہاتھوں مجبور ہو کر نہیں بلکہ آپ کے دیئے گئے تحفے پر مشکور ہو کر آئی ہوں" اس نے ہتھیلی پر بنے بیل بوٹوں کو دیکھتے ہوئے اندر ہی اندر کہا۔ میر آہل پیچھے کچھ فاصلے پر کھڑا کسرتی بازوؤں کو سینے پر لپیٹے دل آویز کی پُشت گھور رہا تھا۔

"میں آپ کا تحفہ اپنی آخری سانس تک سنبھال کر رکھوں گی" ایک آنسوں ٹوٹ کر اس کی ہتھیلی پر گرا۔

"آپ ٹھیک کہتی تھیں بی جان ہمارا خون ایک ہے اور خون کا رنگ کبھی بدل نہیں سکتا" اس نے گہری سانس لے کر آنکھیں موند لیں۔

"آہ۔۔۔" میر آہل نے گردن اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا تھا گھنی روشنی میں اُسے یوں محسوس ہوا جیسے رات ہو گئی ہے۔ دو دن پُرانی رات کا منظر آنکھوں کی پتلیوں پر چلنے لگا۔

("آہل پُتر مجھے تجھ سے کچھ بات کرنی ہے" بی جان نے آہل کے کندھے تھامتے ہوئے کہا

"جی بی جان حکم کیجئے" میر آہل کے لہجے میں بلا کا مان تھا۔ جیسے اس لمحے اگر بی جان اُسے اپنا دل نکال کر اُنکے قدموں میں رکھنے کے لئے کہتیں تو شاید میر آہل بلا توقف کہ وہ بھی کر دیتا۔

"پُتر دل آویز۔۔۔" وہ رُکی آنکھیں زور سے مینچ کر کھولیں تو ان میں نمکین پانی بھرا تھا۔

"دل آویز تنہا ہے پُتر کہنے کو سب اپنے ہیں مگر۔۔۔" کرب سے ان کے الفاظ ٹوٹنے لگے۔

میر آہل نے اُنہیں سہارا دیتے ہوئے بستر پر بٹھایا اور خود زمین پر بیٹھ کر سر انکی گود میں رکھ لیا۔

رات قطرہ قطرہ پگھل رہی تھی۔

وہ رات کوئی عام رات نہیں تھی۔ اس رات آسمان پر تمام ستارے چاند کے گرد جمع ہو کر سوگ منا رہے تھے کیونکہ وہ رات انکشاف کی رات تھی۔ برسات کی رات تھی۔ طوفان کی رات تھی۔

اُس بند دروازے کے پار کسی کو نہیں معلوم تھا کہ بی جان اور میر آہل کے درمیان کیا گفتگو ہوئی کیونکہ دیواروں نے بھی اُس پہر اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے تھے۔ کچھ راز ایسے ہوتے ہیں کہ جب وہ کھلتے ہیں تو قیامت آجاتی ہے اور اُس رات قیامت آگئی تھی۔)

سورج سوا نیزے پر تھا لیکن میر آہل کو لگا وہ بھیگ گیا ہے۔

واپسی کا تمام رستہ خاموشی میں کٹ گیا۔ گاڑی گاؤں کی پکی سڑک پر فراٹے مارتی رہی اور وہ گھڑی قریب آگئی جو سب سے مشکل اور تکلیف دہ تھی۔

جدائی کی گھڑی۔۔۔ میر آہل کی تیاری مکمل ہو گئی تھی حویلی کے باہر تمام گاڑیاں اور مکین میر آہل کے منتظر تھے۔ ملازم ایک ایک کر کے تمام سفری بیگز اٹھا کر گاڑی میں منتقل کر رہا تھا۔

جب وہ آیا تھا تو دل آویز کی جگہ کچھ اور تھی اب وہ جا رہا تھا تو اس کا مقام کچھ اور تھا۔

کچھ لوگ اچانک غیر متوقع طور پر آپ کی زندگی میں شامل ہوتے ہیں اور آپ کی زندگی کو از سر نو بدل دیتے ہیں۔

☆...☆...☆

میر آہل سیاہ رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھا۔ بالوں کو جیل کی مدد سے دائیں جانب ٹکا رکھے تھے۔ کلائی میں رولیکس گھڑی چمک رہی تھی۔ وہ جانے کے لئے بلکل تیار لگ رہا تھا۔ اس نے پرفیوم کا آخری پف گردن کے پاس چھڑک کر ایک نگاہ شیشے میں خود کو دیکھا تو نگاہیں نیلے رنگ کے پھول دار شلوار قمیض میں ملبوس خاموش سے نازک سراپے پر ٹھہر گئیں۔

وہ جا رہا تھا۔۔۔ ہاں تو کیا ہوا۔۔۔ وہ بھی تو دو دن بعد انگلینڈ آنے والی تھی۔

میر آہل نے گہری سانس لی اور دل آویز کی سانسیں رک گئی۔ اُس نے مڑ کر دل آویز کو دیکھا تو دل آویز نے نظریں مزید جھکا دیں۔

وقت نے دو بلکل ہی مختلف لوگوں کو ایک ساتھ ایک زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ایک میں چاند کی صفتیں تھی تو دوسرے میں سورج کی گرم جوشی۔

"اب کیا مجھے گُڈ بائے اسپیچ دینی ہو گی" اس نے کوٹ کا بٹن مقفل کرتے ہوئے سوچا۔

"اہمم" وہ آہستگی سے کھانسا جیسے کچھ کہنے سے پہلے تمہید باندھ رہا ہو۔

"اگر کسی بھی قسم کا مسئلہ ہو یا کوئی بھی ایمرجنسی ہو" کہتے ہوئے کوٹ کی پوکٹ سے ایک موبائل نکال کر دل آویز کی جانب بڑھایا "تو مجھے کبھی بھی کال کر سکتی ہو تم اس میں میرا اور میرے پی-اے مائیکل کا نمبر محفوظ ہے" اب وہ مکمل توجہ کے ساتھ دل آویز کو دیکھ رہا تھا۔

جو گُم سُم سی کھڑی اس ٹچ اسکرین موبائل کو گھور رہی تھی۔ وہ کچھ دیر دل آویز کو اس انتظار میں دیکھتا رہا کہ اب وہ اس کے ہاتھ سے موبائل تھام لے گی اور مشرقی بیویوں کی طرح اس سے کچھ کہے گی کوئی ایموشنل سی اسپیچ دیگی مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس کی خاموشی میر آہل کو زِچ کر رہی تھی۔

"مجھے آج کی تاریخ میں انگلینڈ واپس جانا ہے" لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا تو دل آویز نے فوراً سے موبائل تھام لیا۔ میر آہل نے خفگی سے سر جھٹکا اور سست روی سے قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔

جیسے اُسے امید تھی کہ دل آویز ابھی اُسے پیچھے سے پکارے گی۔ اُسے پیچھے سے پکار کر روک لے گی۔ اُسے روک کر اپنا خیال رکھنے کو کہے گی۔

وہ کمرے سے باہر نکل گیا مگر کسی نے اسے نہیں پکارا۔ وہ راہداری میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا سیڑھیوں کی جانب بڑھ رہا تھا۔

"سنئے"

ابھی اس نے قدم سیڑھی پر رکھا بھی نہیں تھا کہ ایک نسوانی آواز نے اُس کے قدم زنجیر کئے۔ وہ آہستگی سے گھوما، آنکھوں میں نرم سا احساس تھا۔ چہرے پر فتح کے تاثرات تھے۔ اس کا دل اپنی چاہت کی تکمیل پر مسکرایا تھا۔

لیکن اگلے ہی لمحے اُس کی مسکراہٹ کا پرچہ کٹا تھا۔۔۔

"موبائل کا پاسورڈ کیا ہے" آگے سے معصومیت بھرے انداز میں استفسار کیا گیا۔

میر آہل کا دل جو ابھی اپنی چاہت کی تکمیل پر شادیانے بجا رہا تھا جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ چہرہ یکدم سپاٹ ہوا اور ہونٹ سختی سے بھنچ گئے۔

"پاسورڈ۔۔۔؟" اس نے آئی بروز اچکاتے ہوئے اسے گھور کر دیکھا۔ جیسے وہ اُسے اپنا سوال تبدیل کرنے کا آخری موقع دے رہا ہو۔

"جی پاسورڈ" پر وہاں سے بلا کی معصومیت کا مظاہرہ کیا گیا۔

میر آہل کا دل کیا کے وہ اپنا سر دیوار سے دے مارے۔

"بی جان صرف آپکی وجہ سے میں یہ عورت برداشت کر رہا ہوں۔۔۔" اس نے اوپر دیکھتے ہوئے خفگی سے دانت پیسے۔

اس نے صبر کا گھونٹ پیتے ہوئے ایک گہری سانس ہونٹوں کے درمیان سے خارج کی اور تند مزاجی سے دل آویز کو دیکھتے ہوئے قریب آیا تو وہ ذرا پیچھے کھسکی مگر میر آہل بھی ڈھیٹ تھا۔ وہ پھر چند قدم سرعت سے طے کرتا اُس کے قریب آیا۔

دونوں کے درمیان فاصلہ بہت کم تھا۔ دل آویز کو اپنی سانس رُکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

میر آہل آہستگی سے اُس کے کانوں کی جانب جُھکا تھا۔ اس لمحے اُسے ایسا محسوس ہوا کہ گردشِ ایام تھم چکی ہے۔ صرف دل دھڑکنے کا شور تھا جو سنائی دیتا تھا۔

"دل آویز" اس نے مدھم سی سرگوشی کی۔

میر آہل کے پرفیوم کی خوشبو اس کی سانسیں الجھانے کے لئے کافی تھی۔ اس کی گرفت موبائل پر سخت ہوئی۔

وہ پیچھے ہوا اور ایک گہری نظر اِس ریت کی گڑیا پر ڈالی جو چھوتا تو دور محض پُکارنے سے ہی ڈھیر ہو جاتی۔

اور وہ میر آہل کو ایسی ڈری سہمی سی بہت بھا رہی تھی۔ اس نے دل آویز کو پکارنا مناسب نہیں سمجھا اور آہستگی سے واپس زینوں کی جانب مڑ گیا اور دل آویز پتھر کا مجسمہ بنی وہی کھڑی رہ گئی۔

☆...☆...☆

میر آہل حویلی سے باہر نکلا تو تمام ملازم اور میر خلیل اس کے منتظر تھے۔ زلیخا البتہ وہاں موجود نہیں تھی۔ کریم ایک کونے میں منہ چھپائے کھڑا تھا۔ اس کی صحیح درگت بنائی تھی آہل نے اب وہ دوبارہ ایسی غلطی کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا۔

وہ گاڑی کی جانب مڑا تو ایک عجیب سے احساس نے اس کے دل کو گھیرا۔۔۔ چیزیں اپنے مقام پر رہتی ہیں مگر لوگ چلے جاتے ہیں۔ یہ بی جان کی غیر موجودگی تھی۔ جس نے اس کے قدموں میں لرزش پیدا کی تھی۔ جِسے میر خلیل سمجھ گئے تھے۔

انہوں نے محبت واپنائیت سے میر آہل کے کندھے کو تھپتھپایا تھا۔ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے اس نے یوں ہی سر اٹھا کر اوپر دیکھا تھا۔ آج بھی اُسے کھڑکی پر ویسا ہی ہیولہ سا نظر آیا تھا۔ ایک نازک سا سراپا جو شاید اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

وہ مبہوت سا اوپر دیکھے گیا۔۔۔ اوپر بھی کچھ یہی حال تھا۔ یہاں ابھی عہد وپیما سے گزرنے کی قسمیں نہیں کھائی گئی تھیں۔ نہ ہی جذباتوں کا تبادلہ خیال ہوا تھا۔ مگر پھر بھی یوں محسوس ہوا جیسے دل کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر یہی رہ گیا ہو۔ یہاں سے جاتے ہوئے اُسے پہلی بار محسوس ہوا کہ پیچھے کچھ باقی رہ گیا ہے۔

بے چینی۔۔۔ محبت کی دوسری سیڑھی تھی۔ جس پر میر آہل نے دوسرا قدم رکھا تھا۔

اُس نے آنکھوں پر چشمہ ٹکایا اور کندھے اچکاتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گیا اور دل آویز پردے کی اوٹ میں اپنے محرم کو نظروں سے اوجھل ہو جانے تک دیکھتی رہی تھی۔

☆...☆...☆

وقت صرف ایک ہی صورت میں رُکتا ہے۔۔۔ تب جب محبوب نظروں سے اوجھل ہو، تب وقت رک جایا کرتا ہے۔

دل آویز کو بھی وقت رکا ہوا محسوس ہوا۔۔۔ دو دن دو صدیوں پر محیط ہو گئے۔ مگر اس کے برعکس میر آہل کو وقت کے گزرنے کا بلکل بھی احساس نہیں ہوا برمنگھم واپس آتے ہی کاموں کی ایک لمبی فہرست تھی جو اس کی منتظر تھی۔

ہاں کیونکہ میر آہل کو ابھی محبت نہیں ہوئی تھی۔ اُسے ابھی محبت کے جذبے سے روشناس ہونے کے لئے بہت سی منزلیں طے کرنی تھیں۔ ہر منزل کے اپنے قوانین تھے جسے میر آہل کو ہر صورت ماننے تھے۔

محبت جب کسی کو اپنی آغوش میں لیتی ہے تو سب سے پہلے اُس شخص سے تمام اختیارات چھین لیتی ہے۔ اُس کی ذات سے خود کی چاہ مِٹا کر اُس میں محبوب کی طلب بھر دیتی ہے۔

☆...☆...☆

وہ ڈری سہمی جہاز کی ونڈو سیٹ پر بیٹھی کھڑکی کے باہر آسمان کو روبرو دیکھ رہی تھی۔ جہاز بادلوں کی وادیوں میں تھا۔ اس نے ایک نظر کھڑکی سے باہر تیرتے بے خوف بادلوں کو دیکھا اور پھر فوراً آنکھ بند کرلیں اور جلدی جلدی آیت الکرسی کا ورد کرنے لگی۔

وہ زندگی میں پہلی بار ہوائی جہاز میں بیٹھی تھی۔ میر خلیل اُسے ائیر پورٹ تک چھوڑنے آئے تھے۔ تمام رستے وہ دل آویز کو مختلف باتوں پر نصیحت کرتے رہے تھے۔

ان کے لہجے سے صاف عیاں تھا کہ وہ دل آویز کے اس طرح تنہا پرائے ملک جانے سے مطمئن نہیں ہیں۔ مگر کوئی دوسرا چارا بھی نہیں تھا۔ وہاں اس کا شوہر تھا۔ جو دل آویز کو بطور امانت میر خلیل کے پاس رکھوا کر گیا تھا۔

"اہم۔۔اہم" کسی نے پاس سے گلہ کھنکارا تو اس نے جھٹ سے آنکھیں کھولیں۔ ایک تیس سے پینتیس سال کا درمیانے قد کاٹھ کا شخص اس کے برابر میں براجمان تھا۔ جس کی آنکھیں نیلے سمندر کی متشابہ تھیں۔ سنہرے بال ایک انچ میں کٹے ہوئے تھے۔ خاکی رنگ کی ڈریس پینٹ کے اوپر ہلکے نیلے رنگ کی شرٹ پہنے وہ شخص کافی نفیس دکھائی دیتا تھا۔

"آپ پہلی بار ہوائی جہاز میں بیٹھی ہیں" وہ انگریزی لبوں لہجے میں دوستانہ انداز میں گویا ہوا۔ جواباً دل آویز اثبات میں سر ہلاتی رہ گئی۔

اس شخص کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ دل آویز سے بات کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے مگر دل آویز کے انداز نے اُسے بلکل بھی ہمت نہیں دی کہ مزید کچھ پوچھتا۔ وہ شخص بس گاہے بگاہے دل آویز پر ایک نگاہ ڈال لیتا اور اُسے بچوں کی طرح ڈرتے سہمتے دیکھ منہ ہی منہ میں مسکرا دیتا۔

اُسے دل آویز کی معصومیت دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ بھلا آج کے زمانے میں بھی کوئی اس قدر معصوم ہو سکتا تھا۔۔۔ دل آویز کی لرزتی پلکیں، کپکپاتے ہونٹ اور سر سے لے کر پاؤں تک ڈھکا ہوا سراپا اُسے ہر لحاظ سے مکمل اور پر کشش بناتا تھا۔ پچھلے دو دن کے بانسبت یہ آٹھ گھنٹے کا سفر تیزی سے گزر گیا تھا اور انگلینڈ کا خوبصورت شہر برمنگھم اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ وہ مطلوبہ کاؤنٹر سے اپنا سامان ٹرالی میں گھسیٹتی ہوئی شیشے کے آٹو میٹک دروازے طائرانہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

ائیر پورٹ پر بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی تھی۔ الگ الگ تہذیب و تمدن کے لوگ اپنے پیاروں کو ریسیو کرنے آئے ہوئے تھے۔ وہ ٹرالی گھسیٹتے ہوئے مزید قریب آئی۔۔۔ مگر وہاں نا میر آہل تھا اور نا ہی اس کا کوئی ملازم۔

"چاچو نے تو کہا تھا کہ میری فلائٹ لینڈ ہونے سے پہلے ہی آہل مجھے لینے ائیر پورٹ آجائے گے" وہ فکر مندی سے گردن دائے سے بائے ہلاتی متلاشی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"ہیلو مس" ایک سُنی سُنی سی آواز اس اپنے پشت سے ابھرتی سنائی دی۔

وہ پلٹی تو دیکھا یہ وہی شخص تھا جو فلائٹ میں اس کی برابر والی نشست پر براجمان تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اُسی سے مخاطب تھا۔

"جی" اس نے لئے دیئے انداز میں جواب دیا۔

"آپ لگتا ہے پہلی بار انگلینڈ آئی ہیں۔۔۔ اگر آپ چاہے تو میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں" اس نے فوراً ہی مدد کی پیشکش کی

"جان نا پہچان تو میرا مہمان۔۔۔" دل آویز نے دل ہی دل میں سوچتے ہوئے۔ اُسے اوپر سے لیکر نیچے تک جانچتی نظروں سے دیکھا۔

"نہیں نہیں پلیز مجھے غلط مت سمجھیں میرا آپ سے فلرٹ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ تو بس آپ مجھے معصوم سی لگیں تو سوچا مدد کی پیشکش کر دوں" وہ کھلے دل سے مسکراتے ہوئے وضاحت دینے لگا۔

"نہیں بہت شکریہ میرے ہسبنڈ مجھے لینے آنے والے ہیں" اس نے ہوا کے باعث سر سے پھسلتے ڈوپٹے کو پیشانی سے آگے کرتے ہوئے پورے اعتماد سے کہا۔

یہ جملہ کہنے کی دیر تھی کہ سامنے والے شخص کا کھل کھلاتا چہرہ بجھ گیا۔

"اوہ۔۔۔ تو آپ شادی شدہ ہیں" لہجے میں افسردگی کا عنصر نمایاں تھا۔

"My bad" اس نے سر کو نفی میں سرسری انداز میں ہلایا

"خیر یہ میرا کارڈ ہے۔۔۔ آپ کو کبھی بھی اس شہر میں کوئی بھی کام پڑے مجھے ضرور یاد کیجئے گا" اس شخص نے ننھا سا ایک کارڈ دل آویز کی جانب بڑھایا جسے دل آویز نے جھجھکتے ہوئے تھام لیا۔۔۔ وہ مسکراتے ہوئے اپنا سفری بیگ گھسیٹتے ہوئے مخالف سمت کی جانب بڑھ گیا اور دل آویز ایک بار پھر ائیر پورٹ پر تنہا رہ گئی۔

ابھی تھوڑے ہی لمحے سرکے تھے کہ ایک نفیس سی نسوانی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

"ہیلو مس دل آویز" ایک لمبی سی دُبلی پتلی خوبصورت نقوش کی لڑکی نے اُسے مسکرا کر مخاطب کیا۔

"جی" وہ ہچکچائی

"میرا نام جولیانہ ہے۔ مسٹر میر آہل نے مجھے آپ کو ائیر پورٹ سے رسیوں کرنے بھیجا ہے۔۔۔ ویلکم ٹو برمنگھم" اس نے سفید اور پیلے رنگ کے پھولوں کا خوشبودار گلدستہ دل آویز کی جانب بڑھایا۔

دل آویز نے ایک نظر بھر کر سفید رنگ کی شرٹ کے ساتھ پہنے لائٹ پنک کلر کی گھٹنوں تک آتی اِسکرٹ میں ملبوس خوش شکل لڑکی کو دیکھا۔۔۔ اس کے بال لائٹ براؤن تھے جو کندھوں سے تھوڑا نیچے تک آتے تھے۔ جولیانہ نے مہارت سے تراشے ہوئے بالوں کو نیچے سے کرل کر کے کندھوں پر پھیلا رکھا تھا۔ اُس کے بالوں اور آنکھوں کا رنگ ایک جیسا تھا۔

وہ جب مسکراتی تھی تو اس کے بائیں گال پر ہلکا سا ڈمپل پڑتا تھا۔ جو اس کی خوبصورتی میں مزید دلکشی پیدا کر دیتا تھا۔

اس بجھے دل کے ساتھ گلدستہ پکڑ لیا۔

"خود آنے میں پاؤں گھس جاتے ان کے اس لئے اپنی سب سے خوبصورت والی ملازمہ کو بھیج دیا۔۔۔ اونہوں" وہ خفگی سے سوچتے ہوئے جولیانہ کے ہمراہ چلنے لگی۔

سامنے سیاہ رنگ کی چمچماتی کار کھڑی تھی۔ جس کے ساتھ سیاہ رنگ کے قیمتی سوٹ میں ملبوس خوبصورت شکل وصورت کا شوفر کھڑا تھا۔ اس نے نہایت ہی پروفیشنل انداز میں دل آویز کو ویلکم کہتے ہوئے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا تھا۔

"واہ یہاں کہ ڈرائیور تو ہمارے فلمی اداکاروں سے زیادہ خوبصورت ہیں" اس نے دل ہی دل میں ایک اور شوشا چھوڑا۔

"میں آپ سے معزرت چاہتی ہوں مس دل آویز کہ آپ کو ائیرپورٹ پر انتظار کرنا پڑا" جولیانہ نے مسکرا کر معزرت خواہ انداز میں کہا۔ دل آویز اور جولیانہ گاڑی میں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

"کوئی بات نہیں۔۔۔ ویسے انہوں نے آپ کو کیوں بھیج دیا۔ وہ خود کیوں نہیں آئے" معصوم لہجے میں سوال کیا گیا۔ جواباً جولیانہ کھل کر مسکرائی تھی۔

اُسے دل آویز کی معصومیت بہت اچھی لگی تھی۔

"دراصل میم۔۔۔ سر لندن کسی نئے پروجیکٹ کی میٹنگ کے سلسلے میں گئے ہوئے ہیں" اس نے رک کر دل آویز کے چہرے کے تاثرات دیکھے۔۔ جہاں ایک عجیب سی یاسیت تھی۔

"مگر آپ فکر مت کریں۔۔ سر آج شام ہی میٹنگ وائن ڈپ کر کے واپس آجائے گے" اس نے اس معصوم کو تسلی دینی چاہی۔

"ہمم۔۔۔" وہ اب اُداس نظر آرہی تھی۔

"وہاں تو میری بہت فکر تھی انہیں۔۔۔ ایک ہفتے بعد کے بجائے دعمو دن بعد کی ٹکٹس بُک کروائی تاکہ مجھے حویلی میں تنہا چچی اور کریم کے ساتھ نا رہنا پڑے اور اب جب میں آگئی ہوں تو مجھے لینے تک نہیں آئے ملازموں کی فوج بھیج دی" وہ اندر ہی اندر اپنے اداس دل سے گِلا کرنے لگی۔

☆...☆...☆

گاڑی برمنگھم کے ایک پوش علاقے میں واقع ایک خوبصورت سے بنگلے کے سامنے جا کر رُکی۔

(آجبسٹن) برمنگھم کے متمول علاقوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جو اپنی نباتاتی باغ اور شجرگاہ کے لئے کافی شہرت رکھتا ہے۔

شوفر نے چھوٹا سا ریموٹ کنٹرول نکال کر دروازے کی جانب رُخ کر کے ایک بٹن دبایا تو بیرونی دروازہ خود بخود کھلتا چلا گیا۔ دل آویز چند لمحوں کے لئے مبہوت ہوئی۔ جولیانہ کی شوفر کی جانب پشت تھی۔ مگر وہ دل آویز کے

چہرے پر حیرانگی سے آتے جاتے تاثرات دیکھ کر اندازہ لگا سکتی تھی کہ اس کے لئے یہ سب کچھ بلکل نیا ہے۔وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح آنکھیں گھوما گھوما کر حیرت سے ارد گرد دیکھ رہی تھی۔

جولیانہ اُسے دیکھ کر محظوظ ہوئی۔وہ بہت معصوم اور پیاری تھی۔بلکل چھوٹے بچوں کی طرح۔۔۔

گاڑی سرمئی اینٹ کی روش پر چلتی اندرونی گیٹ کے سامنے رُکی جہاں چند ملازم دل آویز کے استقبال کے لئے پہلے سے کھڑے تھے۔

شوفر نے دروازہ کھولا تو وہ آہستگی سے گاڑی سے اُتری اور سر اٹھا کر اس عالیشان گھر کو دیکھا جو اس کی جنت بننے والا تھا۔اس کی پشت اتیجبسٹن کے سبز باغ چہک رہے تھے۔

ایک ملازم نے جھک کر خوش آمدید کہتے ہوئے لال گلابوں کا گلدستہ اس کی جانب بڑھایا۔۔اس بار دل آویز پورے اعتماد سے گلدستہ تھامتے ہوئے مسکرائی۔اس مسکراہٹ میں تفاخر تھا،خوشی تھی،مان تھا۔کیونکہ یہ گھر اس کے شوہر کا تھا۔

دوسرے ملازم نے دل آویز کے لئے لکڑی کا بلند قامت دروازہ کھولا۔۔دل آویز کو لگا وہ کسی جنت میں آگئی ہے۔وہاں رکھی ہر شے انتہائی قیمتی اور خوبصورت تھی۔گھر بہت قرینے سے سجایا ہوا تھا۔

وہاں کسی بھی شے کی کمی نہیں تھی۔ہر چیز پرفیکٹ تھی۔پرفیکٹ اینڈ بیوٹیفُل۔

وہ ایڑیوں کے بل گھوم گھوم کر ہر چیز دیکھ رہی تھی۔قیمیتی فرنیچر،قیمتی فانوس۔۔۔

"میم۔۔۔آپکا کمرہ اس طرف ہے" جولیانہ نے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ملازم اس کا سامان کمرے میں پہلے ہی رکھوا چُکے تھے۔اس کا کمرہ نہایت خوبصورت تھا۔خوبصورت پردے، نرم گداز جہازی سائز کا بستر۔۔۔قدموں تلے ایرانی قالین بچھا ہوا تھا۔جس میں دل آویز کے پاؤں دھنسے چلے جا رہے تھے۔کھڑکی کے باہر گارڈن کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔جہاں مالی پھولوں میں پانی ڈال رہا تھا۔کونے میں ایک اسٹڈی ٹیبل اور ریک بھی موجود تھا۔

بستر کی سامنے والی دیوار پر پچاس انچ کا ایل-ای-ڈی نصب تھا۔

"امید ہے آپ کو اپنا بیڈ روم پسند آیا ہو گا میم" جولیانہ نے مسکرا کر کہا۔

"بہت اچھا ہے" جواباً وہ بھی گرم جوشی سے مسکرائی تھی۔ سب کچھ اس کی توقع سے زیادہ اچھا اور شاندار تھا اور یقین کروں جب سب کچھ اچھا اچھا ہوتا جائے تو سمجھ جانا اب کچھ بُرا لازمی ہونے والا ہے۔

"آپ کے لئے باتھ روم ریڈی کروا دیا ہے۔۔۔ آپ فریش ہو کر کھانا کھا لیں اور کسی بھی شہہ کی ضرورت ہو تو آپ انٹر کام کر سکتی ہیں" جولیانہ یہ کہتے ہوئے کمرہ مقفل کر کے وہاں سے چلی گئی اور دل آویز کچھ پل یوں ہی خالی الذہنی کی حالت میں بند دروازے کو مسکرا کر گھورتی رہی۔

☆...☆...☆

پاکستان کی سرد ہوا میں خنکی کی ملاوٹ بتدریج بڑھ گئی تھی۔ آسمان پر تاریکی پھیلتے ہی گاؤں کی گلیوں میں خوفناک سناٹا پھیل جاتا۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں انسان کے تن بدن میں خوف کی لہر دوڑا دیتیں۔ ایسے میں زلیخا باتھ روم میں بیسن پر جھکی شیشے میں نا جانے کون سا نقطہ تلاش کر رہی تھیں۔

واش بیسن کے نل سے برق رفتاری سے پانی بہہ رہا تھا۔

بی جان کی موت۔۔۔ دل آویز کی بربادی اور دو دن بعد میر آہل کی واپسی اور پھر شاید ہی وہ پلٹ کر آتا۔۔۔ کتنا بہترین لائحہ عمل تشکیل دیا تھا انہوں نے۔ نل سے بہتی دھارا کو بغور دیکھتے ہوئے زلیخا نے سوچا تھا مگر پھر بھی اُنہین ناکامی کا چہرہ دیکھنا پڑا

۔۔۔ آخر کیوں۔۔۔؟؟؟ زلیخا نے پانی کے چند چھینٹے اپنے چہرے پر ماریں۔ چہرے سے پانی کی بوندیں ٹپ ٹپ گر رہی تھیں۔ جس میں اب نمکین پانی کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ مگر وہ رو کیوں رہی تھیں۔

کیا دل آویز کی شادی ہی اصل وجہ تھی اُن کے آنسوؤں کی؟ اس بات کا جواب ان کے دل کے پاس بھی نہیں تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی میں ان کی زندگی کٹ رہی تھی۔

انسان اپنی آنکھیں اور کان بند بھی کر لے تب بھی ضمیر آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔۔۔ یہ آپ کو وہ دکھاتا رہتا ہے جو آپ دیکھنا نہیں چاہتے۔۔۔ وہ سناتا ہے جو آپ سننا نہیں چاہتے۔ ضمیر کی دستک دل پر تھپڑ کی طرح لگتی ہے۔

☆...☆...☆

وہ شاور لیکر باتھ روم سے نکلی تو سامنے ٹیبل پر کھانا پہلے سے رکھا ہوا تھا۔ شاید جولیانہ رکھ گئی تھی۔

لمبے سفر کی تھکان میں۔۔۔ نہانے کے بعد کچھ کمی آگئی تھی اور کھانا دیکھ کر دل آویز کو احساس ہوا کہ اُسے واقعی بھوک لگی ہوئی ہے۔

اس نے ٹرے میں سجے کھانے پر نظر ڈالی۔ ایک درمیانے سائز کے بریڈ باؤل میں کریمی کارن سوپ سرو تھا۔ باؤل کی صورت میں تراشا ہوا بریڈ دکھنے میں واقعی درمیانے سائز کا کٹورا لگ رہا تھا۔

بریڈ باؤل سب سے پہلے فرانسسکو میں ایجاد ہوا تھا جو 1427 میں ایک آئرش رئیس نے اعلیٰ عہدے کے ایک رئیس کو امپریس کرنے کے لئے بنایا تھا۔

کھانے کی خوشبوں اور شکل بظاہر بہت اچھی تھی مگر دل آویز کی تو داڑ بھی گیلی نہیں ہونی تھی اس کارن سوپ اور بریڈ سے۔۔۔ دل آویز کا چہرہ یکدم بجھ سا گیا۔ بھوک سے اس کی حالت زیر ہو گئی تھی مگر پاپی پیٹ کا سوال تھا۔

وہ ٹِرے لیکر کمرے سے باہر نکلی۔۔۔ اور متلاشی نظریں اطراف میں ڈالیں۔ گھر اتنا بڑا تھا کہ اُسے کچن ڈھونڈنے میں تکلیف ہوئی مگر آخر کار وہ کچن تک پہنچ گئی۔

کچن میں ایک ادھیڑ عمر کا شخص سفید یونیفارم میں کھڑا سبزیاں کاٹ رہا تھا وہ غالباً شیف تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدھی عمر کا شخص کھڑا تھا جو یقیناً اُس شیف کا ہیلپر تھا۔ دونوں دل آویز کی آمد پر چونک سے گئے۔

"میم آپ کو کچھ چاہئے تھا تو آپ انٹر کام کر دیتیں۔ ہم آپ کے کمرے میں پہنچا دیتے" ہیلپر نے مودبانہ انداز میں فوراً کہا۔

"وہ دراصل" دل آویز نے ٹرے کچن کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے بات کا آغاز کیا" مجھے بہت بھوک لگ رہی تھی اور میں سوپ زیادہ شوق سے نہیں پیتی" وہ ٹرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"آپ حکم کریں آپ کیا کھانا چاہے گی میں ابھی بنادوں گا" شیف نے اپنے پروفیشنل انداز میں کہا۔

"آپ کو بریانی بنانی آتی ہے" وہ معصومیت سے بولی جواباً شیف کے چہرے کا اعتماد پھیکا پڑا۔

"م۔۔ میم۔۔۔ مجھے پاکستانی کھانے بنانے نہیں آتے۔ مسٹر میر بھی پاکستانی کھانے نہیں کھاتے۔۔۔ بس کبھی کبھی ناشتے میں آلو کے پراٹھے ان کی فرمائش پر بنا دیتا ہوں" ادھیڑ عمر کا وہ شیف شرمندہ دکھائی دے رہا تھا۔

"اچھاااااااا" دل آویز نے غیر دانستہ طور پر لفظ اچھا کو کھینچا تو شیف کی جھکی گردن کچھ اور جھک گئی مگر دل آویز نے دھیان نہیں دیا۔

"آپ کہیں تو میں۔۔ چائنیز، اٹیلین، جاپنیز یا میکسیکن میں کچھ بنا دیتا ہوں" شیف پر اعتمادی سے دل آویز کو آپشنز پیش کرنے لگا۔

"نہیں ایک کام کریں آپ مجھے ایک پتیلا اور تمام مصالحے نکال کر دے دیں۔۔۔ بریانی میں خود بنالوں گی" یہ کہتے ہوئے دل آویز قمیض کے آستین کہنی تک چڑھاتے ہوئے کچن سنک کی جانب بڑھی۔۔۔ شیف اور ساتھ کھڑا شخص حیرت سے ایک نظر دل آویز کو پھر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

حکم کی تعمیل اُن کی جاب تھی۔۔۔ شیف کے ساتھ کھڑے ہیلپر جس کا نام جیری تھا۔ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے۔ دل آویز کی ہدایات پر عمل کرنے لگے۔

دل آویز پورے انہماک اور اعتماد سے کچن میں کام کر رہی تھی۔ شیف کو اُس کے کام کرنے کے انداز پر تعجب ہوا۔ وہ کسی ماہر شیف کی طرح ہاتھ چلا رہی تھی۔

ایک ایک چیز۔۔۔ آن پوائنٹ۔۔۔ تھی۔

شیف کو دل آویز بہت بھلی معلوم ہوئی وہ کسی مؤدب غلام کی طرح دل آویز کے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑا اُسے بریانی بناتے دیکھ رہا تھا۔

☆...☆...☆

میر آہل کی گاڑی جس وقت پورچ میں آکر رکی رات کے نو بج چکے تھے۔ شوفر نے میر آہل کے لئے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا۔۔۔ وہ ایک نگاہ کلائی پر بندھی گھڑی پر ڈالتے ہوئے گاڑی سے باہر نکل آیا۔

مائیکل ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر براجمان تھا۔ ہاتھوں میں چند فائلز تھیں۔

میر آہل چند لمحے یوں اندرونی گیٹ کو گھورتا رہا جیسے سوچ رہا ہو کہ اندر جائے یا نہیں۔ اس نے کندھے اچکائے۔۔۔ مائیکل گاڑی سے اتر کر میر آہل کے عقب میں آکر کھڑا ہو گیا۔

"کیا ہوا سر آپ یہاں کھڑے کیا سوچ رہے ہیں؟" مائیکل آہل کے ساتھ پچھلے سات سالوں سے کام کر رہا تھا۔ اس کے مزاج کی تبدیلی سے لیکر ماتھے پر پڑتی شکن کو وہ بخوبی جانتا تھا۔

اور ایک اچھے اور وفاداری غلام کی یہی اچھی خوبی ہوتی ہے کہ وہ مالک کے بدلتے ہر مزاج کو پہچان لیتا ہے۔ اُسے اندازہ تھا کہ وہ دروازے پر رکا کیا سوچ رہا ہے۔

"آہ مائیک۔۔۔ یو نوٖمی ویری ویل۔۔۔ رائیٹ؟" میر آہل دونوں ہاتھ جیب میں ڈالے گردن ترچھی کئے مائیکل کی جانب دیکھتے ہوئے بولا تو مائیکل جھینپ گیا۔

"پھر پرابلم کیا ہے سر؟" وہ بات کو گھمانے پھرانے کے بجائے سیدھا مدعے پر آیا۔

"پرابلم۔۔۔" میر آہل زیر لب بڑبڑایا جیسے کوئی مناسب سا جواب کھوج رہا ہو۔ چند لمحے یوں ہی گزر گئے۔ میر آہل کی جانب سے جواب نہ پا کر اُس نے تخلیہ لینا ہی مناسب سمجھا۔

"Alright sir ... I wish you best of luck" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا تو میر آہل پورا اس کی جانب گھوما۔۔۔ میں کیا کوئی قلعہ فتح کرنے جا رہا ہوں جو تم مجھے بیسٹ آف لک کہہ رہے ہوں۔

"ازدواجی زندگی میں سروایو کرنا۔۔۔ قلعہ فتح کرنے سے کم تھوڑی ہے سر" وہ بہ مشکل اپنی ہنسی دباتے ہوئے بولا۔

"اوہ۔۔۔ کیا واقعی" اُس نے تصدیق چاہی۔

"Sir just wait and watch ... You will get your answer soon ... I mean .... Very soon"

مائیکل کا اندازہ مضائقہ خیز تھا۔

"In your dreams Michael ... In your dreams"

میر آہل کا اعتماد سوا نیزے پر تھا۔۔۔ اور ہوتا کیوں نہیں آج تک کوئی ایسا شخص اس سے ٹکرایا ہی نہیں تھا جو میر آہل کو لاجواب کر سکے مگر آپ نے یہ بھی سنا ہو گا کہ زندگی میں بہت سی چیزیں پہلی بار ہوتی ہیں۔

وہ دونوں کچھ دیر یوں ہی کھڑے باتیں کرتے رہیں۔ میر آہل اب بہتر محسوس کر رہا تھا۔

☆...☆...☆

آفس کے کام اور مسلسل سفر نے میر آہل کو کافی تھکا دیا تھا۔ وہ شاور لیکر پُر سکون نیند سونا چاہتا تھا۔ اس نے دل آویز کے کمرے کے دروازے پر نظر ڈال کر وال کلاک کو دیکھا۔

"شاید سو گئی ہے" اس نے اندر ہی اندر تبصرہ کیا۔

وہ سیڑھیوں کی جانب مُڑنے ہی لگا تھا کہ اُس کی ناک کے نتھنوں سے بریانی کی اشتہا انگیز خوشبو ٹکرائی۔ اُس نے حیرانگی سے کچن سے آتی نسوانی آواز کو سُنا۔

غیر ارادی طور پر اُس کے قدم خود بخود کچن کی جانب چل پڑے۔ وہ کچن کے دروازے پر کھڑا اندر کا منظر دیکھ کر لمحے بھر کے لئے ششدر رہ گیا۔

دل آویز بریانی ٹرے میں منتقل کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ جیری کو سلاد اور رائتا بنانے کی ہدایت دے رہی تھی۔ اور ادھیڑ عمر کا شیف سائیڈ میں ہاتھ باندھے کھڑا خاموشی سے تمام کاروائی دیکھ رہا تھا۔

"ہیلو سر۔۔ کیا آپ کو کچھ چاہیئے" شیف یکدم سیدھا ہوا۔۔ دل آویز کا (بریانی کا چمچ پکڑا) ہاتھ ساکن ہوا۔

" ہممم" میر آہل نے آہستگی سے گلہ کھنکارا یوں جیسے تمام الفاظ حلق میں ہی اٹک گئے ہو۔

"میرا کھانا میرے روم میں پہنچا دیجئے گا" یہ کہہ کر وہ کچن سے نکل آیا۔ کھانا تو وہ پلین میں کھا چُکا تھا مگر بریانی کو کون ناں کہہ سکتا تھا۔ بریانی دیکھتے ہی اُس کی بے وقت بھوک نے زور پکڑ لیا تھا۔

کچھ دیر بعد جب وہ فریش ہو کر باہر نکلا تو ملازم تب تک کھانا رکھ کر جا چکا تھا۔ وہ ٹاول سے بال خشک کرتے ہوئے نرم گداز کاؤچ پر براجمان ہو گیا اور کچھ دیر یوں ہی بریانی کی پلیٹ کو گھورتا رہا۔

بریانی سے اٹھتے دھوئے میں ماضی کی کچھ حسین یادوں کی تجلی دِکھنے لگی۔ اس نے سر جھٹک کر ساتھ رکھا چمچہ اٹھایا اور بریانی کا ایک لُقمہ منہ میں رکھا۔۔۔ لقمہ منہ میں رکھتے ہی اُس کی آنکھیں نم ہوئیں۔ ذائقہ شناسا تھا۔

وہ انہماک سے بریانی کھانے لگا۔ چہرے پر ایک عجیب سا سکون تھا۔ اُسے حویلی میں بِتائے ماضی کے وہ پل یاد آنے لگے جب وہ خود ایک نوعمر لڑکا ہوا کرتا تھا۔ تب دل آویز شاید بارہ یا تیرہ سال کی تھی۔

("تائی جان مجھے بھی بریانی بنانا سیکھنی ہے۔۔۔کتنے مزے کی بریانی بناتی ہیں آپ کہ سب انگلیاں چاٹتے رہ جاتے ہیں" دل آویز سمیرا چچی کے عقب میں کھڑی بریانی کے پتیلے میں جھانکتے ہوئے چہک کر بولی۔۔۔جب میر آہل کسی کام سے کچن میں داخل ہوا تھا۔

"گڑیا بریانی بنانا کون سا مشکل کام ہے بس سارا کھیل مصالحوں کا ہے" سمیرا چچی پتیلے میں چمچ چلاتے ہوئے مسکرا کر بولیں۔۔۔وہ جواباً کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ میر آہل کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک کر چپ ہو گئی۔

میر آہل بچپن سے ہی خاموش طبیعت اور روعب دار شخصیت کا مالک تھا ہاں مگر تب بھی وہ کافی خوش اخلاق اور ہنسنے بولنے والوں میں سے تھا۔)

خاموشی اس کی شخصیت کا محور میر رحمان اور سمیرا کے انتقال کے بعد بنی تھی۔ورنہ وہ محفلوں کی جان ہوا کرتا تھا مگر یہ کہنا غلط نہیں تھا کہ آج بھی میر آہل کی آمد سے محفلوں میں چار چاند لگ جاتے تھے۔بلاشبہ وہ جاذب نظر شخصیت کا مالک تھا۔اپنے نام کی طرح وہ آج بھی سب کے دلوں پر حکومت کرتا تھا۔۔۔خاص طور پر خوبصورت حسیناؤں کے دل پر۔۔۔وہ کیا کہتے ہیں انگریزی میں۔۔۔ہاں۔۔ہینڈسم ہنک۔۔۔

وہ جھٹ سے بریانی کی پوری پلیٹ صاف کر چکا تھا۔

وہ کبھی بھی رات میں کچھ بھی ہیوی نہیں کھاتا تھا مگر ناجانے آج کیسے وہ اپنا بنایا ہوا اُصول فراموش کر گیا تھا۔

"کوئی بات نہیں کل جِم میں ایک گھنٹہ ایکسٹرا ورک آؤٹ کر لوں گا" اس نے اپنے گلِٹ کو کم کرنے کی کوشش کی اور نیپکن سے ہونٹوں کے کنارے صاف کرتے ہوئے باہر واک کے لئے نکل گیا کیونکہ اب اتنا ہیوی کھانا کھانے کے بعد سونا تھوڑا مشکل ہی تھا۔

☆...☆...☆

سورج کی روشنی انگلینڈ کے صاف آسمان پر پھیل چکی تھی۔برمنگھم کی سڑکیں ایک بار پھر گاڑیوں سے کھچا کھچ بھر چکی تھیں۔لوگ اپنے اپنے آفسز کی جانب بڑھ رہے تھے۔ایسے میں میر آہل تیار ہو کر ٹائی کو ٹھیک کرتے ہوئے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔

وہ لائٹ بلو سوٹ میں ملبوس آفس جانے کے لئے بلکل تیار لگ رہا تھا۔

آہل سیڑھیاں اُتر کر دروازے کی جانب بڑھنے ہی لگا تھا کہ ڈائننگ ہال کے سامنے سے گزرتے ہوئے۔اس کے قدم منجمد ہوئے۔۔۔ آلو کے پراٹھے کی اشتہا انگیز خوشبو نے اس کا دھیان اپنی جانب کھینچا۔ وہ نا چاہتے ہوئے بھی رُک گیا۔

عموماً وہ صبح ناشتہ نہیں کرتا تھا۔ بس اسٹار بکس کی کافی کا ایک کپ لنچ ٹائم تک سرائیو کرنے کے لئے کافی تھا۔

☆...☆...☆

دروازے کے باہر مائیکل ایک ہاتھ میں کافی کا کپ پکڑے دوسرے ہاتھ کی کلائی میں بندھی کھڑی میں وقت دیکھنے لگا پھر مسکرا کر کافی کا کپ لبوں سے لگایا۔

"Told you sir" وہ زیر لب مسکراتے ہوئے گرم گرم کافی کے گھونٹ بھرنے لگا۔ اُسے معلوم تھا کہ ناشتے کے بعد میر آہل کافی نہیں پیتا۔ اتنے سالوں میں ایسا بہت ہی کم ہوا تھا کہ میر آہل صبح گھر سے ناشہ کر کے آفس کے لئے نکلا ہو اور اب تو خیر سے میر آہل کی بیگم آچکی تھیں۔ اب کیسے وہ خالی پیٹ نئے دن کا آغاز کر سکتا تھا۔

مائیکل مسلسل مُسکرا رہا تھا۔ جیسے کوئی اپنے اندازے کی درستگی پر مسکراتا ہے۔

☆...☆...☆

میر آہل کوٹ کا بٹن کھولتے ہوئے سربراہی کرسی پر بیٹھ گیا اور نظر بھر کر ٹیبل پر رکھے لوازمات کا جائزہ لیا۔ ملازم نے آگے بڑھ کر فرائیڈ ایگ اُسے سرو کرنا چاہا مگر آہل نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک دیا اور خود سامنے رکھے ہوٹ پوٹ سے ایک آلو کا پراٹھا نکال کر اپنی پلیٹ میں رکھا اور بٹر کا ایک ٹکڑا پراٹھے کے اوپر ڈالا۔۔۔ گرم گرم پراٹھے پر مکھن موم کی طرح پگھلنے لگا۔ پہلا نوالا لیتے ہی اُس کے چہرے پر بشاشت پھیل گئی۔

اتنے لذیز پراٹھے اُس نے برسوں بعد کھائے تھے۔

شیف نے میر آہل کے حکم پر آلو کے پراٹھے بنانا سیکھ تو لئے تھے مگر ان میں وہ ذائقہ نہیں تھا جو اِن پراٹھوں میں تھا۔ اُسے احساس ہی نہیں ہوا کب وہ دو پراٹھے کھا گیا۔ حلق سے خارج ہوتی ڈکار کو اس نے بمشکل منہ پر نیپکن رکھ کر روکا۔۔۔ ملازم نے ٹیبل سے پلیٹ اُٹھاتے ہوئے کُن اکھیوں سے میر آہل کو دیکھا تھا۔

مگر اس نے فوراً نظریں دوسری جانب پھیر لیں۔ وہ کل سے عجیب برتاؤ کر رہا تھا۔ ملازموں کا چونکنا تو بنتا تھا۔

"کوئی بات نہیں دو کی جگہ چار گھنٹے ورک آؤٹ کر لوں گا" اس نے ایک بار پھر اپنے دل کو تسلی دے کر خاموش کروا دیا جو اُسے مسلسل اپنے اصول توڑنے پر ملامت کر رہا تھا۔ مگر یہ تو بیچارہ دل بھی نہیں جانتا تھا کہ آنے والے کل میں اُسے اور کیا کیا جھیلنا پڑے گا۔

☆...☆...☆

مائیکل بیک ویو مرر میں بار بار میر آہل کے چہرے پر آتے جاتے رنگ دیکھ رہا تھا۔ میر آہل غیر آرام دہ سا بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ اتنا عرصہ انگلینڈ میں گزارنے کے بعد اس کا کافی، بوائل انڈے اور کارن فلیکس پر چلنے والا معدہ مصالحے دار بریانی اور تیل میں نہائے پراٹھوں کو قبول نہیں کر پا رہا تھا۔

حویلی میں بھی وہ کھانے پینے میں بہت احتیاط کیا کرتا تھا مگر کل رات سے سارا نظام ہی درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔

"اس لڑکی کا داخلہ کچن میں ممنوع کرنا پڑے گا ورنہ یہ ایک ہفتے میں ہی میری ڈائٹ پلان کا جلوس نکال دیگی" وہ ناچاہتے ہوئے بھی یہ اعتراف کر بیٹھا تھا کہ دل آویز کے ہاتھ میں بھرپور ذائقہ تھا۔

کچھ دیر بعد میر آہل اپنے آفس میں پاور سیٹ پر براجمان تھا اور روز مرہ کی طرح مائیکل اُسے آج کا شیڈول بتا رہا تھا۔

"I think it's enough for today, cancel all the meetings" میر آہل نے ٹائی ڈھیلی کرتے ہوئے اُسے ٹوکا۔

"Are you ok sir" ناچاہتے ہوئے بھی مائیکل پوچھ بیٹھا۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں بس آج موڈ نہیں کام کرنے کا" اس نے سرسری انداز میں کہا پھر اپنے ہی الفاظ پر خود ہی حیران ہوا جو اباً مائیکل نے بھی حیرت سے میر آہل کو دیکھا۔

جس شخص کی پہلی اور آخری ترجیح ہمیشہ اس کا کام رہی ہو۔۔۔ ایسے شخص کے منہ سے ایسی بات سننا واقعی حیرت میں مبتلا کرنے والی بات تھی۔

"و۔۔۔وہ۔۔یہ پوراوِیک میں کافی مصروف رہاہوں۔۔۔یو نو۔۔ڈیلیگیشنز، میٹنگز، کانفرنسز وغیرہ وغیرہ" اس نے لیپ ٹاپ پر کچھ ٹائپ کرنے کی اداکاری کرتے ہوئے ایکسکیوز دیا۔

"یس سر آئی انڈرسٹینڈ" مائیکل نے اچھے امپلائی کی طرح اپنے باس کا بھرم رکھتے ہوئے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ میر آہل کی خاموشی اس بات کا اشارہ تھی کہ وہ جاسکتا ہے۔

مائیکل نے ہاتھ میں پکڑی فائل ٹیبل پر رکھی اور دروازے کے پاس پہنچ کر وہ رُکا۔ اپنا ایک ہاتھ ہینڈل پر رکھتے ہوئے وہ آہستگی سے واپس گھوما۔

چہرے پر شرارت بھری مسکان نمودار ہوئی۔

"سر میں آپ کے لئے جِنجر ٹی بھیجتا ہوں" ہونٹ دباتے ہوئے اس نے میر آہل کے چہرے کے تاثرات دیکھے۔

“Because Ginger helps speed up the digestion process and empty your stomach more quickly ”

گوگل سے لیا گیا گیان روبوٹک انداز میں بولتے ہوئے وہ فوراً وہاں سے بھاگنے والے انداز میں نکلا اُسے میر آہل کا ساتھ اور اپنی یہ جاب دونوں بڑی عزیز تھی۔

اور میر آہل اثبات میں سر ہلاتا محض دروازے کو گھورتا رہ گیا۔

☆...☆...☆

وہ دیوار پر نصب لمبے آئینے کے سامنے کیٹ واک کر رہی تھی۔

"Hmm i love these heels" سیلز گرل کو نظر سے سیاہ اونچی ہیلز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے وہ ایک بار پھر ہیلز کی اونچی نوک پر گھومی اور گردن کڑا کر شیشے میں اپنے دودھیا پیروں کو دیکھا۔

"Are you sure ma'am?" سیلز گرل نے ایک بار پھر یقین دہانی کرنا چاہی۔

"میری حیثیت پر کوئی شبہ ہے تمہیں" رُک کر ایک سخت نگاہ اُس پر ڈالی۔۔۔ سیلز گرل کا سوال غلط نہیں تھا۔ بس سوال پوچھنے کا وقت غلط تھا۔ ویسے بھی اینا کا ان دنوں موڈ ہی کچھ ایسا تھا کہ پانی بھی اس کا حلق کڑوا کر دیتا تھا۔

"I can buy gucci's whole outlet you dumb girl "

کندھے اچکاتے ہوئے وہ کاؤنٹر کی جانب بڑھ گئی۔ آؤٹ لیٹ مینیجر جو پاس ہی کھڑا تھا فوراً سے معزرت کرتے ہوئے اینا کے پیچھے پیچھے آیا۔

"سوری میم۔۔۔اُس کے کہنے کا وہ مطلب نہیں تھا" اس نے فوراً سے بات سنبھالی کے لاکھوں کا بِل (جو اینا اور نگزیب کے کارڈ سے ادا ہونے والا تھا) کہیں بنتے بنتے رہ نہ جائے۔

"Whatever justin"

وہ بِل ادا کر کے آنکھوں پر سیاہ گوگلز ٹکاتے ہوئے آؤٹ لیٹ سے باہر نکل گئی۔۔۔ آؤٹ لیٹ کے باہر چار ملازم جو پہلے ہی بہت سے مختلف برانڈز کے شاپرز تھامے ہوئے اس کے انتظار میں کھڑے تھے۔اُس کے آتے ہی پیچھے پیچھے اگلی دکان کی جانب بڑھ گئے۔

دنیا میں تین طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔پہلے وہ جو پریشانی میں اپنے دوستوں سے باتیں کر کے اپنا دل ہلکا کرتے ہیں۔دوسرے وہ جو پریشانی میں خوب کھانا کھاتے ہیں اور تیسرے وہ جو پریشانی میں اپنے رب کو یاد کرتے ہیں ۔۔۔مگر یہ اینا اور نگزیب تھی جو پریشانی میں لاکھوں کی شاپنگ کرتی تھی۔

گُوچی،لوئی ویٹون اور ورساچے اس کے فیورٹ برانڈز تھے۔عموماً لوگ دوسروں کے لئے خوش و خرم رہنے کی دُعا کرتے ہیں مگر اِن برانڈز کے مینیجرز اس کے دُکھی ہونے کی دعا کرتے تھے۔

ملازم شاپنگ بیگز کار کی ڈگی میں رکھ رہے تھے جب اینا اور نگزیب کا فون بجا۔اس نے ایک ہاتھ سے سیاہ چشمے کو ماتھے پر ٹکاتے ہوئے فون ہوا میں لہرایا۔۔۔چہرے پر ہلکی سی مسکان نمودار ہوئی۔

"ہیلو مسٹر اور نگزیب عالم" وہ گاڑی کی پچھلی نشست پر براجمان ہوتے ہوئے بولی تو سامنے والے کا قہقہہ بلند ہوا۔

"لگتا ہے میری بیٹی نے پورا مال خرید لیا ہے آج" ان کا موبائل مسلسل پیمنٹ اپڈیٹس کے میسجز سے بج رہا تھا۔

"نہیں ڈیڈ کچھ خاص نہیں خریدا" وہ سرسری انداز میں بولی چہرے پر اُداسی صاف عیاں تھی۔

"ڈونٹ وری ہنی اب تمہیں اپنی اداسی کو انٹرٹین کرنے کے لئے شاپنگ مالز کے چکر لگانے کی ضرورت نہیں پڑے گی" وہ اپنی پاور سیٹ کو دائے سے بائے ہلاتے ہوئے بولے۔ اتنے دنوں میں پہلی بار اینا اور نگزیب کے چہرے پر خوشگوار تاثرات اُبھرے۔۔۔۔

"آئی لو یو ڈیڈ" وہ ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے کھکھلا کر ہنس دی۔

"آئی لو یو ٹو ہنی" وہ بھی پورے دل سے مسکرائے تھے۔

اینا نے شوفر کو میر آہل کے گھر کی جانب گاڑی موڑنے کا حکم دیا اور کھڑکی سے باہر سڑک پر دوڑتے ٹریفک کو مسکرا کر دیکھنے لگی۔

اپنے من پسند شخص کی موجودگی کا احساس دنیا کے باقی تمام احساسات کو مات دے دیتا ہے۔

"میر آہل" وہ زیرلب کہتے ہوئے طمانیت سے مسکرائی۔

☆...☆...☆

میر آہل اس وقت اپنے گھر کی پہلی منزل پر بنے جِم میں موجود تھا۔ اُس نے گرے رنگ کا ٹراؤزر اور ٹینک پہن رکھا تھا۔ ٹریڈ مِل پر دوڑتے ہوئے بار بار اُس کے ماتھے پر پسینہ آ رہا تھا۔ جِسے وہ گردن میں ڈالے پیلے رنگ کے ٹاول سے وقفے وقفے سے صاف کر رہا تھا۔ اس کا دماغ مختلف سوچوں کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

ٹریڈ مِل آف کرنے کے بعد وہ پُل اپس لگانے لگا۔ راڈ سے لٹکا وہ چھ فٹ کا شخص پورا زور لگاتے ہوئے اپنے نچلے حصے کو اوپر اٹھا رہا تھا۔

وہ شاید یوں ہی بنا رُکے اپنی ہی سوچوں میں غرق پُل اپس لگاتا رہتا اگر دروازے پر دستک نا ہوتی۔

یوں جیسے طوفان آ گیا ہو۔ وہ کچھ کہتا اس سے پہلے ہی اینا جم کا دروازہ دھڑ سے کھولتی اندر داخل ہو گئی۔

میر آہل نے چہرے پر بہتے پسینے کو پونچھتے ہوئے پانی کی بوتل منہ سے لگائی اور دیوار کی جانب رُخ کر کے کھڑا ہو گیا جو غالباً شیشے کی تھی اور یہاں سے گھر کا بیک یارڈ اور سوئمنگ پول دکھائی دے رہا تھا۔

میر آہل کے ماتھے پر بل تک نہیں پڑے تھے۔ جیسے اینا کی موجودگی سے اُس کی ذات پر ذرا برابر بھی فرق نہ پڑا ہو۔

"ہنی۔۔۔ آئی مسٹڈ یو سو مچ" وہ بے اختیار آہل کو پیچھے سے گلے لگاتے ہوئے بچوں کی طرح بولی۔

"بی ہیو یور سیلف اینا" میر آہل نے بنا مڑے ہی اُسے جھٹکے سے پیچھے کیا۔

"تمہیں اچھے سے معلوم ہے کہ مجھے اس طرح کی بے تکلفی بلکل بھی پسند نہیں ہے" اب وہ اسے سخت نگاہوں سے گھورتے ہوئے بول رہا تھا۔

"اوہو۔۔۔ آہل تم اتنے دنوں بعد مل رہے ہو اور اب بھی غصہ کر رہے ہو۔۔۔ ناٹ فیئر" وہ معصومیت سے چہرہ لٹکاتے ہوئے بولی تو میر آہل کے کندھے ڈھلکے۔

"میری بی جان کا انتقال ہو گیا اینا" وہ تامل سے بولا اور۔۔۔۔ ابھی جملا اس کے منہ میں تھا کہ اینا نے فوراً سے افسوس کا اظہار کیا۔

"اوہ آئی ایم سو سوری فار یور لاس آہل" وہ افسوس بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اس کے دو قدم مزید قریب آئی اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

لہجہ بھیگا ہوا تھا مگر اینا اورنگزیب کی شکل کچھ اور ہی داستان بیان کر رہی تھی۔ چہرے پر خوشی کے تاثرات ابھرے جیسے وہ بڑی مہارت سے دکھ کے سانچے میں ڈھال رہی تھی۔

"اوہ تو اس کا مطلب جناب اپنی بی جان کے جنازے کو کندھا دے کر واپس آ گئے۔۔۔ شکر" وہ دل ہی دل میں شکر ادا کرتے ہوئے بولی جیسے کندھوں سے من و عن بوجھ اُتر گیا ہو۔

وہ تند مزاجی سے میر آہل کو دیکھنے لگی۔۔۔ میر آہل اُس کی نظروں کا اِرتکاز سمجھ گیا تھا وہ اینا کو مکمل طور پر نظر انداز کرتا اس کے بغل سے نکل کر دروازے کی جانب بڑھنے لگا جب اس کے قدم منجمد ہوئے۔

دل آویز تذبذب سی دروازے پر کھڑی تھی شاید کسی کام سے آئی تھی اور اینا کو دیکھ کر وہی دروازے پر ہی جھجک کر رُک گئی تھی۔

میر آہل نے لمبی سانس لیتے ہوئے اپنے ماتھے کو چھوا۔۔۔ ایِنا نے بھنویں اچکاتے ہوئے میر آہل کے عقب سے گردن نکال کر دل آویز کو سر سے پاؤں تک ایسے دیکھا کہ دل آویز مزید تذبذب کا شکار ہو گئی۔

"آہل یہ لڑکی کون ہے" وہ گردن کڑاتے ہوئے سراپا سوال بن گئی۔

"یہ۔۔۔" میر آہل چند قدم دل آویز کی جانب بڑھا۔ ایِنا کی جانب اُس کی پشت تھی اس لئے وہ اس کے تاثرات دیکھنے سے قاصر تھا۔

"یہ میری بیوی ہے دل آویز میر۔۔۔ مائے بیٹر ہالف" کتھئی رنگ کی آنکھیں لمحے بھر کے لئے سیاہ آنکھوں سے ٹکرائیں۔

یکدم ایِنا کی سانسیں ساکن ہوئیں۔ وہ سانس لینا بھول گئی۔ میر آہل نے پیچھے مڑ کر ایِنا کو دیکھنے کی زحمت تک نہیں کی وہ عقب میں سر جھکائے نازک سے سراپے کو دیکھتا رہا اور بنا کچھ کہے وہاں سے چلا گیا۔

اب وہاں دل آویز اور ایِنا اور نگزیب تنہا رہ گئے تھے۔

ایِنا کو دل آویز نازک اور خوبصورت لگی تھی اور اُس کا خوبصورت ہونا اس کے وجود میں اس لمحے اس طرح سے بجلیاں گرا رہا تھا کہ کوئی ایِنا کو اس لمحے چھو لیتا تو کرنٹ کے جھٹکے لگنے کے باعث منٹوں میں فوت ہو جاتا۔

ایِنا اُونچی ہیل پر آہستگی سے بلی کی چال چلتی دل آویز کے نزدیک آئی۔ خاموش کمرے میں ہائی ہیلز کی ٹھک ٹھک نے ارتعاش پیدا کیا۔۔۔۔ "دل۔۔۔ آویز۔۔۔ میر" ایک ایک لفظ توڑ توڑ کر کہتے ہوئے وہ اس کے عین سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

دل آویز نے نظر اٹھا کر سامنے کھڑی اس مغرور لڑکی کا چہرہ دیکھا۔ سر سے پاؤں تک وہ حُسن کا تراشا ہوا کوئی مجسمہ لگ رہی تھی۔

"او نہوں۔۔۔۔ مسز میر آہل۔۔۔۔ مائے فُٹ" ہیل کو زمین پر زور سے پٹختے ہوئے اس نے سیڑھیوں کا رخ کیا۔

غصے کی جگہ دکھ نے لے لی۔ سرخ آنکھوں میں انگارے کی جگہ گرم پانی تیرنے لگا۔

چوٹ دل پر لگے تو دوا سے آرام کی توقع کرنا حماقت ہے اور ٹھکرائے جانے کی اذیت کا تریاق تو ویسے بھی آج تک کوئی ڈھونڈ نہیں سکا ہے۔

☆...☆...☆

دل آویز ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں کے کنارے بھیگے ہوئے تھے۔

(میر آہل نے کمرے کا دروازہ جھماکے سے بند کیا چہرے پر برفیلے پہاڑ جیسے تاثرات تھے۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا اٹاول زمین پر پٹخا اور ڈریسنگ ٹیبل پر دونوں ہاتھ جماتے ہوئے ذرا سا جھکا۔۔۔ جھکی گردن کے ساتھ نظر اٹھا کر اس نے اپنے وجود کو شیشے میں دیکھا)

"کیا یہ وجہ تھی مجھے قبول نہ کرنے کی؟" وہ اپنی ہی ذات سے مستفسر ہوئی۔ آنسوں کا قطرہ ناچاہتے ہوئے بھی آنکھ سے بہہ نکلا۔

("کیا سوچ رہی ہو گی دل آویز میرے بارے میں" وہ ڈریسنگ کے کنارے کو بھینچتے ہوئے بڑبڑایا)

"اگر واقعی وہ لڑکی اُن کی زندگی میں تھی تو ہر بار میری زندگی میں آنے والی مشکلوں میں میرا ساتھ دینے کی یا ڈھال بننے کی آخر ضرورت ہی کیا تھی" دل آویز کا تعمیر کردہ آشیانہ ایک بار پھر بری طرح چکنا چور ہوا تھا جو اب پہلے سے زیادہ تکلیف دے رہا تھا۔

انسان کے خمیر میں سب کچھ شامل ہے سوائے اپنی ذات کی نفی کے۔۔۔ کہ یہ تکلیف ایسی ہے کہ جس کا کوئی تریاق نہیں کوئی دوا کوئی دعا نہیں۔

("خیر مجھے کیا وہ جو بھی سوچے مجھے اس سے بلکل بھی فرق نہیں پڑتا۔۔۔ میں میر آہل ہوں۔ اپنے فیصلوں میں آزاد اور خود مختار" وہ شانے اچکاتے ہوئے ایک بار پھر بڑبڑایا مگر اس بار اُسے اپنا انداز اتنا پر اعتماد نہیں لگا جیسا کہ ہمیشہ لگا کرتا تھا۔

یہ اُس کے اندر کیسے خیال نے سر اٹھایا تھا؟ وہ تذبذب کا شکار ہوا اور اس لمحے اُس نے غور سے شیشے میں خود کو دیکھا تھا۔ اپنی بدلتی رنگت دیکھ کر اُسے اپنے آپ پر حیرت ہوئی کہ وہ دل آویز کے خیال سے دوچار ہو رہا تھا۔

کیا وہ واقعی جُھک رہا تھا؟ مگر کس کے آگے؟

یہ ایک مُعمہ تھا۔ جسے وہ حل نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ دوسری صورت میں اُسے مات ہو جاتی اور اس وقت وہ کچھ بھی ہارنے کے موڈ میں نہیں تھا خاص طور پر اپنا دل)

"میر آہل میرا کبھی نہیں ہو سکتا۔۔۔ کبھی نہیں" یہ کہتے ہوئے دل آویز پھوٹ کر رو دی۔

("ہمارے درمیان جو رشتہ جڑا ہے وہ مصلحت کے تحت جڑا ہے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے اس رشتے میں" میر آہل جیسے خود کو تسلی دینے لگا)

کبھی کبھی ہمیں خود ہی معلوم نہیں ہوتا کہ ہمیں کیا چاہئے۔ ایسے حالات میں ہمیں چاہئے کہ سب کچھ وقت پر چھوڑ دیں کیونکہ وقت وہ سڑک ہے جہاں پیچھے مڑ کر دیکھو تو مستقبل نظر آتا ہے۔ سارے کھیل ہی وقت کے ہوتے ہیں جو جھوٹ اور سچ کو جھنجھوڑ کر آپ کے سامنے لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔

☆...☆...☆

چاند نے کھڑکی سے اندر جھانک کر دیکھا تو سرخ صبیح چہرے پر اداسی برپا تھی۔ کسی نے ٹھیک کہا تھا کہ رونے کے بعد نیند بڑی کمال کی آتی ہے۔ دل آویز بھی خوابِ خرگوشی میں مبتلا تھی۔

وہ دائیں کروٹ پر لیٹی ہوئی تھی اور بی جان کی تصویر کو اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ آنکھ کی جانب سے تکیہ بھیگا ہوا تھا۔

میر آہل رات کی واک سے فارغ ہو کر گھر واپس آیا تو زینوں کی جانب رُخ کرنے سے پہلے دل آویز کے کمرے کے دروازے پر نظر ڈالی نا جانے کیسے قدموں نے اپنا رُخ موڑا اور اس کے کمرے کی سمت چل پڑا۔

ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو دروازہ بنا چاپ پیدا کئے کھلتا چلا گیا۔ پورا کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا صرف سائیڈ ٹیبل پر رکھا کرسٹل کا لیمپ جل رہا تھا۔ کرسٹل کے لیمپ کی زرد روشنی میں دل آویز کا چہرہ معصومیت کی چادر اوڑھے دکھائی دیتا تھا۔ وہ مبہوت سا اُسے دیکھتا چلا گیا۔

میر آہل نے جھک کر انگلی کے پوروں سے دل آویز کی پلکوں پر ٹھہری نمی کو چُھوا۔

بے ساختہ اُس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔۔۔ کیا ہوا تھا معلوم نہیں بس اُس کا دل اس کی جانب جُھکتا چلا گیا۔ دل آویز اس کی موجودگی سے بے خبر خوابوں کی وادی میں گُم تھی پر ہوش میں تو اب میر آہل بھی نہیں تھا۔

اس نے دل آویز کے رخسار پر بکھرے بالوں کو آہستگی سے اُس کے کان کے پیچھے اڑسا بے ساختہ اُس کی دھڑکن بے ترتیب ہوئی۔

اُس کے جذبات نے جو شدت پکڑی تھی وہ سیدھا دل آویز کو اپنی دھڑکنوں سے جا کر ٹکراتی محسوس ہوئی اور وہ ٹھٹک کہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ہڑبڑی میں ہاتھ میں پکڑا ابی جان کی تصویر والا فریم زمین پر گر گیا۔ وہ گھبرا کر ذرا پیچھے کو کھسکی میر آہل بھی دو قدم پیچھے ہٹا۔

لمحوں کی بات تھی لہریں کنارے سے ٹکرائیں پھر سمندر میں لوٹ کر غائب ہو گئیں۔

دل آویز نے تکیے کو بھینچ رکھا تھا۔ میر آہل نے جھک کر بی جان کی تصویر کو زمین سے اٹھایا اور افسوس سے دیکھا۔

"میں نے کوشش کی تھی بی جان مگر۔۔۔" الفاظ اندر ہی کہیں ٹوٹ گئے اُس نے فریم کو سائیڈ ٹیبل پر واپس رکھا اور ایک افسوس بھری نگاہ بستر پر سمٹ کر بیٹھی دل آویز پر ڈالی۔ اس کے لئے مزید وہاں ٹھہرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔

☆...☆...☆

اگلی صبح وہ آفس جانے کے لئے نک سک سا تیار دکھائی دیتا تھا۔ دل آویز اس وقت کچن میں تھی جب وہ گلا کھنکارتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ دل آویز تذبذب کا شکار ہوئی۔ اس نے فوراً ہی اپنا رُخ سنک کی جانب موڑ لیا اور بے مقصد ہی سنک میں رکھے برتنوں کو اِدھر اُدھر کرنے لگی۔

کل رات کی جھجک دونوں کے درمیان پہاڑ کی مانند حائل ہو گئی تھی۔

"میں نے جولیانہ کو کہہ دیا ہے" میر آہل نے خود ہی بات کا آغاز کر دیا۔ کل رات جو کچھ بھی ہوا وہ خود بھی کافی شرمندہ تھا۔

"وہ تمہیں آج شاپنگ پر لے جائے گی"

لمحے بھر کی خاموشی

"تاکہ تم یونیورسٹی میں پہننے کے لئے کچھ کپڑے لے لو" ابھی اس کی بات ٹھیک سے مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ دل آویز تیزی سے گھومی آنکھیں جوش سے چمک رہی تھیں۔ رات والی جھجک یکدم ہوا میں دھویں کی طرح تحلیل ہوگئی تھی۔

"سچی؟ آپ نے میرا ایڈمیشن کروادیا ہے؟" وہ سراپا سوال بن گئی۔

مقابل کو سمجھ نہیں آیا کہ جواب میں کیا کہے اس کی گرم جوشی نے آہل کے منہ پر قفل لگا دیا تھا۔

"شکریہ آہل" وہ مسکرائی۔

میر آہل کو لگا اُس کا دل کسی نے مٹھی میں لیا ہے۔

"میں کل آپ سے اِسی حوالے سے بات کرنے آئی تھی" وہ جلدی میں بولنے لگی پھر کسی احساس کے تحت خاموش ہوگئی۔ تکلف کا دائرہ ایک بار پھر وسیع ہوا۔

"ہمم"

وہ بس اتنا کہہ کر کچن سے باہر نکل گیا اور دل آویز ایڑیوں کے بل خوشی سے جھومتی رہی۔

☆...☆...☆

وہ گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھا کھڑکی کے باہر سڑک پر بھاگتی گاڑیاں اور چلتے پھرتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک ہی برمنگھم کا موسم حسین ہوگیا تھا۔ اس کا موبائل اور سیاہ رنگ کے گلاسز پاس ہی رکھے تھے۔ دوسرا ہاتھ کھڑکی سے ٹکائے وہ شہادت کی انگلی اپنی ٹھوڑی پر پھیر رہا تھا۔

سورج کی نرم شعائیں میر آہل کے چہرے پر پڑی تو اس نے آنکھیں موندلیں۔

پس منظر میں وہ گہری کالی گول گول خوبصورت آنکھیں اُبھری۔۔۔ وہ جب مسکراتی تھی تو آنکھ کے کنارے آپس میں سمٹ جاتے تھے۔ گول خوبصورت آنکھیں چھوٹی ہوجاتی تھیں۔

مائیکل بیک ویو مرر سے مسلسل میر آہل کے چہرے پر بکھری نرم سی مسکراہٹ دیکھ رہا تھا۔

میر آہل کو خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ پچھلے بارہ منٹ سے مسلسل مسکرا رہا ہے۔

مائیکل نے غیر ارادی طور پر برابر میں براجمان شوفر پر نظر ڈالی جو خود بھی بیک ویو مرر سے میر آہل کے تاثرات دیکھ کر کچھ حیران نظر آرہا تھا کیونکہ اُسے نہیں یاد کہ اُس نے اپنی نوکری کے کسی بھی دن اس شخص کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی تھی۔

بے اختیار شوفر اور مائیکل کے درمیان ایک خاموش ہنسی کا تبادلہ ہوا۔

میر آہل ان سب سے انجان اب بھی مسکرا رہا تھا۔ کبھی سڑک کے کنارے لوگوں کو دیکھ کر کبھی آسمان کو دیکھ کر تو کبھی آنکھیں موند کر۔ گاڑی سگنل پر رکی تو سڑک کے دوسری جانب اُسے ایک فلاور کارٹ دکھائی دیا۔ جس پر ایک اُدھیڑ عمر کی عورت مختلف قسم کے رنگ برنگے پھول سجائے بیچ رہی تھی۔

لال گلاب کو دیکھ کر نا جانے کیوں میر آہل کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی۔

"سر آپ کہیں تو گاڑی سائیڈ پر رُکواؤں؟"

"ک۔۔۔ کیوں" اُس نے چونک کر آگے بیٹھے مائیکل کو دیکھا جواب آدھا گھوما ہوا تھا۔

"وہ پھول۔۔۔!! آپ کہیں تو ایک بُوکے گھر بھجوا دیتا ہوں" اُس نے آنکھ کے اشارے سے کارٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے رضامندی چاہی۔۔۔ چہرے پر شرارتی سی مسکراہٹ اُمڈ رہی تھی۔ جس پر وہ بمشکل قابو پا رہا تھا۔

"ہمم۔۔۔ شیور" میر آہل کو اس پورے دورانیے میں پہلی بار اپنی غائب دماغی کا احساس ہوا تھا۔

"اوکے سر" اس نے فٹافٹ سیٹ بیلٹ کھولی اور گاڑی سے اُترنے لگا۔ ابھی اس نے ایک قدم باہر رکھا ہی تھا کہ میر آہل نے اُسے مخاطب کیا۔

"میرے آفس پہنچنے سے پہلے تم مجھے ایک فریش روز بوکے کے ساتھ دروازے پر دکھنے چاہئے ہو۔۔۔ مائیکل؟"

مائیکل کی ہنسی گُل ہوئی۔

سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اُسے میر آہل کی بات سمجھ آگئی تھی۔

"got it boss" اس نے مسکینی شکل بنا کر میر آہل کو دیکھا۔

"اور اگر مجھے پتا چلا کے تم نے پبلک ٹرانسپورٹ کا استعمال کیا ہے آفس پہنچنے کے لئے تو۔۔۔" اس نے جملا دانستہ طور پر ادھورا چھوڑ دیا کیونکہ مقابل سمجھ چُکا تھا اور فلحال یہی کافی تھا۔

"جی سر ویسے بھی ڈاکٹر نے مجھے واک کرنے کا مشورہ دیا ہے" وہ رونی صورت بناتے ہوئے بولا۔

"Don't be late Michael you know i hate unpunctuality"

وہ اب سیاہ چشمہ آنکھوں پر ٹکا کر رُخ دوسری جانب موڑ چکا تھا۔ بلا کی شانِ بے نیازی تھی۔

شوفر نے مسکراہٹ دباتے ہوئے ریس پر پاؤں رکھا اور گاڑی مائیکل کے چہرے پر دھوا چھوڑتی آگے بڑھ گئی۔

☆...☆...☆

اورنگزیب عالم گھر میں داخل ہوئے تو گھر کی حالت دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ گھر کی ایک بھی چیز سلامت نہیں تھی اور جو رہ گئی تھیں وہ اینا سلامت چھوڑنے نہیں والی تھی۔

"مِس زیبی یہ گھر کی کیا حالت بنا رکھی ہے" وہ نظریں اطراف میں گھماتے ہوئے بول ہی رہیں تھے کہ اوپر سے ایک لیمپ اُڑتا ہوا آیا اور اورنگزیب عالم کے عقب سے گزرتا ہوا سامنے دیوار پر جا لگا۔

وہ بروقت سائیڈ میں نہ ہوتے تو شکل کا نقشہ سلامت نہیں رہتا۔

"بے بی کل سے بہت دُکھی ہیں۔۔۔ جب سے شوپنگ سے آئی ہیں روئے جا رہی ہیں" زیبی کے چہرے پر پریشانی عیاں تھی۔

انہوں نے نظر اٹھا کر اینا کے کمرے کا دروازہ دیکھا منٹ کے ہزارویں حصے میں انہیں ساری کہانی معلوم ہو گئی تھی کہ اینا کیوں دُکھی تھی۔

انہوں نے اس وقت کو کو ساجب اورنگزیب عالم نے اینا کو اپنی کمپنی کے پراڈکٹ لانچ ایونٹ پر زبردستی چلنے پر اسرار کیا تھا۔ میر آہل سے اینا کی ملاقات اُسی ایونٹ پر ہوئی تھی۔

انہوں نے خفگی سے ماتھے کو چھوا اور پاس رکھے سنگل صوفے پر بیٹھ گئے۔ پچاس سال کی زیبی (جو پچھلے بائیس سال سے اورنگزیب عالم کے گھر میں ملازمت کر رہی تھیں) کو اپنے مالک کی حالت پر افسوس ہوا۔

اینا جب ڈھائی سال کی تھی جب مسز اورنگزیب عالم کا انتقال ہو گیا تھا۔تب وہ اینا کی نینی کی حیثیت سے اس گھر میں آئی تھیں۔ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔اِسی لئے انہوں نے اینا کو اپنی سگی اولاد سے بڑھ کر پالا تھا۔

ایک لوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے وہ اورنگزیب عالم کی لاڈلی بیٹی تھی اور ماں کی قصر زیبی نے پوری کر دی تھی۔ وہ باپ کے بعد ہمیشہ سے زیبی کے کافی نزدیک رہی تھی۔

"سر آپ کے تو مسٹر میر آہل سے اچھے تعلقات ہیں" زیبی کافی دیر سوچنے کے بعد بولیں۔

" صحیح کہا اچھے تعلقات ہیں مگر رشتے داری نہیں ہے اور ویسے بھی میر آہل بہت پروفیشنل آدمی ہے" وہ مزید خفا ہوئے۔

"کیا آپ بے بی کے لئے کوشش نہیں کر سکتے۔میں انہیں اس طرح نہیں دیکھ سکتی" زیبی کا لہجہ بھیگ گیا تھا۔

" دیکھ تو میں بھی نہیں سکتا اب۔۔۔شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔وہ میرا بزنس پارٹنر ہے وہ میری بات یقیناً سمجھے گا" وہ کوٹ کا بٹن مقفل کرتے ہوئے صوفے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔دل آپ سے کیا کچھ نہیں کرواتا وہ بادل نخواستہ میر آہل سے اس موضوع پر دوٹوک گفتگو کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

طوفان تھم گیا تھا گھر میں سکوت طاری ہو چکی تھی مگر یہ خاموشی زیادہ دیر کے لئے نہیں تھی۔

☆...☆...☆

میر آہل آج خلاف توقع گھر وقت سے پہلے پہنچ گیا تھا۔ہمیشہ کی طرح وہ فریش ہو کر کچھ وقت اپنے اسٹڈی روم میں کتابوں کے درمیان گزارتا تھا۔

کتابوں کا مطالعہ کرنا اس کے باقی شوق میں سے ایک تھا مگر آج اتفاق سے وہ لاؤنج میں ٹی وی کے سامنے بیٹھا کافی پی رہا تھا۔

یوں ہی بے مقصد چینل سرفنگ کرتے ہوئے وہ گاہے بگاہے دل آویز کے کمرے کے بند دروازے پر نظر ڈال لیتا۔جو بلکل اس کے پیچھے تھا۔

"حیرت آج کچن میں اتنا سکون کیسے ہے" اس نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے سوچا۔

وہ ایک عرصہ اس گھر میں ملازموں کے درمیان تنہا رہا تھا پر پھر بھی نا جانے کیوں آج اُسے یہ تنہائی بہت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

اسی وقت ایک ملازم ٹرے تھامے لاؤنج میں داخل ہوا۔

"ہمم" اس نے آہستگی سے گلا صاف کیا۔

ملازم بنا کوئی دھیان دیئے اِسی اطمینان سے ٹرے میں رکھے سینڈوچز اور اسنیکس ٹیبل پر سجاتا رہا۔

"پوچھ لیتا ہوں میڈم آج کہاں ہیں کیا فرق پڑتا ہے" اس نے کافی کا آخری گھونٹ حلق میں اتار کر کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے سوچا۔

ملازم نے کافی کا خالی کپ اٹھا کر ٹرے میں رکھا۔

"نہیں چھوڑو مجھے کیا۔۔۔وہ جہاں بھی ہو" اس نے خفگی سے سر جھٹکا۔

ملازم واپس جانے ہی لگا تھا کہ میر آہل نے نا چاہتے ہوئے بھی اُسے پیچھے سے آواز دے دی۔

"پیٹر"۔۔۔ملازم جاتے جاتے فوراً رُکا اور "یس سر" کہتے ہوئے وہی قدم جما دیئے۔

"کافی اچھی تھی" اس نے تمہید باندھی۔

ملازم نے حیرت سے میر آہل کو دیکھا پیٹر آٹھ سال سے یہاں ملازمت کر رہا تھا اور ان آٹھ سالوں میں یہ پہلی بار تھا کہ میر آہل نے اُس کی بنائی ہوئی کافی کی تعریف کی تھی۔

"ٹ۔۔ٹھیک یو سر" وہ حیرانگی اور خوشی کے ملے جُلے تاثرات لئے بولا۔

"اور یہ سینڈوچ" آہل نے آگے بڑھ کر پلیٹ میں رکھے سینڈوچز میں سے ایک ٹکڑا اٹھایا" یہ سینڈوچ بھی بہت اچھا بنایا ہے تم نے" اس نے ایک اور بات بنائی۔

کیا اپنی بیوی کے بارے میں گھر کے ملازموں سے پوچھنا اتنا مشکل تھا۔ آخر کو وہ اُس کی اپنی پرسنل بیوی تھی کسی پڑوسی کی تو نہیں جو وہ اتنا جھجک رہا تھا۔ اس نے سوچا۔

"شکریہ سر" اس بار پیٹر ہلکا سا مسکرایا

"وہ۔۔۔ میڈم دکھائی نہیں دے رہیں۔۔۔ کدھر ہیں؟" ایک بڑا سا پتھر اپنی انا پر رکھتے ہوئے اس نے آخر وہ سوال پوچھ ہی لیا۔

"میڈم مس جولیانہ کے ساتھ شوپنگ کرنے گئی ہیں" وہ بولا

"اوہ" میر آہل کے منہ سے نکلا سمجھو انا کا جنازہ نکل گیا۔

"سر آپ کو کچھ اور چاہیے" پیٹر نے اجازت چاہی۔

"نو پیٹر ٹھیک یو" میر آہل نے بچا ہوا سینڈوچ پلیٹ میں رکھ دیا جیسے منہ کا ذائقہ ہی بگڑ گیا ہو۔

"آہ میرے ذہن سے کیسے نکل گیا" اس نے ماتھے کو بے ساختہ چھوا۔

آج صبح ہی وہ دل آویز کو جولیانہ کے ساتھ شاپنگ پر جانے کی ہدایت دے رہا تھا پھر شام تک اتنی چھوٹی سی بات اس کے ذہن سے کیسے نکل گئی تھی۔ میر آہل چیزیں بھولتا تو نہیں تھا پھر آج کیسے بھول گیا تھا۔

کیا اُسے دل آویز کی موجودگی کی عادت ہو رہی تھی؟ آج سے پہلے اُس نے کبھی کسی کی عدم موجودگی کا نوٹس نہیں لیا تھا۔

کچھ چیزیں واقعی زندگی میں پہلی بار ہوتی ہیں اور انسان کو حیرت کے گہرے کنویں میں دھکیل دیتی ہے۔ میر آہل کے لئے اُس کی خود کی ذات پہلے تھی مگر اب کوئی اور بھی تھی جسے وہ غیر دانستہ طور پر خود سے آگے رکھنے لگا تھا۔

یہ سب وہ جان بوجھ کر یہ کسی ذمہ داری کو نبھانے کے تحت نہیں کر رہا تھا۔ یہ سب خود بخود ہو رہا تھا۔

وہ بدل رہا تھا اور اس بات کا پتا اُسے خود بھی نہیں تھا۔

☆...☆...☆

"کتنے دن ہو گئے ریما کھوئی کھوئی سی رہتی ہے۔ جب سے بی جان اس دنیا سے رخصت ہوئی ہیں۔ ریما نے ہنسنا بولنا چھوڑ دیا ہے اب تو اپنے کمرے سے بھی باہر نہیں نکلتی وہ" میر خلیل نیپکن سے ہونٹ تھپتھپاتے ہوئے بولے اور زلیخا کا پلیٹ میں چمچہ گھماتا ہاتھ تھم گیا۔

انہوں نے طائرانہ نظر میر خلیل کے سپاٹ چہرے پر ڈالی ناجانے وہ اُن کے چہرے پر کونسا رنگ ڈھونڈ رہی تھیں۔

"میں خود ریما سے بات کروں گا کیوں وہ اتنی اداس اور کھوئی کھوئی سی رہنے لگی ہے" انہوں نے پُرسوچ انداز میں کہا

" کبھی اپنے بیٹے کا بھی سوچ لیا کریں ہر وقت بیٹی کا نام جپتے رہتے ہیں" وہ خفا ہوئیں۔

" آپ اپنے بیٹے کی بات میرے سامنے نہ کریں تو بہتر ہو گا زلیخا۔۔۔ گاؤں بھر میں رسوا کر کے رکھا ہے آپ کے لاڈلے نے" وہ برہم ہوئے۔

"کل شراب کے نشے میں دُھت شیر و کی بیٹی کو گھاٹ کے کنارے چھیڑا ہے اس نے اور ابھی پچھلے ہفتے کی بات ہے گاؤں کے چوک پر ایک شریف آدمی کو مارا ہے تمہارے شریف زادے نے" انہوں نے نیپکن ٹیبل پر پٹخنے والے انداز میں رکھا۔

"ہاں تو لڑکا ہے گرم خون ہے" زلیخا نے شان بے نیازی سے کندھے اُچکائے۔

"لڑکا ہے اور ایک لڑکے پر لڑکی سے زیادہ ذمہ داری ہوتی ہے۔ وہ معاشرے کا رکھوالا ہوتا ہے۔ ایک عورت اگر نسلیں سنوارتی ہے تو مرد اس نسل کو چلاتا ہے اور یہ اس کا فرض ہے کہ وہ اس نسل کو سیدھے راستے پر چلائے" میر خلیل کا چہرہ غصے سے لال بھبھوکا ہو چکا تھا۔ وہ مزید کچھ کہے بغیر کرسی پیچھے کھسکاتے ہوئے فوراً سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اونہوں۔۔۔ نو سوں چوہے کھا کر بلی چلی حج کو" زلیخا کینہ پرور نظروں سے انکی چوڑی پشت کو گھورتے ہوئے منمنائی۔

☆...☆...☆

وہ ناجانے کتنی دیر لاؤنج میں بیٹھا رہا بظاہر نظریں سامنے ٹی وی پر تھیں۔ جہاں ایک ٹاک شو چل رہا تھا مگر اس کا دھیان صرف دروازے پر تھا۔ سیکنڈز منٹ میں تبدیل ہوئے اور منٹ نے گھنٹوں کی شکل اختیار کی وہ چار بجے گھر

آیا تھا اور اب آٹھ بج رہے تھے۔ اس دوران ملازم دو بار رات کے کھانے کا پوچھنے آیا تھا مگر اس نے دونوں بار انکار کر دیا۔ یوں ہی بیٹھے بیٹھے نا جانے کب ذہنی رو بھٹکی۔

("جی مسٹر آہل بات کر رہے ہیں؟" بھاری بھر کم آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔

"جی مگر آپ کون بات کر رہے ہیں اور میرے بابا جان کا فون آپ کے پاس کیسے" اس کے ماتھے پر بل پڑے۔

"مسٹر آہل میں پولیس آفیسر فُرقان یار خان بات کر رہا ہوں۔ آپ کے بابا جان اور والدہ کا ایک ایکسڈنٹ میں انتقال ہو گیا ہے۔ برائے مہربانی مطلوبہ پتے پر پہنچ جائے" مقابل سرسری انداز میں بات مکمل کر کے کال منقطع کر چکا تھا پر میر آہل کو لگا دنیا کا نظام درہم برہم ہو گیا ہے۔

اُسے اپنی سماعتوں پر اعتبار نہیں ہوا تھا۔ وہ بے حس و حرکت کچھ لمحے صدمے کی کیفیت میں موبائل کی تاریک اسکرین کو گھورتا رہا تھا۔

زندگی کے کسی بھی حصے میں آہل نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ ایک دن اُس کے جان سے عزیز ماں باپ اُسے دشتِ زندگی کے اس سفر میں تنہا چھوڑ جائے گیں۔)

لکڑی کے دروازے کی کُھلنے کی آواز نے طلسم توڑا تھا اور میر آہل نے چونک کر دروازے کی سِمت دیکھا اور پھر فوراً سیدھا ہوا۔ دل آویز اور اس کے پیچھے جولیانہ بیرونی دروازے سے اندر داخل ہو رہی تھیں۔ ساتھ ہی ایک ملازم چند شوپنگ بیگز تھامے دل آویز کے کمرے کی جانب جا رہا تھا۔

میر آہل کو یوں لاؤنج میں بیٹھا دیکھ دل آویز کے قدم سست ہوئے۔ پیچھے جولیانہ بھی رُک گئی۔

"ہیلو سر" وہ شائستگی سے مسکرائی۔

"ہیلو" وہ دونوں ہاتھ ٹراؤزر کی جیب میں مقید کئے دل آویز کو دیکھتے ہوئے بولا

"کافی دیر لگا دی آپ لوگوں نے شاپنگ کرنے میں" وہ دھیمی مگر مضبوط آواز میں رسان سے بولا۔

"سوری سر بٹ میم اِز ویری پِکی" جولیانہ کچھ ہچکچاتے ہوئے بولی تو دل آویز نے فوراً سے گردن ترچھی کر کے جولیانہ کو گھور کر دیکھا، جس پر جولیانہ نے بنا آواز کے محض اشارے سے "سوری" کہا۔

میر آہل دل آویز کے اس معصوم سے غیر ارادی عمل پر مسکرایا جسے نہ تو جولیانہ نے نوٹس کیا اور نہ دل آویز نے۔

دل آویز کا ہر انداز تسخیر کر لینے کی طاقت رکھتا تھا۔ وہ لمحے بھر کے لئے اِس حسین سراپے کے سحر میں مبہوت ہوا۔

جولیانہ نے چونک کر میر آہل کو دیکھا جو مبہوت سا دل آویز کو تکتا چلا جا رہا تھا مگر دل آویز اب بھی جولیانہ کو خفگی سے گھورنے میں مصروف تھی۔

"میم" جولیانہ نے دل آویز کو آنکھ کے اشارے سے اُس طرف دیکھنے کو کہا جہاں میر آہل کھڑا تھا۔

اس نے جولیانہ کے اشارے کے تعاقب میں گردن دوبارہ موڑی ہی تھی کہ ملازم نے اُسی لمحے آہل کو مخاطب کیا۔

"سر کھانا لگوا دوں اب؟"

"ہاں کیا؟" میر آہل نے چونک کر ملازم کو دیکھا وہ دل آویز کو اتنی مبہوت سے دیکھ رہا تھا کہ اُس نے ملازم کی بات سُنی ہی نہیں تھی۔

"سر آپ نے کہاں تھا نہ آپ کھانا میڈم کے آنے کے بعد کھائے گے تو کھانا لگوا دُوں" ملازم نے کچھ دیر پہلے میر آہل کے کہے گئے الفاظوں کو معصومیت سے دہراتے ہوئے آہل کی جانب اجازت طلب نظروں سے دیکھا اور میر آہل کا دل کیا کہ وہ اس ملازم کو چھت سے الٹا لٹکا کر دو چھتر لگائے۔

دل آویز نے نظر اٹھا کر سامنے کھڑے سیاہ ٹراؤزر اور ٹی شرٹ میں ملبوس شخص کی جانب دیکھا۔

میر آہل کی نظر ملازم کی طرف تھی مگر اس نے دل آویز کی کالی گہری آنکھوں کی گرمائش اپنے وجود پر محسوس کی تھی۔

"ہمم لگوا دو" مختصر سا جواب دے کر وہ وہاں رُکا نہیں تھا فوراً سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔

ملازم کے پوچھنے پر اس نے یہ کہہ تو دیا تھا کہ کھانا وہ دل آویز کے آجانے کے بعد ہی کھائے گا مگر اُسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ بات اس طرح سے دل آویز کے سامنے آجائے گی۔

"وہ کیا سوچ رہی ہو گی کہ میر آہل اب اس کے بغیر کھانا بھی نہیں کھاتا" وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دھیمی آواز میں بڑبڑایا۔

☆...☆...☆

"میم کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں؟" ملازم نے پانی کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"نو تھینک یو آپ جاسکتے ہیں" اس نے پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے اُسے جانے کو کہا، پھر خود ہی کسی احساس کے تحت اُسے آواز دے کر روکا۔

"سُنئے!"

"یس میم"

دل آویز کے پکارنے پر ملازم جاتے جاتے روبوٹ کی طرح پیچھے مڑا۔

"سر آج آفس سے گھر کب آئے" اس نے لہجہ سرسری سا بنا کر پوچھا۔

"میم سر آج چار بجے ہی گھر آگئے تھے" ملازم نے مودبانہ انداز میں جواب دیا۔

"اچھا" کہہ کر اس نے چند لمحے کا وقفہ دیکر دوبارہ پوچھا۔

"میرے بارے میں پوچھ رہے تھے؟؟" ناجانے کس احساس کے تحت اس نے یہ بیوقوفانہ سوال پوچھ لیا۔

"جی میم سر آپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے کہ آپ کہاں ہیں تو میں نے اُنہیں بتادیا کہ آپ جولیانہ میڈم کے ساتھ شاپنگ پر گئی ہیں۔" ملازم نے صاف گوئی سے ساری بات اس کے گوش گزار کی۔

"اوہ۔۔اور انہوں نے رات کا کھانا کیوں نہیں کھایا اب تک؟" اس نے مزید کُریدا۔۔۔

"انہوں نے منع کر دیا تھا کھانا کھانے سے، وہ آپ کے آنے کے بعد کھانا کھائے گے بس اتنا ہی کہا تھا"

"اچھا آپ جا کر کھانا لگوائیں" اس نے پانی کا گلاس لبوں سے لگایا۔

"اوکے میم" ملازم کہہ کر چلا گیا۔

دل آویز کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔۔۔کچھ دیر وہ یوں ہی بیڈ پر پانی کا گلاس تھامے بیٹھی سوچتی رہی تھی۔

اُس کے لئے میر آہل کا یہ انداز بلکل ہی غیر متوقع تھا۔میر آہل کا اُس کی غیر موجودگی کو محسوس کرنا دل کو گُدگدا دینے جیسا تھا۔

☆...☆...☆

اگلی صبح جب وہ ناشتہ کر کے ڈائننگ ہال کا دروازہ پار کر کے لاؤنج میں داخل ہوا تو دل آویز کو پاکستانی لباس میں یونیورسٹی کے لئے نک سک سا تیار دیکھ کر وہ کرنٹ کھا کر رُکا۔اتنے میں جولیانہ بیرونی دروازے کو کھول کر اندر داخل ہوئی اور انٹرنس پر ہی رُک گئی۔

میر آہل نے ٹائی ناٹ کو آرام سے چھوتے ہوئے ایک نظر سر سے پاؤں تک دل آویز کو دیکھا۔

دل آویز نے ہلکے گلابی رنگ کی فلورل کُرتی اور آف وائٹ رنگ کے ٹراؤزر کے ساتھ گلابی، جامنی اور پیلے رنگ کے اِمتِزاج کا فلورل ڈوپٹہ دونوں کندھوں پر اچھے سے لے رکھا تھا۔

لمبے سلکی بالوں کو نیچے سے تھوڑا سا سوفٹ کرل کر کے پشت پر چھوڑ دیا تھا اور میکپ کے نام پر اس نے آنکھوں میں کاجل اور ہلکی سی لپسٹک لگا رکھی تھی۔ہائی ہیلز کی جگہ سمپل میچنگ رنگ کے سلیپرز پہن رکھے تھے۔

کاجل نے کالی گہری آنکھوں کو مزید دلکش بنا دیا تھا۔

میر آہل چند لمحے دل گرفتگی سے اُسے دیکھتا رہا وہ واقعی سحر آفریں لگ رہی تھی۔

"اہم اہم "وہ آہستگی سے کھانسا

"آپ تو کل شاپنگ پر گئی تھیں رائیٹ "اس نے باری باری دل آویز اور جولیانہ کو دیکھا۔

"جی "دل آویز نے تُھوک نگلا اور جولیانہ نے افسوس سے سر اثبات میں ہلایا اب وہ میر آہل کو کیا بتاتی کے چار گھنٹے مختلف آوٹ لیٹز کے چکر کاٹنے کے بعد بھی دل آویز کو ایک بھی ویسٹرن ڈریس پسند نہیں آیا تھا یا یہ کہنا زیادہ مناسب تھا کہ وہ اُن کپڑوں میں کمفرٹیبل محسوس نہیں کر رہی تھی۔اس لئے وہ سارے کے سارے ایسٹرن ڈریسز

خرید لائی تھی۔ جو بہت مشکل سے ہزاروں مالز اور دُکانوں میں ڈھونڈنے کے بعد اُسے کسی پاکستانی کپڑوں کے آؤٹ لیٹ سے ملِے تھے۔ اِسی لئے انہیں کل شاپنگ میں اتنی دیر ہو گئی تھی۔

میر آہل نے انگلی سے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے جواب طلب نظروں سے دوروازے کے پاس کھڑی جولیانہ کو دیکھا۔ آہل کا دوسرا ہاتھ جیب میں مقید تھا اور وہ گردن کو ہلکا سا خم کئے مستفسر نظروں سے جولیانہ کو گھور رہا تھا۔ جواباً جولیانہ نے معزرت خواہ انداز میں سر کر زنبش دی گویا کہہ رہی ہو کہ اس میں اُس کی بلکل بھی غلطی نہیں۔

"کیا یہ کپڑے یونیورسٹی میں پہننے کے لئے مناسب نہیں ہیں؟" وہ بُجھے انداز میں گویا ہوئی۔ کالی گول گول گہری سوالیہ آنکھیں میر آہل کے مضبوط سراپے کا طواف کرنے لگیں۔

میر آہل نے ہتھیار ڈال دیئے۔

"No it's perfect" اُس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔۔۔ اس لمحے اس پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ پوری دنیا کو اپنی انگلی پر نچا سکتا ہے مگر سامنے کھڑی اس لڑکی سے کبھی نہیں جیت سکتا۔

دل آویز کے اداس چہرے پر خوشی کا رنگ چمکا تھا۔ خاموش گہری آنکھوں میں یکدم رنگوں کی بہار آگئی۔ پر اپنے نازک وجود پر میر آہل کی آنکھوں کو مرکوز دیکھ کر دل آویز نے اپنی ریشمی پلکیں جھجک کر گِرا دیں۔

وہ لوگ ساتھ ساتھ بیرونی دروازے کو عبور کر کے باہر آئے تھے جہاں دو گاڑیاں اور مائیکل اُن کے منتظر تھے۔

شوفر نے میر آہل کے لئے کار کی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا تھا۔

جولیانہ اور دل آویز دوسری گاڑی کی جانب بڑھ گئیں۔ میر آہل کا ایک ہاتھ دروازے کے اوپر تھا جب اس نے مڑ کر شوفر سے کہا "میں دل آویز کو آج خود یونیورسٹی ڈراپ کرونگا" وہ سیاہ چشمہ آنکھوں پر ٹکا چُکا تھا۔ اگلی نشست پر بیٹھتے ہوئے مائیکل نے رُک کر باری باری وہاں موجود ہر شخص کو دیکھا۔

جولیانہ اور دل آویز بھی گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے رُک گئیں۔ یکدم سب رُک کر خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"آپ سب اتنے خاموش کیوں ہو گئے ہیں۔۔۔ کیا میں نے کچھ ایسا کہہ دیا جو نہیں کہنا چاہئے تھا؟" میر آہل کو تعجب ہوا کہ اس نے ایسا کیا کہہ دیا کہ سب اپنی اپنی جگہ فریز ہو گئے ہیں۔ اُن سب کا چونکنا حیران کُن تھا مگر میر آہل میں آتی اس تبدیلی سے زیادہ نہیں۔

دل آویز خاموشی سے میر آہل کی گاڑی کے جانب بڑھی۔۔۔ مائیکل بھی اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھنے لگا اور شوفر بھی اپنی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے لگا جب سب ایک بار پھر حیرانگی سے چونکے۔

"میں۔۔۔ دل آویز۔۔ کو۔۔ خود۔۔ یونیورسٹی ڈراپ کرونگا" ہر لفظ ٹھہر ٹھہر کر ادا کرتے ہوئے میر آہل نے ٹھنڈے انداز میں آنکھ پر ٹِکا چشمہ اُتارا تو سب یکدم کیجول موڈ سے نکل کر حرکت میں آئے۔

شوفر نے فوراً سے میر آہل کے لئے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا۔۔۔ مائیکل بھی فوراً میر آہل کی بات کو سمجھ کر راستہ چھوڑتے ہوئے مودبانہ انداز میں دل آویز کے لئے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔

ٹھک۔۔ ٹھک۔۔۔ ٹھک۔۔۔ سب کچھ سیکنڈز میں ہوا۔

میر آہل چشمہ دوبارہ پہنتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دل آویز بھی دھڑکتے دل کے ساتھ چُپ چاپ میر آہل کے برابر آکر براجمان ہو گئی۔

ان کی گاڑی مین دروازے کو عبور کر چکی تھی۔

"تبدیلی آ نہیں رہی ہے تبدیلی آ گئی ہے" مائیکل نے پیچھے سے ان کی گاڑی کو دیکھتے ہوئے زیر لب کہا تھا۔ اُس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔۔۔ میر آہل کی زندگی نے یکدم 360 اینگل کا ٹرن لیا تھا جو کسی بھی تھرل مُووی سے کم نہیں تھا۔

☆...☆...☆

"تم نروس تو نہیں ہو" میر آہل کو نا جانے کیوں یہ خاموشی اتنی بے چین کر رہی تھی حالانکہ وہ خود بہت کم گو اور خاموش انسان تھا۔

"یہاں آپ کے ساتھ بیٹھنے سے زیادہ نہیں" اس نے یہ دل میں سوچا تھا مگر منہ سے محض جواب میں "نہیں" کہا تھا۔ خاموشی ایک بار پھر پہاڑ کی طرح حائل ہو گئی تھی۔

"آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو۔۔۔"

"مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں" اچانک ہی دل آویز کے لہجے میں استحقاق آیا تھا۔

"میری بھی نہیں" میر آہل نے بریک پر زور سے پاؤں رکھا تھا۔ گاڑی سگنل پر جھٹکے سے رُکی تھی۔ یہ سوال تھا یا وہ اُسے آگاہ کر رہا تھا۔

دل آویز نے چونک کر اُس کے روشن چہرے کو دیکھا وہ تمام تر توجہ اُسی پر مرکوز کئے ہوئے تھا۔

اس کی سحر انگیز نگاہوں نے ایک پل کے لئے دل آویز کو حصار میں لیا۔ وہ اپنے دل کی دھڑکن اپنے کانوں میں سُن سکتی تھی اور میر آہل اپنے دل میں۔۔۔

اچانک ماحول میں پھیلا سحر زائل ہوا۔ سگنل کھل چُکا تھا اور پیچھے کی تمام گاڑیوں نے ہارن پیٹنا شروع کر دیا۔ میر آہل نے خجالت سے پاؤں ریس پر رکھ دیا۔

☆...☆...☆

کمرہ اندھیرے کی زد میں تھا۔ کمرے کی چھت تک جاتی کھڑکیوں پر پردے پڑے تھے یوں کہ سورج کی روشنی اندر داخل نہیں ہو پا رہی تھی۔

زلیخا بنا چاپ کے خاموش کمرے کا دروازہ کھول کر وہی دروازے پر ہی کھڑی ہو گئیں۔ ان کی پشت سے روشنی پھوٹ رہی تھی جو سامنے زمین پر انکا عکس کھینچ رہی تھی۔

انہوں نے دیوار پر ہاتھ مارا تو یکدم تاریک کمرہ روشنی میں نہا گیا۔ ریما اچانک روشنی آنکھ پر پڑنے کی وجہ سے جھنجھلائی۔

"اور کتنے دن چلے گا تیرا یہ ڈرامہ" زلیخا دروازہ مقفل کر کے فوراً بستر کے پاس آئیں جہاں وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے گم صم سی بیٹھی تھی۔

جواباً اس نے خالی خاموش نظروں سے زلیخا کو دیکھا تو وہ فوراً خجالت سے بولیں۔

"دیکھ میں نے جو بھی کیا تیری خوشیوں کے لئے کیا" وہ مصنوعی اپنائیت سے اس کے گال کو چھونے لگیں۔ مگر ریما نے فوراً اپنا منہ پیچھے کر لیا۔

"میری خوشی کے لئے کیا تھا آپ نے یہ سب اماں؟" آج نا جانے کتنے دنوں بعد ریما کے منہ سے آواز نکلی تھی۔

"یہ اپنی محرومی اور شکست کا بدلہ لینے کے لئے کیا تھا آپ نے یہ سب" وہ سراپا سوال بن گئی۔

"اب تو اپنی ماں کو الظام دیگی۔۔۔تجھے کیا پتہ کہ میں نے اس حویلی میں کتنے ظلم سہے ہیں" وہ پللو سے آنکھ میں آئی نمی کو خشک کرتے ہوئے بولیں۔

"انسان جو بوتا ہے اماں وہی کاٹتا ہے اور کبھی کبھی تو اُس کے ساتھ اس کی اولاد کو بھی اپنے ماں باپ کے گناہوں کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے" وہ خالی نظروں سے بستر کی پائنتی کو گھورتے ہوئے بولی دونوں ہاتھ گود میں بے جان حالت میں پڑے تھے۔

"مجھے آپ کا رویہ دل آویز کے ساتھ کبھی غیر منصفانہ نہیں لگا میں ہمیشہ یہ سوچتی رہی کہ شاید اس طرح آپ اپنے غم بھول جائے گی یہ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں کمی آجائے گی مگر ایسا نہیں ہوا آہستہ آہستہ آپ کا رویہ دل آویز، بی جان اور یہاں تک کہ میرے ساتھ بھی سخت سے سخت ہوتا چلا گیا" وہ رُکی اور ایک دل برداشتہ سی سانس ہوا میں خارج کی "مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ اپنی نفرت میں انسانیت کے درجے سے اتنا گر جائے گی کہ" اس کی آواز بھر آئی اس نے گردن جھکا کر گود میں پڑے اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھا

"دیکھیں اماں میرے ہاتھ خالی ہیں" اس نے ہتھیلیاں زلیخا کے سامنے پھیلا دیں۔

"آپ آہل کو دل آویز کے نصیب سے چُرا کر میری قسمت کی لکیروں میں لکھ دینا چاہتی تھیں نہ؟ مگر دیکھیں یہ اب بھی خالی ہیں اور آپ اماں" وہ بستر سے اٹھ کر دیوار کی طرح زلیخا کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

"آپ کو اپنے ہاتھ میں کیا دِکھتا ہے اماں؟" زلیخا ایک قدم پیچھے ہٹی ریما کی سرگوشی کرتی آواز کمرے میں ہیجان پیدا کر رہی تھی۔

"آپ کو اپنے ہاتھوں میں خون نہیں دکھتا اماں؟ آپ اتنی مطمئن کیسے ہیں؟" اُس کی آنکھیں آہستہ آہستہ سُرخ ہونے لگی جیسے ان میں سے خون رسنے لگا ہو۔

"یہ وہ خون ہے اماں جس میں آپ میں اور یہ پوری حویلی ڈوب جائے گی کوئی نہیں بچے گا اس میں" وہ بولتے بولتے زلیخا کے قریب جانے لگی تو زلیخا خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹنے لگیں۔

"میری بچی تجھے کیا ہو گیا ہے سب ٹھیک ہو جائے گا" وہ ریما کے تاثرات دیکھ کر گھبرا گئیں۔

"آپ کے ہاتھ میں بی جان کا خون ہے اماں اب کچھ ٹھیک نہیں ہو سکتا" ریما نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچ لئے۔

"میری بچی۔۔۔ خلیل صاحب، کریم جلدی سے آؤ سب" وہ چیخنے لگیں اور نڈھال ہوتی ریما کو بازوؤں سے تھاما جو زلیخا کے بانہوں میں جھول گئی تھی۔

وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں بڑبڑاتے بڑبڑاتے لاشعوری میں داخل ہو گئی۔

☆...☆...☆

دل آویز نے نظر اٹھا کر دیکھا تو نظر تھک گئی مگر ایسٹن یونیورسٹی (ختم نہیں ہوئی اُسے لگا جیسے برمنگھم شہر میں ایک اور چھوٹا سا شہر بسا ہوا ہے۔ مختلف مذہب اور تہذیب کے لوگوں کا ایک میلہ سا لگا ہوا تھا جو ادھر سے اُدھر ہنستے مسکراتے گھوم رہے تھے۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی تھیں۔

بہت سے لوگ چھوٹے بڑے جُھنڈ کی صورت یہاں سے وہاں منڈلاتے دِکھ رہے تھے۔

وہ ایسٹن کی مرکزی عمارت کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے ارد گرد ہرا سبزہ تھا۔ وہ سڑک کے درمیان چلتی اپنے آس پاس گھومتے لوگوں کو گردن گھما گھما کر دیکھ رہی تھی جو پہلے سے ہی اُسے گھور رہے تھے۔ اُن کی گھورتی نظروں نے دل آویز کو الجھن میں ڈال دیا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بینچ نصب تھی۔

مرکزی عمارت کا داخلی دروازہ ایسٹن اسٹریٹ سے وسیع پکی جگہ تک قابل رسائی تھا۔ مرکزی دروازوں کی طرف جانے والی دو ڈھلوانیں تھیں، دونوں طرف سجاوٹ کے لئے واٹر فاؤنٹین لگے ہوئے تھے۔

آسٹن اسٹریٹ کے مرکزی دروازے پر دو بیرونی، آٹو میٹک، سلائیڈنگ اور ڈبل ڈور تھے جن پر سفید نقطے والی لکیریں تھیں۔ بیرونی دروازوں کے ابتدائی سیٹ سے اندرونی دروازوں سے گزرنے کے لیے 90 ڈگری کا موڑ تھا اور مین استقبالیہ، مرکزی دروازے کے اندر واقع تھا۔ یہ 110 سینٹی میٹر اور 74 سینٹی میٹر کی اونچائی پر ایک کاؤنٹر تھا۔

دل آویز نے گہری سانس لی اور مرکزی گزر گاہ کی طرف قدم بڑھا دیئے اس سے پہلے کے وہ دروازہ پار کرتی ایک چوبیس سے پچیس سال کا لڑکا اسکیٹ بورڈ پر رینگتا ہوا آیا اور اس کے سامنے سے گزرا۔

دل آویز کا توازن بگڑا اور اس کی کتابیں زمین پر ِگر پڑیں جو اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھیں۔ وہ لڑکا تھوڑے فاصلے پر جا کے رُک گیا اور اسکیٹ بورڈ کے سِرے کو پاؤں سے چھٹکا دیا اور اسکیٹ بورڈ اُچھل کر اوپر آ گیا جسے اُس نے بنا دیکھے ہی بڑی مہارت سے پکڑ لیا۔

اس کی نظریں زمین پر پنجوں کے بل بیٹھی اس لڑکی پر تھی جو منہ میں نا جانے کس زبان میں بڑبڑاتے ہوئے کتابیں اٹھا رہی تھی۔

چند لمحے یوں ہی سرک گئے دل آویز نے ستے ہوئے چہرے کے ساتھ سامنے اسکیٹ بورڈ بغل میں دبائے کھڑے لڑکے کو دیکھا۔۔۔۔ پتلی دبلی جسامت کا وہ لڑکا قد میں دل آویز کے بلکل برابر تھا۔ اس کے بال گھنگرالے نہیں تھے مگر سیدھے بھی نہیں تھے بلکہ گھنگرالے اور سیدھے بالوں کا اِمتزاج تھے۔ وہ نیلے رنگ کی جینز اور سفید رنگ کی ٹی شرٹ میں ملبوس تھا اور اوپر ہلکے نیلے رنگ کا اپر پہن رکھا تھا۔

گھنگرالے بالوں کی ایک لٹ ماتھے پر بکھری ہوئی تھی۔ گلے میں ایک چین پہنی ہوئی تھی جس میں مارخور کی شکل کا ایک لاکٹ تھا۔ دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں انگھوٹھی پہن رکھی تھی۔ شکل وصورت اچھی ہونے کے باوجود بھی دل آویز کو وہ شخص اُسے گھورتا ہوا بہت زہر لگا تھا۔

وہ اُسے مکمل نظر انداز کرتے ہوئے اندر جانے لگی جب وہ اس کے پیچھے آیا۔

"اووہوہو میڈم کہاں جا رہی ہو۔۔۔ بی ایس سی کی کلاسز اس ڈپارٹمنٹ میں نہیں ہو رہیں" وہ اطمینان سے شانے اُچکاتے ہوئے بولا۔

دل آویز حیران ہوئی۔۔۔۔ "تمہیں کیسے پتا میں بی ایس سی کی اسٹوڈنٹ ہوں" اس نے دونوں آئی بروز اچکائیں۔

"ڈفر" اس نے آنکھوں سے اس کے ہاتھ میں پکڑی کتابوں کی جانب اشارہ کیا تو دل آویز نے اُسے گھور کر دیکھا۔

"اوکے اوکے سوری" دل آویز کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے دونوں ہاتھ اٹھا لئے۔

"بائے داوے میرا نام الہان ڈی سُوزا ہے. اور میں بھی بی ایس سی فرسٹ ایئر کا اسٹوڈنٹ ہوں" وہ دل آویز کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

دل آویز نے اچٹتی نگاہ سے اُسے دیکھا وہ کہیں سے بھی فرسٹ ایئر کا اسٹوڈنٹ نہیں لگتا تھا۔

"پلیز ان ججمینٹل نگاہوں سے نہ دیکھو وہ دراصل۔۔۔۔" اس نے سر کھجایا جیسے کوئی مناسب سے الفاظ تلاش رہا ہو۔

"پڑھائی میں کمزور ہو؟" دل آویز نے اس کی خاموشی سے اخذ کرتے ہوئے اپنی گول گول آنکھوں کو اس پر مرکوز کرتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

"کمزور نہیں ہوں بس۔۔۔۔" وہ پھر رکا "بس انٹرسٹ کی بات ہے" اس نے خجالت سے کہا۔

"اوہ سمجھ گئی پھر کس چیز میں انٹرسٹ ہے تمہیں" وہ دونوں ڈیپارٹمنٹ کے بلکل آمنے سامنے کھڑے تھے۔ دل آویز نے کتابوں کو سینے سے لگایا ہوا تھا۔

"وقت کے ساتھ ساتھ تمہیں پتا چل جائے گا ویسے بھی اب تو ہم دوست بن گئے ہے نا" وہ مسکرایا۔

"دوست یہ کب ہوا۔۔۔ سوچنا بھی مت۔۔۔ میں لڑکوں سے دوستی نہیں کرتی" ہوا مخالف سمت چل رہی تھی جس کی وجہ سے دل آویز کے بالوں کی ایک لٹ بار بار اُڑ کر اس کے چہرے پر آرہی تھی جسے وہ بار بار کان کے پیچھے اڑس رہی تھی۔

"دیکھوں اس یونیورسٹی میں تمہیں سکون سے اپنی ڈگری مکمل کرنی ہے تو مجھ سے بنا کر رکھنی پڑے گی ورنہ تو میں تمہاری ناک میں دم کر دوں گا" اس کے چہرے پر شرارتی ہنسی نمودار ہوئی۔

"اچھا کیا کر لوگے تم" وہ غرائی

"یہ بھی تمہیں وقت کے ساتھ ساتھ پتا چل جائے گا" وہ کھسیانی ہنسی ہنستا ہوا ڈیپارٹمنٹ کے اندر داخل ہو گیا۔۔۔ دل آویز بھی پیچھے پیچھے چل پڑی۔

"ہمم عقل مند ہو کافی۔۔۔ گڈ اچھا ہے میرے اسائنمنٹس میں اچھی ہیلپ ہو جائے گی" وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتا اس کے پاس سے گزرتے لوگوں کو ہیلو ہائے کرتے ہوئے چلتے چلتے بولا اور دل آویز معصوم بلی کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے سر ہلانے لگی۔

"مشکل میں گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے" دل آویز نے سڑی ہوئی شکل بناتے ہوئے کہا۔

"اینڈ فور یور کائنڈ انفارمیشن مجھے اردو سمجھ آتی ہے" الہان ایڑیوں کے بل یکدم دل آویز کے سامنے گھوما ۔۔۔وہ وہیں رُک گئی اس نے مسکین شکل بناتے ہوئے الہان کو دیکھا۔

"وہ۔۔وہ مجھے لگا تمہیں۔۔۔" وہ شرمندہ ہوئی۔

"میرے پاپا پاکستانی ہیں میڈم اور مجھے اردو سمجھ آتی ہے" میر فخر سے سینا چوڑا کرتے ہوئے بولا۔

اچھا چلو معاف کیا میں اپنے دوستوں کو اتنا مارجن آف ایرر دیتا ہوں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں" دل آویز کے چہرے کے تاثرات اُسے محظوظ کر رہے تھے۔

"اور تم ہمیشہ اتنا ہی بولتے ہو؟" وہ بیزار ہوئی۔

"نہیں اس سے تھوڑا زیادہ بولتا ہوں" آگے سے فوراً جواب داغا گیا۔

☆...☆...☆

زیبی نے کمرے میں قدم رکھا تو سانس ساکن ہوئی سگریٹ کی بُو نے اس کو کھانسے پر مجبور کیا۔ اینا بستر کے کنارے ٹیک لگائے زمین پر بیٹھی تھی۔ سر بستر کی پائنتی سے ٹکا رکھا تھا۔ دائیں ہاتھ میں سگریٹ تھی اور بایاں ہاتھ زمین پر پڑا تھا۔ وہ خالی نگاہوں سے چھت کو مسلسل تکتی جا رہی تھی۔

زیبی آہستگی سے اس کے پاس پنجوں کے بل بیٹھی اور اس کی انگلیوں میں دبا سگریٹ نکال کر ایش ٹرے میں رگڑ دیا۔

"Baby cigarette is injurious to health" ان کے لہجے میں افسوس اور دُکھ تھا۔

اینا نے پہلی بار گردن ترچھی کر کے دائیں جانب پنجوں کے بل بیٹھی اس ادھیڑ عمر عورت کو دیکھا۔

"No zaibi, Ahil's ignorance is injurious to health" وہ مسکرائی۔۔۔اس کی مسکراہٹ میں سمندر کی تغیانی جیسا منظر اُبھرا تھا۔

"کیوں اس گھمنڈی شخص کے پیچھے تم خود کو تباہ کر رہی ہو اینا" وہ خفگی سے بولیں۔

"میں نے اس تباہی کو نہیں چُنا زیبی" وہ پھر سے چھت کو گھورنے لگی۔۔۔۔

"اس تباہی نے مجھے چُنا ہے" آنکھ کے کنارے سے بہتا آنسوں اس کے کرب کا گواہ تھا۔

"اور جانتی ہیں اس تباہی کا کیا مطلب ہے" وہ کرب سے پھر مسکرائی اور زیبی اُسے خالی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ محبت میرے مخالف ہو گئی ہے" زیبی کو لگا کسی نے کھینچ کر گھونسا اس کے دل پر مارا ہے۔

محبت نہیں اِسے بد دعا کہیئے مرشد
یہ جس کو لگتی ہے برباد کر دیتی ہے

☆...☆...☆

زلیخا ریما کو نیند کی دوا دے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے اور وہ کمرے میں تنہا تھی۔ تیز ہواؤں کا رُخ حویلی کی جانب تھا شاید۔۔۔۔ کھڑکی کا پردہ تیز ہوا کے جھونکوں سے پھڑ پھڑانے لگا وہ یکدم گھبرائی۔ ہوا کی خاموش سرسراہٹ نے کمرے کا ماحول عجیب کر دیا تھا۔

زلیخا نے فوراً کھڑکی کے دونوں پٹ بند کر دیئے اور پردہ برابر کر دیا۔ کمرے میں اس قدر خاموشی تھی کے گھڑی کے کانٹوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

انہوں نے ماتھے پر آئے پسینے کو دائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے رگڑا اور سیدھا باتھ روم میں گھس گئیں۔

نل کھول کر وہ کچھ لمحے پانی کو گھورتی رہیں پھر ہاتھ کے پیالے میں پانی بھر کر چہرے پر مارنے لگیں۔ جیسے ہی انہوں نے چہرے پر پانی ڈال کر سامنے دیوار میں نصب آئینے میں خود کو دیکھا وہ پل بھر میں ساکت ہو گئی۔۔۔

ان کے دونوں ہاتھ اور چہرے پر خون لگا ہوا تھا انہوں نے زور زور سے دونوں آنکھیں جھپکائیں۔۔۔ نل سے پانی کی جگہ خون بہہ رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر زور سے چلائیں اور ہڑبڑی میں ان کا پاؤں باتھ روم کی ٹائل پر پھسلا۔۔۔ سر زمین سے ٹکرایا اور آنکھ کے سامنے یکدم ایک کالا سایہ منڈلایا۔

اس کالے سائے میں زلیخا کو بی جان کا خوفناک سا عکس دکھائی دیا اور پھر وہ عکس اچانک غائب ہو گیا۔

("یہ وہ خون ہے اماں جس میں آپ میں اور یہ پوری حویلی ڈوب جائے گی") یہ وہ آخری سرگوشی تھی جو زلیخا کی سماعتوں میں گونجی تھی۔ اور اُن پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔

☆...☆...☆

وہ پورے انہماک سے لائبریری میں بیٹھی کسی کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی جب الہان چمپینزی کی طرح کہیں سے نکل کر اس کے مقابل رکھی کرسی پر آ بیٹھا تھا۔

دل آویز پہلے ٹھٹکی پھر بے زاری سے اُسے دیکھا۔۔۔۔

"تمہیں کس بات کی جلدی ہے الہان۔۔۔ چراغ سے نکلے ہوئے جِن کی طرح کہیں بھی کبھی بھی نمودار ہو جاتے ہو" اس نے صفحہ پلٹتے ہوئے کہا۔

"اور تمہیں کیا درد ہے دل آویز ہمیشہ ہٹلر کی طرح سڑی ہوئی کیوں رہتی ہو۔۔ کبھی ہنس لیا کرو۔۔ مسکرا لیا کرو" وہ اُسی کے انداز میں بولا تو دل آویز کے کندھے ڈھلکے۔

"اچھا اوکے ٹھیک ہے۔۔۔ کام کیا ہے بولو" اس نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا تو الہان ٹیبل پر رازداری سے جھکتا ہوا قریب آیا۔

"کسی لڑکی کو اپنے دل کی بات بتانی ہو تو کیسے بتائی جائے" وہ سرگوشی کرنے والے انداز میں بولا۔

"سوچنا بھی مت الہان ڈی سُوزا میں شادی شُدہ ہوں" وہ تیوری چڑھا کر بولی تو الہان نے مصنوعی بیزاری سے مسکراتے ہوئے دل آویز کو گھور کر دیکھا۔

"یہ سامنے تارے دیکھ رہی ہو یہ اگر اصلی بھی ہوتے تو میں تمہارے لئے نہیں توڑتا" الہان نے دیوار پر لگی ایک پینٹنگ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جس میں ایک رات کا منظر اور آسمان پر ستارے پینٹ کئے ہوئے تھے۔

"اونہوں" وہ اس کی بات سمجھ گئی۔

"اچھا مجھے نہیں معلوم کہ کسی کو اپنے دل کی بات کیسے بتائی جاتی ہے" اس کے لہجے میں ہلکی سی اداسی گُھل گئی جسے الہان نے محسوس نہیں کیا۔

"تو کیا تم نے اپنے شوہر سے کبھی اظہار محبت نہیں کیا" سوال دوٹوک تھا۔

دل آویز کو سمجھ نہیں آیا وہ اس سوال کے جواب میں کیا کہے تو اس نے بات بدلتے ہوئے پوچھا۔

"تم یہ سب چھوڑوں پہلے یہ بتاوں کے کس کی قسمت خراب کرنے کا ارادہ ہے تمہارا"

"وہ جو کل تمہیں پِک کرنے آئی تھی بس اُسی کے نصیب کھولنے کا سوچ رہا ہوں" وہ شانے اچکاتے ہوئے بولا۔

"کیا۔۔۔ تم جولیانہ کی بات کر رہے ہو" وہ پر جوش ہوئی۔

"اوہ تو اس محترمہ کا نام جولیانہ ہے۔۔۔ نائیس" وہ مُسکرایا۔

"ویسے کیا مجھے تمہاری فرینڈ کا نمبر مِل سکتا ہے" وہ کھسیاتے ہوئے بولا۔

" بلکل بھی نہیں۔۔۔ بڑے تیس مار خان بنتے ہو نا تو یہ کام بھی خود ہی سر انجام دو تو مانے" وہ دوبارہ کتاب کھولتے ہوئے شرارتی سے مسکرائی۔

"واہ زبان لمبی ہو گئی ہے تمہاری۔۔۔ بِلی۔۔۔ دیکھ لوں گا میں تمہیں" وہ چِڑتے ہوئے بولا مگر دل آویز کے کان میں جُوں تک نہیں رینگی وہ ہنوز کتاب میں جھکی رہی۔

☆...☆...☆_

میر آہل میٹنگ روم میں پاور سیٹ سے ٹیک لگائے کوئی بورنگ سی پریزنٹیشن دیکھ رہا تھا بیزاری اس کے چہرے سے صاف ٹپک رہی تھی۔ مائیکل بھی دائیں جانب کرسی پر براجمان تھا اور گاہے بگاہے ایک نظر ساتھ بیٹھے آہل پر بھی ڈال لیتا تھا۔

دن بدن اُس کی دلچسپی کام سے ختم ہوتی جا رہی تھی دل آویز نام کا بھوت نا جانے کیوں اس کے سر پر سوار ہونے لگا تھا۔

"ایسے ہی چلتا رہا تو بہت جلد میں سڑک پر آجاؤں گا" اس نے سرگوشی کرتے ہوئے اپنی گردن مسلی

"سوری سر آپ نے کچھ کہا" مائیکل نے میر آہل کے لبوں کی حرکت کو پڑھ لیا تھا۔

"ہاں میں نے کہا کہ میرے سر میں کچھ درد ہے" اس نے سر مسلتے ہوئے کہا تو میٹنگ روم میں سناٹا چھا گیا۔

"علینہ باقی کی میٹنگ تم اٹینڈ کرلو اور فائل مائیکل کے ہاتھوں میرے گھر پہنچا دینا میں بعد میں دیکھ لوں گا" وہ کوٹ کے بٹن مقفل کرتا ہوا کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تو روم میں موجود باقی لوگوں نے بھی اس کی تقلید کی۔

مائیکل نے سر کو جنبش دیتے ہوئے آگے بڑھ کر روم کا دروازہ کھولا اور وہ بنا ایک لمحہ ضائع کئے وہاں سے نکل گیا۔

مائیکل جیسے ہی دروازہ مقفل کر کے واپس مُڑا تو لمحے بھر کے لئے ٹھٹکا روم میں ہنوز خاموشی تھی۔ جیک جو سامنے کھڑا پریزنٹیشن دے رہا تھا وہ بھی خاموش تھا۔ سب گومگو ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

"آپ سب کو سانپ کیوں سونگھ گیا ہے؟" مائیکل نے زور سے تالی بجاتے ہوئے سب کو متوجہ کیا تو سب نے ایک ساتھ اس کی طرف دیکھا۔

"سر کچھ دنوں سے بدلے بدلے سے دکھائی دے رہے ہیں" علینہ کہے بنا رہ نہ سکی۔

"ہاں اور آج کل تو سر آفس بھی لیٹ آتے ہیں" جون نے بھی تبصرہ کیا۔

"ہاں اور آج کل تو سر بنا بات کے ایمپلائز کو فائر بھی کر رہے ہیں" مائیکل نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے تنبیہی انداز میں کہا تو سب فوراً سیدھے ہو گئے۔

مائیکل نے مسکرا کر ایک نظر کمرے میں موجود سب لوگوں پر ڈالی اور پھر کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"ایک نمبر کا چمچہ ہے یہ میر سر کا" جینی نے آہستگی سے علینہ کے کان میں سرگوشی کی جس کی بھنک مائیکل کی سماعتوں تک پہنچے بنا رہ نہیں سکی۔

"ہاں اور یہ چمچہ چھُری بننے میں ہرگز دیر نہیں لگاتا" وہ ذو معنی انداز میں لاپرواہی سے شانے اُچکاتے ہوئے بولا۔

☆…☆…☆

"بات سُنو بلی تم نے پروفیسر جبران کی پریزنٹیشن پر کام کرنا شروع کر دیا؟" وہ ایک بار پھر کسی جِن کی طرح پیچھے سے نمودار ہوا تھا۔

اور دل آویز کا ایپل جُوس اُس کے کپڑوں پر گِرتے گِرتے بچا تھا۔

"نہیں" اس نے برہمی سے منہ بناتے ہوئے جواب دیا

"کیوں کس چیز کا انتظار ہے آپ کو محترمہ" اس نے دل آویز کا ایپل جوس چھینتے ہوئے کہا اور ایک سانس میں ہڑپ کر لیا۔

"الہان تمہیں شرم آتی ہے؟" وہ چڑ گئی۔

"ہیں۔۔ شرم۔۔۔ یہ کس رنگ کی ہوتی ہے؟" وہ ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے کہا تو دل آویز نے اپنا سر پکڑ لیا۔

"نا جانے کونسا گناہ ہوا تھا مجھ سے جو مجھ پر تم مُسلت ہوئے" وہ رونی صُورت بناتے ہوئے بولی۔

"اچھا اب لمبی مت کرو یہ بتاؤ پریزنٹیشن کیوں نہیں بنائی اب تک؟" وہ ایپل جُوس کا ڈسپوزیبل گلاس چار فِٹ دور رکھے ڈسٹ بِن میں اچھالتے ہوئے گویا ہوا۔

"وہ میرے پاس لیپ ٹاپ نہیں ہے" وہ منمنائی۔

"کیا؟ تم نے اب تک لیپ ٹاپ نہیں خریدا دل آویز" وہ دبا دبا سا چلایا تو دل آویز نے اثبات میں سر ہلایا۔

"حد ہے بھئی چلو چل کر پہلے تمہارا لیپ ٹاپ لے لیتے ہیں اور پلیز تھوڑا جلدی کرو پرسوں یہ پریزنٹیشن جمع کروانی ہے" وہ بنا کچھ سُنے آگے بڑھ گیا دل آویز نے بھی بادل ناخواستہ قدم آگے بڑھا دیا۔

ایسٹن سے نکل تقریباً دس سے پندرہ منٹ کی واک کے بعد وہ دونوں دی اسکوائر شاپنگ سینٹر کی سامنے والی سڑک پر کھڑے تھے۔

"کتنا دور ہے یہ مال چل چل کر میرے پاؤں درد کر رہے ہیں" وہ دھوپ کی وجہ سے آنکھ پر ہاتھ سے سایا کرتے ہوئے بولی۔

"میں نے تو تمہیں آفر کی تھی مگر تم پر ہی پیدل چلنے کا بھوت سوار تھا" وہ اپنی کاوازاکی نینجا کی چابی انگلی پر گھوماتے ہوئے بولا۔

"نہیں مجھے اپنی جان بہت عزیز ہے اور ویسے بھی کوئی بے وقوف، کم عقل، پاگل ہی ہو گا جو تمہاری کاوازاکی پر بیٹھے گا" وہ سر کو دائیں سے بائیں ہلاتے ہوئے بولی۔

"خبردار جو میری بے بی کو ایک لفظ بھی کہا تو" وہ غرایا۔

"یقین کرو جِسے بھی خودکشی کا شوق ہو گا نہ وہی تمہاری بائیک پر بیٹھے گا ویسے کتنوں کو اُڑایا ہے اب تک تم نے اپنی بائیک سے" وہ الہان کے تاثرات دیکھ کر محظوظ ہو رہی تھی۔ اس لئے اُس کی کاوازاکی کی شان میں مزید بڑھا چڑھا کر بولی۔

"مجھے تو لگ رہا ہے تمہیں بھی خودکشی کا شوق ہے اب تم بھی دیکھ کر چلنا ورنہ سب سے پہلے تمہیں ہی اڑاؤں گا" وہ ناک چڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا اور دل آویز بھی شرارت سے مسکراتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

☆...☆...☆

میر آہل گاڑی کی پچھلی نشست پر آرام سے ٹیک لگا کر بیٹھا کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔ چہرے پر پڑتی سورج کی نرم سی شعائیں اُسے تقویت دے رہی تھی۔ گاڑی سگنل پر ٹھہری ہوئی تھی۔ اس کے دل میں ایک عجیب سا اطمینان اور گھر جانے کی پرجوشی تھی۔

آج سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا مگر اب ایسا ہونے لگا تھا۔ آفس کا کام جلدی جلدی ختم کر کے وقت سے پہلے گھر جانا اب معمول بنتا جا رہا تھا۔ صرف اُس خوشبو کے لئے جو اب اُس گھر سے آتی تھی۔

اس سے پہلے وہ پتھر اور اینٹوں پر تعمیر کردہ ایک مکان تھا۔ مگر اب جب سے دل آویز آئی تھی۔ معمولی پتھر اینٹوں والا مکان گھر بن گیا تھا۔

کچن سے آتی خوشبو اور ہر روز ڈائننگ ٹیبل پر سجے نت نئے پکوان یہ سب اس کی عادتیں خراب کر رہے تھے اور پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ میر آہل نے اپنے آپ کو بندشوں کی زنجیروں میں جکڑا نہیں تھا۔

مگر سیکنڈز لگے تھے اس کا سکون اور اطمینان غارت ہونے میں۔۔۔ اس نے ایک جھٹکے میں آنکھوں پر ٹکے سیاہ چشمے کو نوچتے ہوئے ہٹایا۔

سگنل کے سامنے والی سڑک پر دل آویز کسی لڑکے کے ساتھ کھڑی ہنستی مسکراتی نظر آرہی تھی۔

اُسے لگا سورج کی نرم شعائیں اس کے بدن میں پیوست ہو جائے گی۔

میر آہل نے چشمے کو اتنی زور سے مُٹھی میں بھینچا کہ چشمہ ٹک کی آواز کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ میر آہل کی آنکھیں یکدم سرخ ہو گئیں۔ غصے سے ہاتھ اور گردن کی نسیں اُبھرنے لگیں۔

آج میر آہل پر اذیت کی ایک نئی قسم افشاں ہوئی تھی۔ وہ عورت زبردستی اس کی زندگی میں شامل کی گئی تھی پھر اُسے کسی اور کے ساتھ ہنستا مسکراتا ہوا دیکھ کر اُسے اذیت کیوں محسوس ہو رہی تھی۔

یہ محبت کی منزل تک جاتی وہ سیڑھی تھی جو اکثر انسان کے دل کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

اس نے زور سے بھینچی مُٹھی کو سیٹ پر مارا کہ ڈرائیور نے ٹھٹک کر بیک ویو مرر میں میر آہل کو دیکھا مگر پوچھنے کی ہمت نا جُٹا سکا۔

دل آویز اس لڑکے کے ساتھ مال میں داخل ہو گئی تھی اور تب تک سگنل بھی کھل چکا تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

اس نے ڈرائیور کو اشارے سے گاڑی سائیڈ پر لگانے کا حکم دیا اور گاڑی سے نکل کر باہر آ گیا۔ میر آہل آسمان کی جانب سر اٹھائے کھلی فضا میں گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

ڈرائیور گاڑی کے پاس ہاتھ باندھے میر آہل کو خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ آس پاس سے گزرتے لوگ بھی گاہے بگاہے اس کو دیکھ رہے تھے۔ آہل نے اُس سے گاڑی کی چابیاں لی اور گھر جانے کے بجائے وہ یوں ہی بے مقصد گاڑی برمنگھم کی سڑکوں پر بھگاتا رہا۔

دوپہر سے شام ہوئی اور شام رات کے سائے میں قطرہ قطرہ ڈھلنے لگی جب میر آہل گھر میں داخل ہوا۔

مین دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی دائیں جانب ڈائننگ ہال سے نت نئے کھانوں کی خوشبو اس کے ارد گرد چکرانے لگی مگر آج اس خوشبو نے اُسے تقویت نہیں دی تھی بلکہ آج اس خوشبو نے اس کے روم رون میں آگ لگا دی تھی۔

اُس کے صبر کا پیمانہ ایک بار پھر لبریز ہوا وہ ایک ہاتھ سے ٹائی نوچتا ہوا سیدھا دل آویز کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ اس وقت وہ واش روم سے شاور لیکر نکلی تھی اور شیشے کے سامنے کھڑی اپنے لمبے سنہرے بالوں کو سکھا رہی تھی جب یکدم کمرے کا دروازہ جھماکے سے کُھلا وہ گھبرا کر پلٹی۔ میر آہل کو تیش میں دیکھ کر اس کے پاؤں منجمد ہو گئے۔

میر آہل نے دیکھا کہ بستر پر ایک برینڈ نیو چمکتا ہوا لیپ ٹاپ رکھا ہوا ہے اور سیکنڈز لگے تھے میر آہل کو وہ لیپ ٹاپ اٹھا کر دیوار پر مارنے میں۔۔۔ اور۔۔۔ دھڑ سے وہ چمکتا ہوا لیپ ٹاپ بہت سے ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔

دل آویز اُس کا غضب ناک غصہ دیکھ کے ڈر کر کمرے سے بھاگنے لگی۔

میر آہل نے جھپٹ کر پیچھے سے اُس کی نازک دودھیا کلائی کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ اور اُسے دھکیلتا ہوا پیچھے دیوار تک لے گیا۔ اُس کی گرفت اِس قدر سخت تھی کہ دل آویز کے سرخ متورم ہونٹوں سے سسکی خارج ہوئی مگر میر آہل کے دل کو موم کرنے میں ناکامیاب رہی۔

"پلیز آہل مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔۔۔ چھوڑیں" اس کی گہری سیاہ آنکھیں آنسوں ابلنے لگی۔

"اور میری تکلیف کا کیا دل آویز" وہ خون رنگ ہوتی آنکھیں اُس کے فق ہوتے چہرے پر گڑاتے ہوئے بولا۔

"اگر آپ کو میری موجودگی اتنی تکلیف دیتی ہے تو آپ مجھے چھوڑ کیوں نہیں دیتے" وہ اپنی کلائی چُھڑانے لگی۔

"کیا کہا تم نے" وہ غصے سے ایک بار پھر دھاڑا مگر اس بار دل آویز نہیں سہمی بلکہ اپنی بھیگی پلکیں اٹھا کر ہمت سے آہل کی سرخ آنکھوں میں دیکھا۔

"آپ کو مجھ سے نفرت ہے۔۔۔ہے نا؟" نم آنکھیں اور بھیگا لہجہ دل آویز کی کالی گہری آنکھوں نے اُس کے دل میں ہلچل مچا دی تھی۔

میر آہل نے تند مزاجی سے دل آویز کے کندھے اور سینے پر بکھرے بالوں کو پیچھے کیا اور آہستگی سے اس کے کان پر جھکا۔۔۔میر آہل کے وجود سے اٹھتی خوشبو نے دل آویز کو مدہوش کر دیا تھا۔ مگر اگلے ہی لمحے اس کا وجود برف ہوا۔ اس کی نگاہوں میں بے یقینی اُبھری۔

"مجھے نفرت کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں۔۔۔میری محبت ہی تمہیں تڑپانے کے لئے کافی ہے" اُس نے دل آویز کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے اُسے ایک جھٹکے سے پیچھے کیا۔ وہ ایک بار پھر دیوار سے ٹکرائی تھی۔

"یاد رکھنا آج سے تمہاری ہر سانس پر میر آہل کے نام کا پہرہ ہو گا" وہ ایک قدم قریب آیا۔ دونوں کے درمیان کا فاصلہ بہت تھوڑا رہ گیا تھا۔

"یہ رشتہ چاہے جن حالات میں بھی جُڑا ہو لیکن اگر مجھ سے بے وفائی کی تو تمہاری جان قبض کر لوں گا" وہ درشتی سے بول کر کمرے سے نکل گیا اور دل آویز کو لگا کسی نے اُسے کیچڑ میں دھکا دے دیا ہے۔

وہ وہی دیوار کے ساتھ بیٹھتی چلی گئی۔ آنسوں لڑیوں کے مانند اس کے گلابی گال پر بہنے لگے۔

اُس نے کِرچی ہوئے لیپ ٹاپ کے ٹکڑوں کو ملال سے دیکھا اور وہ لمحوں میں میر آہل کے اس رویے کو سمجھ گئی۔

اِس شخص کے ساتھ بتایا ہوا ہر لمحہ خراج مانگتا تھا۔ میر آہل بہت عجیب تھا، کبھی چاند کی طرح ٹھنڈک دیتا تو اگلے ہی لمحے سورج کی طرح جُھلسا دیتا۔۔۔وہ چاند اور سورج کا امتزاج تھا۔ نا سمجھ میں آنے والی ایک داستان۔

☆...☆...☆

اگلے روز وہ بنا ناشتہ کیئے ہی آفس کے لئے روانہ ہو گیا تھا۔ سینے میں جلن کی جگہ پچھتاوے نے لے لی تھی۔ دل آویز کے کردار کی گواہی وہ آنکھ بند کر کے دے سکتا تھا۔

ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اُس کا ملال بڑھ رہا تھا۔ آنکھوں کی پتلیوں پر اس کی کالی گہری سیاہ آنکھیں اور ان میں تیرتی نمی بار بار دکھائی دے رہی تھیں۔

"آپ کو مجھ سے نفرت ہے۔۔۔ ہے نا؟" یہ سوال اس کے دل پر بار بار تیر کی طرح لگ رہا تھا۔

"اُسے ایسا کیوں محسوس ہوا کہ مجھے اُس سے نفرت ہے" اس نے آنکھیں موند کر سر پاور سیٹ پر گرا لیا۔

"ظاہر سی بات ہے اس نے تمہارے روکھے پھیکے رویہ سے اخذ کیا" اندر کہیں سے آواز آئی تو وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اپنے اطراف میں دیکھنے لگا۔

"خود کو تھکانے کی ضرورت نہیں ہے آہل۔۔۔ اپنے دل کی سُنو سارے جواب مل جائے گے" ایک بار پھر اس کی سماعتوں میں وہ آواز گونجی۔

اُس نے ٹھٹک کر اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔ اس کا دل اس لمحے تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ماتھے پر پسینے کی ننھی منی بوندیں تھی حالانکہ کے اے-سی فُل اسپیڈ پر چل رہا تھا۔

"مجھے سائیکالوجسٹ کی ضرورت ہے شاید" اس نے پیشانی مسلتے ہوئے ریسیور اٹھایا اور دو منٹ بعد مائیکل کمرے میں داخل ہوا۔

"سر آپ نے مجھے یاد کیا" وہ مسکراتے ہوئے بولا

"ہاں بیٹھو مائیک" وہ ٹیبل پر آگے جھکا

مائیکل میر آہل کا یہ انداز پہچانتا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ آہل تھوڑا ڈسٹرب ہے اور اس وقت اُسے ایک دوست کی ضرورت ہے۔

کچھ لمحے یوں ہی سرک گئے اور میر آہل گو مگو ٹیبل پر رکھیں چیزیں گھورتا رہا۔

"سر۔۔۔ اِٹس اوکے جو بھی ہے دل میں۔۔۔ نکال دیں" اس کے دوستانہ انداز نے آہل کو حوصلہ دیا۔

"آئی تھنک مائیک میں کچھ عجیب برتاؤ کر رہا ہوں کچھ دنوں سے" وہ گردن مسلتے ہوئے بولا۔

"یس سر ہمیں بھی ایسا ہی لگتا ہے" وہ سرعت سے بول گیا پھر زبان دانتوں تلے دباتے ہوئے آہل کو دیکھا جو پہلے ہی اُسے مستفسرانہ نظروں سے گھور رہا تھا۔

"وہ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ آپ کو ایسا لگتا ہے تو ایسا ہی ہو گا" اس نے فوراً تصیح کی۔

"اس کا مطلب میرے ساتھ ساتھ پورا آفس یہی سوچتا ہے کہ میر آہل کا دماغی سلطنت بگڑ گیا ہے" وہ تھکے ہوئے انداز میں پیچھے ہوا

"سر اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے معاملات میں" وہ سر کھجاتے ہوئے منمنایا تو آہل نے آئی برو اُچکاتے ہوئے اُسے دیکھا۔

"کس طرح کے معاملات مائیک ذرا کھل کر بیان کرو گے" مائیک نے خجالت سے سر جھکا دیا۔

"اپنے دل کی سُنیں سر" وہ جھکی گردن کے ساتھ مسکرا کر بولا۔

وہ چونکا اور کرسی دھکیل کر پاور سیٹ کے پیچھے جا کر دونوں ہاتھ جیب میں ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی پشت مائیکل کی جانب تھی۔

"جس حقیقت سے آپ کو آپ کا دل باور کروائے گا شاید سائیکالوجسٹ نہ کروا پائے" وہ اُس کی پُشت گھورتا رہا اور میر آہل شیشے سے باہر نظر آتے برمنگھم کو۔

"آپ انسان ہیں روبوٹ نہیں آپ کا حق ہے خوشیوں پر" یہ باتیں کہتے ہوئے اس کا دل نا جانے کیوں ہمک رہا تھا۔

میر آہل کو یکدم اپنے کندھے ہلکے محسوس ہوئے اس کی آنکھیں تر ہوئیں۔ اس نے پلٹے بغیر ہی ذرا سی گردن ترچھی کر کے مائیکل کو دیکھنے کی کوشش کی۔۔۔۔مائیکل بہت اداس دکھائی دے رہا تھا۔

میر آہل کے چہرے پر نرم سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ بظاہر وہ اس کا پی-اے تھا مگر یہ بات محض وہ دونوں جانتے تھے کہ وہ آپس میں کس طرح کا بانڈ شیئر کرتے ہیں۔

میر آہل کو آج بھی یاد ہے کہ جب وہ کئی سال پہلے انگلینڈ آیا تھا۔ مائیکل وہ پہلا شخص تھا جس کے کندھے پر سر رکھ کر ایک رات آہل نے پہلی بار اپنی سرگزشت سنائی تھی۔

اپنے کریئر کے ابتدائی سالوں میں اُسے ڈپریشن کے شدید دورے پڑتے تھے اور اُس وقت مائیکل ہی وہ واحد شخص تھا جس نے ایک وفادار دوست کی طرح اُسے سنبھالا تھا۔ اور آج بھی جب وہ اسٹریس یہ انزائٹی کا شکار ہوتا مائیکل ایک اچھے دوست کی طرح ہمیشہ اس کی مدد کے لئے موجود ہوتا تھا۔

زندگی میں کچھ دوست اینٹی ڈپریسنٹ کی طرح ہوتے ہیں۔ اُن کے ساتھ زندگی کی تلخیوں کو جھیلنا آسان ہو جاتا ہے۔

"تھینک یو مائیک" مائیکل نے جب سر اٹھایا تو وہ اس کے سر پر کھڑا تھا اور اس کا کندھا تھپک کر شکریہ ادا کر رہا تھا۔

"مینشن ناٹ سر" وہ اب اپنی کرسی سے کھڑا ہوتے ہوئے بولا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میر آہل اپنی جگہ کھڑا جیب میں ہاتھ ڈالے مائیکل کی پشت کو دیکھ رہا تھا۔

"بٹ سر لڑکیوں کو لال گلاب واقعی بہت پسند ہوتے ہیں"

وہ جاتے جاتے دوبارہ مُڑا

"میرے خیال سے سر آپ کو بھی" میر آہل نے اُسے درمیان میں ٹوکا

"ایک گھنٹے میں فائل میری ٹیبل پر موجود ہونی چاہئے مائیکل ورنہ" وہ رُکا

"اوکے اوکے سر گوٹ اِٹ" وہ فوراً دروازہ مقفل کر کے بھاگا کہ اس سے پہلے میر آہل اُسے لال گلابوں کا باغیچہ ہی اگانے کی سزا نہ دے دے۔

مائیکل کے انداز پر میر آہل کو بے اختیار ہنسی آئی وہ پیشانی خرچتا ہوا گھوم کر اپنی پاور سیٹ پر آکر براجمان ہو گیا۔ اب وہ پہلے سے کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔

☆...☆...☆

"زلیخا کے ٹھیک ہونے کی کوئی امید ڈاکٹر صاحب" میر خلیل نے کمرے کا دروازہ مقفل کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب سے استفسار کیا۔

وہ پچھلے پندرہ دن سے بستر پر کسی بے جان لاش کی طرح پڑی تھیں۔ وہ سب کچھ سُن اور سمجھ تو سکتی تھیں مگر کچھ بول نہیں سکتی تھیں اور نہ خود سے ہل جل سکتی تھیں۔

"دیکھیں میر سردار میں آپ سے کھل کر بات کروں گا سر پر چھوٹ بہت گہری ہے اور انٹرنل بلیڈنگ کی وجہ سے ان کا کیس کافی بگڑ گیا ہے اور ایسی کنڈیشن میں ان کی سرجری کرنا ان کی جان کے لئے خطرہ ہو سکتا ہے" وہ صحن عبور کر کے بیرونی دروازے تک آ چکے تھے۔

"فلحال ہمیں ان کو دوائیوں سے ہی ٹریٹ کرنا پڑے گا آپ بے فکر ہو جائے مجھ سے جتنا ہو سکے گا میں کروں گا" وہ میر خلیل سے مصافحہ کرتے ہوئے بولے۔

"آپ کا بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب" میر خلیل نے سر کو خم دیتے ہوئے انہیں گاڑی میں بٹھا کر روانہ کیا اور کچھ دیر پُر سوچ نظروں سے اُن کی گاڑی کو دور تک جاتا دیکھتے رہے۔

وہ جیسے ہی واپس اندر کو پلٹے تو صحن کی ملحقہ زینے پر ریما کو گم صم سا کھڑا پایا وہ فوراً اس کی طرف لپکے۔

بکھرے بال، اجڑا ہوا حلیہ اور بے جان آنکھیں۔۔۔ اپنی بیٹی کو ایسے حال میں دیکھ کر میر خلیل کا دل ہمک کر رہہ گیا۔

"کیا حال بنا رکھا ہے میری گڑیا نے اپنا" انہوں نے اُسے شانوں سے پکڑ کر سینے سے لگایا۔

نا جانے کس کی نظر لگ گئی ہے میرے گھرانے کو" وہ دکھی تھے مگر وہ بنا کسی تاثر کے ان کے سینے سے لگی سنتی رہی۔

"ہمارے ساتھ بُرا ہمارے اعمال کی وجہ سے ہی ہوتا ہے بابا جان اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی غلطیوں کا بوجھ خود اٹھائے نا کہ کسی دوسرے پر ڈالیں" میر خلیل نے اُسے خود سے جدا کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا وہاں ویرانی سی ویرانی تھی۔

یہ وہ ہنستی کھیلتی بے حساب باتیں کرتی ریما نہیں تھی۔ یہ تو کوئی اور ہی تھی میر خلیل کے ہونٹوں پر قفل لگ گیا۔ وہ حیرانگی سے اسے یک لخت تکتے چلے گئے۔

☆...☆...☆

وہ اس وقت آفس سے تھکا ہوا آیا تھا اور ڈریسنگ کے سامنے کھڑا اپنے کف لنکس کھول رہا تھا جب غیر متوقع طور پر دروازے پر دستک ہوئی۔

"یس کم اِن" وہ بنا پلٹے ہی شیشے میں نظر آتے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے بولا اور پھر فوراً چونکا

دروازہ دھکیل کر دل آویز اندر داخل ہوئی۔۔۔ اس نے سیاہ رنگ کی قمیض اور ٹراوزر زیب تن کیا ہوا تھا۔ لمبے بالوں کو ڈھیلے جُوڑے کی شکل دے رکھی تھی اور شیفون کا ڈوپٹہ گلے میں ڈال رکھا تھا جو بلیک کافی کا کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے ایک طرف سے پھسل کر نیچے آ گیا تھا۔

"کوئی کام؟" میر آہل نے فوراً نظریں دوسری جانب کرتے ہوئے استفسار کیا

"میں کسی کام سے نہیں بلکہ آپ سے ایک بات کلیئر کرنے آئی ہوں" وہ ڈوپٹے کو دوبارہ کندھے پر ڈالتے ہوئے بولی۔

"بولئیں میں سُن رہا ہوں"

میر آہل نے کف لنکس کھولتے ہوئے پلٹ کر اُسے سر سے پاؤں تک آئی بروز اچکا کر دیکھا۔

"الہان میرا کلاس فیلو ہے اور" وہ رکی

"اور" وہ سینے پر ہاتھ باندھ کر سیدھا ہوا نا جانے وہ کیا سننا چاہ رہا تھا۔

اور بہت اچھا دوست بھی" وہ مضبوط لہجے میں بولی

میر آہل نے ضبط سے مٹھیاں بھینچ لیں۔

"مجھے پریزنٹیشن بنانے کے لئے لیپ ٹاپ کی ضرورت تھی اس لئے ہم مال گئے تھے بس" اس نے رُک کر میر آہل کے تاثرات دیکھے۔

"تمھیں کسی چیز کی ضرورت تھی تو جولیانہ کو کہہ سکتی تھی اُسے میں ہر مہینے اِسی کام کے پیسے دیتا ہوں" دل آویز کی ڈھٹائی اُسے ناگوار گزری تھی۔

"آپ جیسا سوچ رہے ہیں ایسا کچھ نہیں ہے" دل آویز برہمی سے بولی۔

میر آہل نے ہونٹ دبا کر گردن پیچھے پھینکتے ہوئے آنکھیں ضبط سے بند کی، واضح دکھائی دے رہا تھا کہ وہ اس بحث سے اُکتا گیا ہے۔

"جاتے ہوئے دروازہ بند"

اور یکدم دروازہ۔۔ ٹھا۔۔ کی آواز سے بند ہوا تھا۔ میر آہل نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔

دل آویز پہلے ہی دروازہ مار کر جا چکی تھی۔ اور وہ حیرانگی سے بند دروازے کو دیکھتا رہ گیا تھا پھر شانے اُچکا کر دوبارہ آئینے کی جانب مڑ گیا۔

"How obedient" وہ شیشے میں خود کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

دل آویز کا غصہ اُس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ کسی نے پہلی بار میر آہل پر غصہ کرنے کی ہمت کی تھی اور زندگی میں پہلی بار اُسے کسی کے غصے پر بے انتہا پیار آیا تھا۔

☆...☆...☆

اگلے روز ناشتے کی ٹیبل پر غیر معمولی سا سناٹا تھا۔ میر آہل گاہے بگاہے دل آویز کے سپاٹ سے چہرے پر نظر ڈال لیتا جو چُپ چاپ ناشتہ کرنے میں مصروف تھی۔

"آپ کی پڑھائی کیسی جا رہی ہے" اس نے خود ہی بات کا آغاز کر دیا ورنہ دل آویز تو ویسے بھی اُس سے کسی مقصد کے تحت بھی بات نہیں کیا کرتی تھی۔

"بہت اچھی بس پروفیسر جبران نے پریزنٹیشن وقت پر مکمل نہ کرنے پر سب کے سامنے تمغائے ذلت سے نوازا" رکھائی سے تنز کے تیر برسائے گئے۔

میر آہل نے شدید حیرت سے دل آویز کی جانب دیکھا یوں جیسے اُسے سننے میں غلطی ہوئی ہو۔۔ وہ یک لخت اُسے کچھ سیکنڈز دیکھتا رہا۔

"ہممممم" اس نے جان بوجھ کر "ہمم" کو کھینچا تو دل آویز مزید زچ ہوئی۔

گلابی ڈوروں سے سجی برہم آنکھیں، خفا خفا سا انداز اور تنز کے شہد میں بھیگا لہجہ۔۔۔ میر آہل نے نیپکن سے منہ پوچھنے کے بہانے اپنی مسکراہٹ چھپائی۔

اس کا دل کیا کہ وہ اسی طرح اس پر حق جتائے یہ وہ احساس تھا جس سے وہ ایک عرصہ محروم رہا تھا اور اب جب وہ غیر دانستہ ہی سہی اس پر اپنا حق جتا رہی تھی تو کسی انجانے احساس سے میر آہل کا سینہ ایک بار پھر لبریز ہو رہا تھا۔

"ویسے کل کی کافی کا ضائقہ بلکل تمہاری طرح تھا"

وہ ٹیبل سے اٹھتے ہوئے بولا اور پھر ذرا سا دل آویز کی جانب جھکا اور اس کے کان میں ہلکی سی سرگوشی کی

"ایک دم کڑوا"

وہ کھلے دل سے مسکرایا اور کوٹ کا بٹن لگاتے ہوئے آفس کے لئے نکل گیا۔

اور وہ شرمندگی سے سر جھکائے جوں کی توں بیٹھی رہ گئی۔

☆...☆...☆

میر آہل جب بیرونی دروازہ عبور کر کے باہر آیا تو اس کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

مائیکل کو اس کے چہرے کا اطمینان دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اُس نے آگے بڑھ کر اُسے خوشگوار انداز میں گریٹ کیا اور پھر گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا۔

میر آہل گہری مسکراہٹ مائیکل کی جانب اچھالتا گاڑی میں بیٹھ گیا۔

کل والا ملال اب ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا۔ گاڑی ایک بار پھر اُس سگنل پر جا ٹھہری جہاں اس نے فلاور کارٹ دیکھا تھا۔

"سر لڑکیوں کو لال گلاب واقعی بہت پسند ہوتے ہیں" مائیکل کا مذاق میں کہا گیا جملہ اس کے کانوں میں گونجا تو وہ سر جھکا کر ایک بار پھر مُسکرایا۔

خیال تو ذہن میں آ گیا تھا مگر اسے عملی جامہ وہ کیسے پہناتا یہ ایک بہت بڑا معمہ تھا کیونکہ آخر کار کو وہ تھا تو میر آہل۔۔۔اتنی آسانی سے اپنی انا کا پرچم کیسے جلا سکتا تھا۔

☆...☆...☆

میر خلیل اِیزی چیئر پر خاموشی سے بیٹھے بستر پر لیٹی زلیخا کو گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

وہ سفید کاٹن کی شلوار قمیض میں ملبوس تھے اور کتھئی رنگ کی چمکدار سی شال کندھوں پر ڈال رکھی تھی۔

("خلیل تیرے لئے میں نے ایک فیصلہ لیا ہے پُتر" بی جان صوفے پر میر خلیل کے برابر بیٹھتے ہوئے رسان سے بولیں۔

"جی بی جان" وہ مؤدبانہ سر خم کرتے ہوئے بولے۔

"میں نے تیری شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے"

رابعہ اُسی وقت پانی کا گلاس لے کر لاؤنج میں داخل ہوئی تو میر خلیل نے کُن اکھیوں سے رابعہ کے نازک سراپے کو دیکھا۔ رابعہ کو دیکھتے ہی ان کی آنکھیں جلترنگ سی ہوگئیں۔ مگر اگلے ہی پل اُنہیں لگا کسی نے ان کے کان میں گرم سیسہ پگھلا کر ڈال دیا ہے۔

"میں نے تیری اور زلیخا کی شادی کا فیصلہ کیا ہے" وہ میر خلیل کے سر پر پیار کرتے ہوئے بولیں

"بی جان مگر زلیخا آپا تو فیصل بھائی کے ساتھ منسوب ہیں اور" ان کو سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیا کہیں۔

"معلوم ہے پتر مگر فیصل ہماری رابعہ کو پسند کرتا ہے اور مجھے بھی رابعہ بھلی لگتی ہے" وہ مسکرا کر رابعہ کی جانب دیکھتے ہوئے بولیں تو وہ شرما کر لاؤنج سے باہر چلی گئی۔

"مجھے امید ہے پتر توں اپنی بی جان کی زبان کا مان رکھے گا" وہ اُنہیں آس سے دیکھنے لگیں۔

میر خلیل نے بے بسی سے آنکھوں میں ٹوٹے سپنوں کی کِرچیاں سمیٹتے ہوئے نظریں جُھکا دیں۔ ارمانوں کے بکھرنے کی جلن نے آنکھوں کو دھندلا سا کر دیا پر میر خلیل کے لبوں سے شکایت کا ایک لفظ نہیں پھسلا۔

انہوں نے بنا "ہاں" کہے ہی بی جان کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

کسی دوسرے شخص کی محبت میں مبتلا دو لوگوں نے ایک ساتھ زندگی گزاری تھی اور یہ ظلم کی انتہا تھی۔)

میر خلیل نے زور نے آنکھ بند کی تو آنکھ کے کنارے سے آنسوں کی ایک لڑی بہہ نکلی۔

ادھوری محبت کی چبھن ہر سانس کے ساتھ دل میں ایک نئے سِرے سے چھید کرتی ہے۔ چاہے جتنا وقت گزر جائے کتنے ہی موسم بیت جائے مگر وہ تکلیف جوں کی توں ہی رہتی ہے اس میں رتی برابر فرق نہیں آتا۔

تیئیس برس گزر جانے کے بعد بھی میر خلیل کو لگتا تھا کہ یہ تکلیف نئی نئی سی ہے۔

زلیخا کو شادی کے بعد یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ میر خلیل بھی اپنے دل میں کہیں نہ کہیں رابعہ کے لئے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ ان کی زندگی میں دو مرد تھے ایک وہ جس سے زلیخا کو محبت ہوئی تھی اور دوسرا وہ جو زبردستی ان کی زندگی میں شامل کیا گیا تھا۔ اور افسوس کہ دونوں کے دل میں ایک ہی عورت تھی اور وہ عورت زلیخا نہیں تھی۔ اور یہ مات وہ مات تھی جس نے زلیخا کا سینہ بُری طرح چھلنی کر دیا تھا۔

وہ لاکھ کوششوں کے بعد بھی زلیخا کو وہ مقام اور جگہ نہ دے سکے جہاں رابعہ راج کرتی تھی۔ اس کے لمبے خوبصورت بال، کالی گہری آنکھیں، چمکدار گوری رنگت اور اونچا لمبا قد وہ خوبصورتی کی ایک اعلیٰ مثال تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ دل آویز سے ریما سے بھی بڑھ کر محبت کرتے تھے۔

دل آویز ہو بہو اپنی ماں رابعہ جیسی تھی۔ وہی بال وہی آنکھیں وہی خوبصورت نین نقش۔۔۔۔ دل آویز کی طرف انکا جُھکاو بھی زلیخا سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ اس لئے وہ دل آویز کو بھی کبھی قبول نہیں کر سکی تھیں۔

☆...☆...☆

آج یونیورسٹی سے واپسی پر دل آویز گھر جانے کے بجائے گھر سے کچھ فاصلے پر واقع ایک کافی شاپ کی طرف آ گئ تھی اس وقت وہ اور جولیانہ کافی شاپ کے ایک پر سکون گوشے میں موجود ایک ٹیبل پر آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔

"خیریت میم آپ کافی ڈسٹرب دکھائی دے رہی ہیں"

جولیانہ نے اُس کا ستا ہوا چہرہ دیکھ کر سوال کیا۔

"پہلے تو تم مجھے یہ میم کہنا بند کرو"

دل آویز نے آنکھیں گھوماتے ہوئے اُسے تنبی کی تو وہ مسکرانے لگی۔ دل آویز کو جولیانہ کا خود کو میم کہہ کر پکارنا بلکل بھی پسند نہیں تھا۔

"اوکے دل آویز آپ اُداس کیوں ہیں بتانا پسند کریں گی کیا پتا میں آپ کی مدد کر سکوں" وہ ٹیبل پر بانہیں پھیلاتے ہوئے بولی

"کیا تمہارے سر شروع سے ہی ایسے تھے" وہ غم سم سی کافی شاپ کے شیشے سے باہر جھانکتے ہوئے بولی

"کیسے "جولیانہ نے مزید کریدا۔

"ایسے ہی خرڑوس، سڑیل اور عجیب "وہ سرعت سے بول گئی۔

اس کی بات پر جولیانہ نے بلند بانگ قہقہہ لگایا تو دل آویز نے بے بسی سے جولیانہ کو دیکھا۔

"آپ کو میر سر خرڑوس، سڑیل اور عجیب کیوں لگتے ہیں "اس نے مضحکہ خیز انداز میں استفسار کیا تو جواباً دل آویز اس کا منہ دیکھ کر رہ گئی۔

"میری نالج کے حساب سے تو میر سر بہت حساس، محبت کرنے والے اور اپنے ارد گرد موجود سب ہی لوگوں کا خیال کرنے والے شخص ہیں "جولیانہ کے انکشاف نے دل آویز کے سر پر جیسے بم پھوڑا۔

"ہیں۔۔۔ کیا تم یہ باتیں میر آہل کے بارے میں کہہ رہی ہو؟ "اسے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آیا۔

"اپنی آنکھوں سے گلے شکوے کی پٹی ہٹا کر کبھی ان کو دیکھنے کی کوشش کریں گی تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ وہ آپ کے آرام اور خوشی کے لئے بھی کتنی ایفرٹس کرتے ہیں "وہ مسکرائی۔

دل آویز کے ہونٹوں پر مارے شرمندگی کے قُفل لگ گیا۔

ویٹر ٹیبل پر ایک ہاٹ چاکلیٹ اور کیپاچینو کا کپ رکھ کر جا چکا تھا۔

"میں ایک لوور مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتی ہوں میرے بابا میر سر کی کمپنی میں ایک معمولی سے کلرک کی جاب کرتے تھے "وہ رُکی کپ سے اٹھتی بھانپ کے پیچھے اس کا نظر آتا چہرہ اب آہستہ آہستہ دھندلا رہا تھا۔

"اُنہیں کینسر ڈائیگناس ہو گیا تھا"

لمحے بھر کی خاموشی

"میر سر نے آخری وقت تک ان کی بہت خدمت کی ان کے علاج کے خرچے سے لیکر میری ایجوکیشن تک کے تمام اخراجات انہوں نے خود اٹھائے "دل آویز نے جولیانہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر آہستگی سے دبایا تو وہ نم ہوتی آنکھوں سے ہلکا سا مُسکرائی

"میر سر آج بھی ہمارے گھر کے تمام اخراجات اٹھا رہے ہیں میرے چھوٹے بھائی بہنوں کی ایجوکیشن فیس بھی وہ ہی پے کرتے ہیں "ہوا میں یکدم یاسیت سی گھل گئی تھی۔

"میر سر خڑوس نہیں ہیں دل آویز۔۔۔بس آپ کو اُنہیں دیکھنے کا زاویہ بدلنا ہو گا اور یہ سمجھنا ہو گا کہ وہ کیوں اس طرح سے پیش آرہے ہیں"اُس کے معمولی سے مشورے نے اس کی سوچ کا صفحہ ہی پلٹ دیا تھا۔

"تھینک یو جولیانہ تم بہت اچھی ہو"وہ گرم جوشی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی اور پھر یکدم دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے چیخی۔

الہام چھپکلی کی طرح شیشے کی دیوار سے منہ لگائے اُسے باہر سے گھور رہا تھا اور اندر سے دیکھو تو وہ واقعی پانچ فٹ سات انچ کی زہریلی چھپکلی ہی لگ رہا تھا۔ دل آویز نے اُسے منہ ہی منہ میں نت نئے القابات سے نوازا۔

"یہ کون ہے دل آویز"جولیانہ اپنے بلند ہوتے قہقہہ کو روکتے ہوئے بولی۔

"جی اس ناچیز کو الہام ڈی سُوزا کہتے ہیں"اتنے میں الہام کافی شاپ کے اندر آچکا تھا اور اب جولیانہ کے ہاتھ کی پُشت چومتے ہوئے اپنا تعارف کروا رہا تھا۔

"تم یہاں بھی شروع ہو گئے"دل آویز نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے ہاٹ چاکلیٹ کا ایک گھونٹ بھرا۔

"تاریخ گواہ ہے کہ جہاں بھی خوبصورت لڑکیاں موجود ہوتی ہیں الہان جیسا خوبصورت اور ڈیشنگ شخص وہاں خود بخود پہنچ جاتا ہے"وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"بڑی خوش فہمیاں ہیں لوگوں کو"دل آویز نے لقمہ دیا

"ہاں وہ الگ بات ہے یہاں صرف ایک ہی خوبصورت لڑکی موجود ہے"اس نے جولیانہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنے دانتوں کی نمائش کی۔

جولیانہ کو الہان بہت کیوٹ لگا تھا۔ وہ تمام تر توجہ اسی پر مرکوز کئے ہوئی تھی۔

"یہ ہاٹ چاکلیٹ دیکھ رہے ہو نا۔۔۔یہ میں تمہارے سر پر انڈیل دوں گی آگر کوئی بھی فضول بات کی ہر جگہ جِن کی طرح حاظر ہو جاتے ہو"وہ چڑ گئی۔

"میں تمہارے سڑے ہوئے سوال کا جواب ضرور دینا پسند کرتا اگر میرے سامنے اتنی پیاری لڑکی نا بیٹھی ہوتی"الہان کی بات پر جولیانہ نے بلش کیا جس پر دل آویز نے اُسے گُھور کر دیکھا۔

"اچھا پلیز آپ دونوں لڑیں مت"جولیانہ نے ہاتھ بلند کر کے دونوں کو ٹوکا پھر اپنا رخ الہان کی جانب کر لیا۔

"آپ کون ہیں اور اس طرح دندناتے ہوئے ہماری ٹیبل پر کیوں بیٹھ گئے ہیں" وہ دل آویز کا دل رکھنے کے لئے مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ بولی۔

"میں آپ کی دوست دل آویز کا کلاس فیلو اور بہت ہی اچھا بلکہ چہیتا دوست ہوں" وہ دل آویز کے ہاتھ سے ہاٹ چاکلیٹ کا مگ لیتے ہوئے بولا

"حد ہوتی ہے غریب کبھی کچھ اپنے پیسوں سے بھی لے لیا کرو اور پہلی بات تو ٹھیک ہے مگر یہ جو اِس نے دوسری بات کہی ہے نا سراسر جھوٹ ہے" وہ ناک بُھلاتے ہوئے بولی تو جولیانہ کھکھلا کر ہنس دی۔

"اُف آپ دونوں کتنا لڑتے ہیں" اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔

"میں نہیں یہ بلی لڑتی ہے مجھ سے میں تو ایک معصوم بھولا بھالا سا شریف انسان ہوں" وہ اپنی شرٹ کا کالر آگے کرتے ہوئے مصنوعی معصومیت سے بولا۔

"جی مجھے معلوم ہے آپ کتنے شریف ہیں اب یہاں سے تشریف لے جانے کا کتنا لو گے تم" دل آویز تیوری چڑھا کر بولی۔

"اپنی زبان منہ میں رکھنے کا کتنا لو گی تم" الہان نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔

"اور لڑائی ختم کرنے کا کتنا لینگے آپ دونوں" جولیانہ نے دونوں کو بے بسی سے دیکھا اور اگلے ہی پل تینوں کھکھلا کر ہنس پڑے۔

☆...☆...☆

اینا اورنگزیب آفس کی راہداری میں دونوں ہاتھ کوٹ کی جیب میں مقید کئے بہت اطمینان سے میر آہل کے آفس کی سمت جا رہی تھی۔

اس نے سیاہ رنگ کی جینز اور سفید ٹی شرٹ کے اوپر کافی براؤن کلر کا لمبا سا کوٹ پہن رکھا تھا۔ پیروں میں سیاہ رنگ کے چمکدار لونگ بوٹس پہن رکھے تھے جو ٹخنوں سے کچھ اُوپر تک آتے تھے۔

بالوں کو ہلکا سا کرل کر کے کندھوں پر پھیلا رکھا تھا۔ چہرہ کسی بھی قسم کے میک اپ سے پاک تھا۔ اس کی آنکھیں لال سرخ ہو رہی تھیں اور گلابی چہرہ ستا ہوا نظر آتا تھا۔

اس نے ہاتھ ابھی دروازے کے ہینڈل پر رکھا ہی تھا کہ مائیکل نے اُسے پیچھے سے روکا۔

"میم۔۔۔ سر ابھی مصروف ہیں"

اینا نے انگارا ہوتی نظروں سے گردن ترچھی کر کے مائیکل کو مسکرا کر دیکھا۔

مائیکل کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ہلکی سی سنسناہٹ محسوس ہوئی اس کی مسکراہٹ چٹان سے بھی زیادہ سخت تھی وہ مزید کچھ نا کہہ سکا۔

اینا اور نگزیب دروازہ دھکیلتے ہوئے آفس میں داخل ہو گئی تو مائیکل بھی اس کے پیچھے پیچھے آفس کے اندر آگیا۔

میر آہل کی انگلیاں کی بورڈ پر متحرک تھیں۔ وہ کام میں کافی مصروف دکھائی دے رہا تھا اور اینا اور نگزیب کی اچانک آمد نے اُسے ڈسٹرب کر دیا تھا۔ اس نے آئی بروز اُچکا کر اینا اور نگزیب کو دیکھا اور اس کے پیچھے اندر آتے مائیکل کو۔

"سوری سر مگر میں نے" میر آہل نے ہاتھ جھلا کر اُسے باہر جانے کو کہا تو وہ ان دونوں کو تنہا چھوڑ کر باہر چلا گیا۔

"میں تمہارا یہ بچپنا مزید برداشت نہیں کروں گا اینا" وہ لیپ ٹاپ کی اسکرین نیچے کرتے ہوئے اطمینان سے پاور سیٹ پر ٹیک لگاتے ہوئے تنبیہی انداز میں بولا

"میں بھی تمہاری بے رخی اب مزید برداشت نہیں کروں گی آہل" کہتے ہوئے وہ دو قدم مزید قریب آئی خاموش کمرے میں اینا اور نگزیب کے بوٹس کی ٹھک ٹھک نے آہل کے ماتھے پر سلوٹوں کا جال بچھا دیا تھا۔

"دل آویز میری بیوی ہے" وہ سابقہ انداز میں کرسی کو دائیں بائیں جُھلاتے ہوئے بولا

“You’re rejecting me Ahil. You know”I am a crazy bitch“

اس نے ٹیبل پر دونوں ہتھیلیاں جما کر جھکتے ہوئے آہل کی نظروں میں جھانکا۔

“Touch her If you dare Aina. You know, I am unforgivable”

وہ بھی تھوڑا سا آگے کو جُھکتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے اُسی کے انداز میں بولا بلکہ اُسے خبر دار کیا۔

اینا کے چہرے پر سرد مسکراہٹ برقرار تھی مگر اس نے اپنی نظریں میر آہل کے چہرے سے نہیں ہٹائی۔

"ٹھیک ہے میر آہل ایسا ہے تو پھر ایسا ہی سہی" وہ بنا پلٹے پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

آفس سے نکلتے ہی اینا کے تاثرات مزید سخت ہو گئے تھے۔ مائیکل نے دور سے اُسے آفس کی راہداری عبور کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

☆...☆...☆

دل آویز کلاس روم میں موجود اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی اور الہان بھی اس کے ٹھیک پیچھے والی کرسی پر براجمان تھا۔ لیکچر شروع ہونے میں ابھی دس منٹ باقی تھے۔

"اے بلی۔۔۔ شُو۔۔ شُو۔۔ سنو نا" الہان بار بار اسے پیچھے سے آوازیں دے رہا تھا جسے دل آویز جان بوجھ کر اَن سنا کر رہی تھی۔

"سڑی ہوئی عورت سن لو نا" وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔

"عورت کسے کہا چُسے ہوئے آم کی کالی گٹھلی" دل آویز نے فوراً گردن موڑتے ہوئے اُسے غصے والی نظروں سے دیکھا۔

"ہاں تو کب سے بلا رہا تھا تب تو سنی نہیں تم نے" وہ چڑ گیا۔

"اچھا بولو کیا تکلیف ہے تمہیں" اس نے بحث نا کرنے کو ترجیح دی۔

"پلیز نوٹس دے دو، میں لیکچر شروع ہونے سے پہلے پہلے کاپی کر لوں گا۔ ویسے بھی پروفیسر پیٹر نئے آئے ہیں، میں نہیں چاہتا ان کے سامنے میرا امیج خراب ہو" الہان ملتجیانہ انداز میں بولا۔

"اچھاتو پروفیسر جبران کے سامنے کونسا تمہاری اِمیج اچھی تھی پڑھائی کے معاملے میں۔۔۔کچھ دنوں میں پروفیسر پیٹر بھی تمہاری حرکتوں سے واقف ہو ہی جائے گے کہ تم کتنے پانی میں ہو۔اس لئے اپنے رائی کے دانے جتنے دماغ پر زیادہ بوجھ مت ڈالو اور چپ چاپ مجھے یہ سوالات حل کرنے دو"

دل آویز نے اپنے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے الھان کو تیکھا سا جواب دیا۔

"نہایت ہی بے مروّت عورت ہو تم" الھان نے پیچھے سے اس کے بال کھینچ کر کہا۔

اس سے پہلے وہ اُسے کوئی رد عمل ظاہر کرتی کلاس روم کا دروازہ کھول کر پروفیسر پیٹر اندر داخل ہوئے تو کلاس میں موجود تمام اسٹوڈنٹس اپنی اپنی جگہوں پر آرام سے بیٹھ گئے۔

دل آویز نے سامنے کھڑے فارمل سوٹ میں ملبوس درمیانے قد اور مناسب شکل وصورت والے شخص کو غور سے دیکھا تھا۔

پیٹر کی نیلی آنکھوں میں دل آویز کا عکس رَچ بس گیا تھا۔وہ شخص بھی کچھ سیکنڈز دل آویز کو خاموشی سے دیکھتا رہا۔اس کی نظروں سے شناسائی جھلک رہی تھی۔اُس کی نیلی آنکھوں نے دل آویز کے ذہن کے پنوں پر کچھ مہینوں پہلے کی وہ ایک ملاقات کھول کر بکھیر دی۔

وہ پروفیسر پیٹر سے پہلے پاکستان سے انگلینڈ آتے ہوئے فلائٹ میں مِل چکی تھی۔وہ بلکل اس کے برابر میں براجمان تھا، پھر برمنگھم ایئرپورٹ پر پیٹر نے اس سے سرسری سی بات چیت بھی کی تھی۔

دل آویز نے اس کا دیا ہوا کارڈ جس پر اس کا نام اور نمبر موجود تھا وہیں برمنگھم ایئرپورٹ کے ڈسٹ بن میں ڈال دیا تھا۔

لیکچر ختم ہونے کے بعد وہ کیفے ٹیریا آگئی تھی۔دوسرا لیکچر شروع ہونے میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا اور آج اُس کا سر بہت درد کر رہا تھا۔

وہ کاؤنٹر سے کافی کا کپ اٹھا کر تھوڑے فاصلے پر رکھیں ٹیبلوں میں سے ایک پر آکر بیٹھ گئی پھر اپنے بیگ سے ایک سیاہ جلد والی کتاب نکالی اور کچھ لکھنے لگی۔

کافی کاسِپ لیتے لیتے وہ پورے انہماک سے کتاب میں کچھ لکھ رہی تھی۔ جب اس کی نظر سیاہ رنگ کے جوتوں پر پڑی جس کا رُخ اُسی کی جانب تھا۔ اس نے سرعت سے نظر اٹھا کر دیکھا تو پروفیسر پیٹر اس کے سر پر کھڑے مسکرا کر اُسے دیکھ رہے تھے۔ وہ یکدم کتاب بند کر کے کھڑی ہو گئی۔

"ارے آپ کھڑی کیوں ہو گئیں"

"ایسے ہی" وہ جھجکی

"کہیں میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کر دیا دل آویز" وہ مسکرا کر گویا ہوئے۔

"نہیں۔۔۔ اٹس اوکے پروفیسر" اس نے مسکرانے کی بھی کوشش نہیں کی۔

"دنیا کتنی چھوٹی ہے نا دیکھیں کس نے سوچا تھا میں اور آپ، پھر سے یہاں ایسٹن میں ملیں گے" دل آویز کو سمجھ نہیں آیا کہ وہ ان کی بات کے جواب میں کیا کہے۔

وہ شخص کیوں بلاوجہ اس سے بات کر رہا تھا۔ اگر وہ اس کا پروفیسر نا ہوتا تو دل آویز اس کی بات سننا بھی پسند نہیں کرتی جیسا اس نے ایک بار پہلے کیا تھا۔

"آپ کم بولتی ہیں یہ مجھ سے بات کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتیں؟" اُسے دل آویز کی خاموشی کچھ خاص ہضم نہیں ہوئی۔

"ایسی کوئی بات نہیں" کتاب پر اس کی گرفت مزید سخت ہوئی۔

"اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو یہ کافی کا کپ ختم ہونے تک کمپنی دے سکتا ہوں" وہ ٹیبل پر رکھے کپ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

دل آویز نے گومگو باری باری پروفیسر پیٹر اور پھر کافی کے کپ کو دیکھا اس سے پہلے کے دل آویز کچھ کہتی الہان اُجلت میں بھاگتا ہوا دل آویز کے پاس آیا۔

"دل آویز تم یہاں ہو میں تمہیں پوری یونیورسٹی میں ڈھونڈ رہا ہوں" اس نے پاس کھڑے پروفیسر پیٹر کو نظر انداز کر دیا تو دل آویز پزل ہوئی۔

"اب شکل کیا دیکھ رہی ہو چلو کافی بعد میں پی لینا" اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور سیدھا دل آویز کو کھینچتے ہوئے کیفے ٹیریا سے باہر لے گیا۔

پیٹر نے کینہ پرور نگاہوں سے الہان کو دیکھا تھا جو دل آویز کو کھینچتے ہوئے کیفے ٹیریا کے باہر لے جا رہا تھا۔ اس نے زور سے مٹھیاں بھینچ لیں۔

☆...☆...☆

الہان اور دل آویز خاموشی سے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ وہ دونوں کیفے کی حدود سے کافی دور آ گئے تھے۔

"تھینک یو الہان" وہ اچانک بولی

الہان جو دونوں ہاتھ اپنی براؤن جیکٹ کی جیب میں ڈالے خاموشی سے نیچے دیکھتے ہوئے چل رہا تھا یکدم رُکا اور گردن ترچھی کر کے برابر میں چلتی دل آویز کو دیکھا۔

"ک۔۔ کیا کہا تم نے" اسے لگا دل آویز مزاق کر رہی ہے۔

"تھینک یو الہان" وہ رک کر اُسے متشکر نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی

"لگتا ہے آج سورج مغرب سے نکلا ہے" وہ دل آویز کو چھیڑتے ہوئے بولا تو وہ بھی ہنس دی۔

"خیر چونکہ بد قسمتی سے تم میری دوست ہو تو تمہیں پروفیسر پیٹر جیسے چِیپ لوگوں سے پروٹیکٹ کرنا میرا فرض ہے۔" وہ سر کو آگے جُھکاتے ہوئے بولا۔

"اچھا اور تمہارا خود اپنے بارے میں کیا خیال ہے" دل آویز اس کی ٹانگ کھینچتے ہوئے بولی۔

"For your kind information I'm not cheap, I'm expensive, that everyone cannot afford"

وہ تشن سے جیکٹ کے کالر کو اوپر اٹھاتے ہوئے بولا تو دل آویز نے اپنے بلند ہوتے قہقہہ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"اللہ موت دے دیں مگر کسی کو خوش فہمی نہ دیں"

توجواباً الہان نے سڑا ہوا منہ بناتے ہوئے دل آویز کو دیکھا اور افسوس سے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"یقین کرو مجھے تم جیسے لوگوں سے بڑی ہمدردی ہوتی ہے"

وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے بولا

"کیوں؟"

دل آویز نے مستفسرانہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

"کیونکہ اندھوں کے لئے یہ دنیا بڑی مشکل ہے"

یہ کہہ کر وہ باہر کے دروازے کی سمت چل پڑا اور دل آویز اس کے پیچھے پیچھے لپکی۔

"اندھا کسے کہا تم نے خرڈوس"

اُن کی نوک جھوک ایک بار پھر شروع ہو گئی تھی جو تا قیامت چلنے والی تھی۔

☆...☆...☆

دل آویز ہمیشہ کی طرح کچن میں رات کے کھانے کی تیاریاں کر رہی تھی۔

سیاہ کمیز اور ٹراؤزر پر اس نے سفید رنگ کا ایپرن پہن رکھا تھا۔ سفید شیفون کا دوپٹہ پاس کاؤنٹر پر رکھا ہوا تھا اور سیاہ گھنے بالوں کا ڈھیلا سا جُوڑا باندھا ہوا تھا۔ جس میں سے دو لٹیں لاپرواہی سے چہرے پر بکھری ہوئی تھیں۔

وہ اس وقت کچن میں تنہا تھی۔ شیف آریان اور ہیلپر جیری کو اس نے اپنے اپنے کمروں میں بھیج دیا تھا۔

اُن دونوں کا اس کے سر پر کھڑا رہنا اُسے بلکل بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔

وہ پورے انہماک سے چوپنگ بورڈ پر سلاد کے لئے پیاز اور کھیرے کاٹ رہی تھی۔

جب اُس کی سماعتوں میں میر آہل کی گاڑی کی آہٹ گونجی، وہ گھر آچکا تھا۔ مگر وہ بنا کوئی ردعمل دیئے اپنے کام میں مشغول رہی جب آہل کے قدموں کی چاپ اُسے قریب آتی سنائی دی۔

اُس نے فوراً سے گردن اوپر اٹھائی تو دیکھا کچن کے دروازے پر میر آہل سینے پر ہاتھ باندھے اُسی کو گھور رہا ہے۔ وہ لمحے بھر کے لئے پزل ہوئی۔

جب بھی وہ دل آویز کو ایسے دیکھتا تھا تو اس کا دل ہزار کی اسپیڈ سے دھڑکنے لگتا تھا۔ اس وقت بھی اسے اپنی دھڑکن کی رفتار تیز ہوتی محسوس ہوئی، اتنی تیز کہ دل سینہ توڑ کر باہر آجائے گا۔

"دل آویز"

وہ ایک قدم قریب آیا۔

اُف جب بھی وہ اسکا نام لیتا تھا تو اسے لگتا تھا۔ اس نے اس سے زیادہ دلکش آواز پہلے کبھی نہیں سُنی ہے۔

"جی"

وہ بمشکل بولی

میر آہل کو سمجھ نہیں آیا کہ وہ بات کا آغاز کیسے کرے اور کیا بات کرے۔

"تمہارا لیپ ٹاپ" وہ رکا

"جی"

وہ اس کی جھجک محسوس کر سکتی تھی۔

"تمہارا لیپ ٹاپ میں نے جولیانہ سے کہہ کر منگوالیا ہے۔ اب تمہیں اسٹڈیز میں کوئی مشکل نہیں ہو گی" وہ گلہ کھنگال کر ہلکا سا مسکرایا۔

"جی"

اُسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ مزید کیا کہے۔

"جی سے آگے آپ کے الفاظ ختم ہو گئے ہیں"

وہ زچ ہو گیا۔

"جی"

وہ یکدم بوکھلائی پھر زبان دانتوں تلے دبادی۔

میر آہل اُسے گھورتے ہوئے بلکل اس کے این مقابل آکر کھڑا ہو گیا۔

"کبھی بے رحم شیرنی کی طرح تنز کے تیر برساتی ہو تو کبھی کانوں کو ایک ایک لفظ کے لئے ترسا دیتی ہو"

وہ کہتے کہتے بلکل اس کے بل مقابل آکر کھڑا ہو گیا۔ دل آویز پیچھے کاؤنٹر سے جا لگی۔ میر آہل نے اپنا ایک ہاتھ کاؤنٹر ٹاپ پر جمار کھا تھا اور دوسرا اپنی پشت پر، اس نے آہستگی سے دل آویز کی آنکھوں میں دیکھتے ہوا کہا۔

"یہ اندازِ ستم کدھر سے سیکھا ہے تم نے۔۔۔ مسز۔۔۔ میر۔۔۔ آہل"

اُس نے آخری کے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا اور پھر دل آویز کے تاثرات دیکھنے کے لئے گردن ہلکی سی ترچھی کی اور اس کا معصوم سا نورانی چہرہ دیکھ کر زیر لب مسکرایا۔

میر آہل کے وجود سے اٹھتی مدہوش کر دینے والی خوشبو ایک بار پھر اُس پر سوار ہونے لگی تھی۔ اس نے سہم کر اپنی آنکھیں موند لیں۔

وہ جب اتنے پاس ہوتا تو اُسے لگتا کہ اُس کی سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں ختم ہو گئی ہیں۔

میر آہل اُسے مسکرا کر دیکھتے ہوئے ایک قدم پیچھے ہٹا تو دل آویز کی سانس جو درمیان میں کہیں اٹک گئی تھی بحال ہوئی مگر اس نے آنکھیں کھولنے کی حماقت نہیں کی۔

میر آہل کو اس کا سہما سہما سا وجود اور حیا سے گری ہوئی پلکیں اپنے دل کے اندر پیوست ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔

مزید اگر وہ یہاں رُکتا تو ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ جاتے۔

اس لمحے اُسے محسوس ہوا کہ اگر وہ اس کے قریب رہی تو اس کا دل مزید مزاحمت نہیں کر سکے گا۔

وہ ٹائی ڈھیلی کرتے ہوئے کچن سے نکل گیا اور دل آویز کچن کاؤنٹر کا کنارے تھامے گہری گہری سانسیں لے کر خود کو کمپوز کرنے لگی۔

☆...☆...☆

اگلے روز وہ لندن کسی میٹنگ کے سلسلے میں چلا گیا تھا۔ دل آویز کو یہ خبر جولیانہ سے معلوم ہوئی۔

اور یہ سنتے ہی اس کا چہرہ اداسی سے لٹک گیا تھا۔

اُس کی اُداسی جولیانہ اور الہان نے بخوبی محسوس کی تھی۔

جولیانہ کو اندیشہ تھا کہ یہ خبر دل آویز کو یقیناً اُداس کر دیگی اس لئے وہ اور الہان دل آویز کو دی الیکٹرک سینیما لے آئے تھے۔

الہان نے خاص طور پر (دی واریر) کی تین ٹکٹس بُک کروائی تھیں۔ اُسے تھرلر، ایکشن موویز بے حد پسند تھیں اور اُسے امید تھی کہ دل آویز اور جولیانہ کو بھی یہ فلم پسند آئے گی۔

"بہت عجیب انسان ہے یہ اونہوں" وہ گم سم سی دل ہی دل میں اُسے کوسنے لگی۔

ناجانے کیوں اُسے آہل کا بن بتائے لندن جانا اتنا کھل رہا تھا۔

"ویسے بھی کونسا وہ پہلے کبھی مجھ سے کہیں جانے کی اجازت لیتے تھے جو اب لینگے" اس نے اپنے معصوم سے دل کو تسلی دی لیکن پھر بھی دل کو تسلی نہ ہوئی۔

"اُداس مت ہو دل آویز میں اور الہان ہیں نا آپ کو کمپنی دینے کے لئے" وہ دل آویز کو بہلانے لگی۔

"ارے چھوڑو جولیانہ یہ تو روتوں ہے ایک نمبر کی" الہان زِچ ہوا۔

"تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے الہان؟" دل آویز یکدم سنجیدہ ہو گئی۔ آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیر رہی تھی اور چہرہ بلکل سپاٹ تھا۔

وہ تینوں دی الیکٹر کی ملحقہ سروس روڈ پر کھڑے تھے۔ سامنے سڑک پر ہلکا پھلکا ساٹرافک تھا۔

"اُفف محبت وہی گھسا پٹا سا موضوع دنیا میں اور بھی بہت سے کام ہیں کرنے کو بلی" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔

"تمہیں ابھی ہوئی نہیں ہے نا اس لئے ایسے بول رہے ہو جس دن ہو جائے گی نا اُس دن لگ پتا جائے گا پھر دنیا کا ہر دوسرا کام تمہارے لئے غیر اہم ہو جائے گا"

وہ اپنے عنابی رنگ کے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے اپنے بوٹ کے تسموں کو گھورتے ہوئے بولی۔

"یار جولی میں سامنے سڑک پر لیٹ رہا ہوں پلیز میرے اوپر سے ٹرک گزار دینا میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر ریکویسٹ کرتا ہوں" الہان کا دل کیا وہ اپنا سر پیٹ لے۔

"یار کیا آپ دونوں ہمیشہ لڑتے رہتے ہیں بھئی فلم شروع ہونے والی ہے" وہ اپنی کلائی پر بندھی گھڑی ہوا میں لہراتے ہوئے بولی۔

"ہاں تو اس بطخ سے کہو کہ رونا گانا بند کرے" وہ اسٹریٹ لائٹ کے کھمبے سے ٹک کر بولا

"پہلے تو تم مجھے اپنے بھائی بہنوں کے نام سے پکارنا بند کرو" دل آویز گھور کر بولی۔

"اُف یار تم دونوں پہلے تو لڑنا بند کرو" ہمیشہ ان دونوں کی تُوں تُوں میں میں۔۔۔ میں جولیانہ سر پکڑ کر رہ جاتی تھی۔

"جب دیکھو شروع ہو جاتے ہو دونوں۔۔ میں تو جا رہی ہوں اندر آپ دونوں کی جنگ ختم ہو جائے تو آ جانا" وہ عمارت کے مرکزی دروازے کی جانب چل پڑی۔

"دیکھ لونگی میں تمہیں چمپینزی کی اولاد" دل آویز اس کو انگلی دکھاتے ہوئے جولیانہ کے پیچھے چل پڑی۔

"مجھے دیکھو گی تو اندھی ہو جاو گی میری چمک تمہاری آنکھیں سہن نہیں کر پائے گی" الہان بھی اس کے پیچھے پیچھے عمارت کے اندر چلا گیا۔

دوسری جانب میر آہل لندن میں واقع ویسٹ منسٹر برج پر کھڑا دونوں ہاتھ برج کی ریلنگ پر جمائے نیچے بہتے سمندر میں خود کے عکس کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

نظر اٹھا کر دیکھو تو سامنے لندن آئی جلتر نگ سا اپنی آب و تاب پر تھا۔

لندن آئی دنیا کا سب سے بڑا کینٹیلیورڈ آبزرویشن وہیل تھا۔ جس کا تصور اور ڈیزائن مارکس بار فیلڈ آرکیٹیکٹس نے کیا تھا اور اسے 2000 میں لانچ کیا گیا تھا۔ اس نے قومی اور بین الاقوامی سیاحت، شاندار تعمیراتی معیار اور انجینئرنگ کی کامیابیوں کے لیے 85 سے زیادہ ایوارڈز بھی جیتے تھے۔

یہ لندن کی خوبصورت جگہوں میں سے ایک تھی مگر یہاں کی خوبصورتی بھی میر آہل کے دل کو تسکین نہیں دے پا رہی تھی۔

ماضی میں رونما ہونے والے کچھ واقعات نے میر آہل کی زندگی کو از سر نو بدل کر رکھ دیا تھا۔ اپنے پیروں پر کھڑی وہ چمکتی ہوئی شاندار سی حویلی نے اس کے ماں باپ کو نگل لیا تھا۔

اُس نے جیب سے تہہ شُدہ مخملی رُومال نکالا جس میں اس نے نیلے سبز رنگ کا فیروزہ پتھر احتیاط سے رکھا ہوا تھا۔

یہ محض پتھر نہیں تھا بلکہ ایک ایسا گھناؤنا راز تھا جس نے اس کے دل کو ناسور بنا دیا تھا۔

وہ نا جانے کتنی دیر وہاں کھڑا اپنے ماضی کے دردناک پلوں کو یاد کرتا رہا تھا۔

"کیا زندگی کو چند تکلیف دہ لمحات کے پیچھے خرچ کر دینے سے دل کے زخم بھر جاتے ہیں؟"

اُس نے شام کے سائے میں بہتے سمندر کی موجوں کو سرگوشی کرتے سُنا تھا۔ اور پس منظر میں ایک خوبصورت سا چاند کی چاندنی میں نہایا چہرہ اُبھرا تھا۔

اس نے سر آسمان کی جانب اٹھاتے ہوئے اپنی آنکھیں موند لیں اور ہاتھ دل کے مقام پر رکھ کر مسلنے لگا۔

جلن، تکلیف، چبھن اس کی نرم سی ہنسی کے شور میں زائل ہونے لگی۔

بے قرار دل کو آرام سا آنے لگا۔ چہرے پر مسکراہٹ سی پھیل گئی۔ لندن کی ہوا میں خنکی بڑھ چکی تھی مگر اُسے ناگوار نہیں لگی۔

پیار۔۔۔ آہ پیار کسی (سوموجیل) کی طرح ہوتا ہے۔ دل کے چھالوں پر پڑتے ہی نانی یاد آجاتی ہے مگر جیسے جیسے وقت سرکتا جاتا ہے جلن ختم ہونے لگتی ہے دھیرے دھیرے آرام آنے لگتا ہے۔ کچھ پل کے لئے آپ کو سُن بھی کر دیتا ہے، ذرا سی جھنجھلاہٹ بھی محسوس ہوتی ہے۔۔ پر بہت جلد آرام آ ہی جاتا ہے۔

--- trust me .... It does Yes it gives fast relief from pain,

کیا دل آویز نام کا سوموجیل میر آہل کے دل کے چھالوں کو آرام دے سکتا تھا؟ آہ یہ بھی ایک معمہ تھا جو میر آہل کو خود ہی حل کرنا تھا۔

☆...☆...☆

"مجھے تو مووی بہت اچھی لگی الہان تمہاری پسند لاجواب ہے" جولیانہ، الہان اور دل آویز شانہ بشانہ دی الیکٹرک سینما کی عمارت سے باہر آرہے تھے۔

جُولیانہ۔۔۔۔ الہان اور دل آویز کے درمیان چل رہی تھی اور اس نے دل آویز کے بازوں کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

"آپ کو کیسی لگی مووی دل آویز" جولیانہ نے پرجوشی سے اس کی جانب سر کو زنبش دیتے ہوئے پوچھا۔

"بس ٹھیک ہی تھی مجھے کچھ خاص نہیں لگی" وہ سڑک پر چلتی گاڑیوں کو لاپرواہی سے دیکھتے ہوئے بولی۔ وہ تینوں سروس روڈ پر ساتھ ساتھ چلتے ہوئے باتیں کررہے تھے۔

"اب بندر کیا جانے ادرک کا سواد" الہان لقمہ دیئے بغیر نا رہ سکا۔

"بندر نہیں بندریا" جولیانہ نے کُن اکھیوں سے دل آویز کو دیکھتے ہوئے شرارتی انداز میں کہتے ہوئے الہان کو دیکھ کر آنکھ دبائی تو دل آویز نے فوراً گردن موڑ کر جولیانہ کو گھور کر دیکھا۔

"تمہاری زبان بہت لمبی نہیں ہوگئی ہے جولیانہ کی بچی" دل آویز نے اپنے دائیں کندھے سے اُس کے بائیں کندھے کو دھکا دیا تو وہ الہان سے جا ٹکرائی۔

الہان نے بھی زور سے جولیانہ کو جوابی دھکا دیا تو وہ دل آویز سے اتنی زور سے ٹکرائی کے بیچاری دل آویز برابر والی سڑک پر جاگری وہ تو شکر کہ اُس وقت کوئی گاڑی وہاں سے نہیں گزری ورنہ (ٹام) کی طرح دل آویز کا اسٹیکر بھی سڑک پر چپکا رہ جاتا۔

"میں تم دونوں کو آج چھوڑوں گی نہیں" وہ زمین سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"جُولی بھاگو" الہان اور جولیانہ قہقہہ لگاتے ہوئے پاگلوں کی طرح سڑک پر بھاگنے لگے اور دل آویز اُن دونوں کے پیچھے۔

دور سے دیکھو تو ایسا لگتا تھا تین کارٹون یُو-ایچ-یُو کا نشہ کر کے سڑک پر ٹانڈو کر رہے ہیں۔

☆...☆...☆

وہ اسٹڈی ٹیبل پر کتاب کھولے گُم سُم سی بیٹھی کھڑکی سے باہر نظر آتے گارڈن کو دیکھ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ رنگوں کی بہار آگئی ہے مگر پھر بھی ایک عجیب سی اُداسی تھی۔

جب تک الہان اور جولیانہ اس کے ساتھ تھے تب تک وقت صحیح چل رہا تھا۔ مگر اس کمرے کی چار دیواری میں وقت تھم سا گیا تھا۔ گھڑی کے کانٹے سُست روی سے چل رہے تھے۔

جیسے اُنہیں بھنک لگ گئی ہو کہ دل آویز وقت کے گزرنے کا انتظار کر رہی ہے۔

سامنے ٹیبل پر کتاب کُھلی پڑی تھی جس پر دل آویز نے اپنی بانہیں پھیلا رکھی تھیں۔ اُس نے کرسی سے ٹیک لگا رکھا تھا اور اُس کے لمبے گھنے خوبصورت بال آدھے پیچھے اور آدھے بائیں کندھے سے پھسل کر آگے کو گرے ہوئے تھے۔

وہ نہیں تھا تو اُس گھر کا ہر کونا ویران پڑا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر موجود وہ کُرسی جس پر ہر صبح اور رات کے کھانے کے دوران وہ بیٹھ کر کَن اکھیوں سے دل آویز کو دیکھا کرتا تھا۔ آج سُونی پڑی تھی۔

اُسے گئے پورا ایک دن گزر گیا تھا مطلب دو صبح ایک رات اور ایک شام۔

وہ اُسے یاد آ رہا تھا۔ وہ اس کے ارد گرد نہیں تھا تو اُسے لگ رہا تھا کہ وہ کسی زندان میں قید ہو گئی ہے۔

بظاہر وہ دونوں بہت کم بات چیت کرتے تھے۔ الگ الگ کمروں میں رہتے تھے مگر ہر روز میر آہل کے لئے ناشتہ اور رات کا کھانا بنانا اُسے اچھا لگتا تھا۔

چاہے وہ منہ سے اُس کی تعریف کرے یا نا کرے مگر بار بار اس کے پکائے ہوئے کھانوں سے اپنی پلیٹ بھرنا اُسے اچھا لگنے لگا تھا۔

وہ جانتی تھی اُس کے آنے سے میر آہل کی ڈائیٹ پلان کا ستیاناس ہو گیا تھا مگر اس کے باوجود بھی ہر رات اس کی بنائی ہوئی چپاتیاں وہ بڑے انہماک سے کھایا کرتا تھا۔

پھر چاہے اُسے جِم میں دو کے بجائے چار گھنٹے ہی ورک آؤٹ کیوں نہ کرنا پڑے۔۔۔ وہ جِم میں چار گھنٹے زیادہ لگاتا تھا مگر کھانے کی ٹیبل پر موجود کسی بھی ڈِش کو وہ چکھے بغیر کرسی سے اُٹھتا نہیں تھا۔

میر آہل اس بات سے شاید انجان تھا مگر اُس کی ڈانٹ، اس کا سہادینے والا غصہ یہاں تک کہ اُس کی سخت گرفت میں بھی دل آویز کو ایک تحافظ سا محسوس ہوتا تھا۔

میر آہل کا ہر لمس، ہر نظر، ہر بات، ہر احساس اُسے بار بار شدت سے اس کی یاد دِلا رہا تھا۔

جولیانہ کو لگتا تھا کہ وہ میر آہل کی غصے بھری نظروں کے پیچھے دل آویز کے لئے فکر نہیں دیکھ سکتی تھی مگر یہ بات کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ ایک دل آویز ہی تھی جو اُس کی ہر نظر ہر انداز پہچان سکتی تھی۔

وہ اُس کا محرم تھا۔۔۔ اُس کا نگہبان۔۔۔ اُس کا سب سے مضبوط سہارا۔

مگر جس روز اس نے اپنا اور نگزیب کو میر آہل کے قریب بہت قریب دیکھا تھا۔

اس دن دل آویز کے اندر کچھ بہت زور سے ٹوٹا تھا۔ وہ کیا تھا اُسے خود معلوم نہیں تھا مگر اس شور کی بازگشت اس رات دل آویز کے دل کی ہر دیوار سے ٹکراتی رہی تھی۔

کیوں سارے عذاب دل کو ہی جھیلنے پڑتے ہیں۔ دماغ خراب ہو جائے تو بندہ سائیکالوجسٹ کے پاس جاسکتا ہے پر دل کا مرض لے کر کس کے پاس جائے؟

دل کو تندرست کرنے کی بھی کوئی دوا یہ تھیراپی ہونی چاہئے تھی۔

وہ اُٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی۔ کھڑکی کا پٹ آدھا کھلا ہوا تھا۔ ہوا کے ایک نازک سے جھونکے نے اس کے بالوں کو ہلکا سا بکھیر دیا تھا۔

کمرے کی درودیوار اس کو کاٹنے کو دوڑ رہی تھی وہ بستر پر رکھے اپنے دوپٹے کو گلے میں ڈال کر باہر گارڈن میں چہل قدمی کے لئے نِکل آئی۔

وہاں موجود کھلے رنگ برنگی پھول بھی اُسے مرجھائے ہوئے لگ رہے تھے۔ اس نے سر اٹھا کر چاند کی جانب دیکھا تو وہ بھی بوجھل سا دل آویز کے چہرے کو تک رہا تھا۔

رات کی جان لیوا تنہائی نے آج برسوں بعد دل آویز کو پھر آگھیرا تھا۔ ناجانے کب ایک آنسوں اُس کی پلکوں سے ٹوٹ کر زمین پر جاگرا۔

آج برمنگھم شہر اُداس ہو گیا تھا کیونکہ اس زمین پر میر آہل کو یاد کرتے ہوئے دل آویز کے آنسوں جو گرے تھے۔

☆...☆...☆_

میر آہل اس وقت اپنے پرائیویٹ جیٹ میں موجود اپنی سیٹ سے ٹیک لگائے لندن سے واپس برمنگھم جا رہا تھا۔ وہ ایک نظر کبھی کھڑکی سے باہر نظر آتے روئی جیسے بادلوں کو دیکھتا تو کبھی گاہے بگاہے پاس بیٹھے مائیکل کو۔۔۔۔ جو بے آرام دَست لگے مریض کی طرح پہلو پر پہلو بدل رہا تھا۔

"سر آپ اِس معمولی سی میٹنگ کو اٹینڈ کرنے لندن آ گئے یہ کام تو آپ اسکائپ پر بھی آرام سے کر سکتے تھے "مائیکل کو بھی نا جانے بیٹھے بٹھائے کیا سُوجا جو یہ سوال کر دیا۔

میر آہل نے گہری سانس کھینچ کر ضبط سے برابر میں بیٹھے مائیکل کی طرف پورا رُخ کر کے دیکھا جو ہاتھ کا مُکا ٹھوڑی کے نیچے ٹکائے اُسی کو دیکھ رہا تھا۔ اگر وہ اس وقت ہزاروں فٹ کی بلندی پر نا ہوتا تو یقیناً اس بکواس سے سوال پر میر آہل مائیکل کو نکال باہر کرتا۔

"مائیک فرسودہ سوالات کرنے سے گریز کرو ورنہ میں تمہیں پلین سے بنا کسی پیراشوٹ کے ہی دھکا دے دوں گا" وہ کافی کا سِپ لیتے ہوئے اطمینان سے بولا۔

"سر آپ کیوں خود پر اتنا ظلم کر رہے ہیں میری بات مان کر تو دیکھیں" وہ گیانی بابا والے انداز میں بولا۔

"میں نے زندگی میں کبھی کسی لڑکی کو پھول نہیں دیئے ہیں مائیک "میر آہل نے جیسے ہتھیار ڈال دیئے۔

"سر وہ کوئی لڑکی نہیں آپ کی خود کی بیوی ہے" وہ ہاتھ نچا کر بولا تو میر آہل نے اُسے ٹھوکا دیا۔

"ارے سر آپ بس ہاں کہیں آپ کی طرف سے دل آویز میم کو پھول میں دے دوں گا" اُس نے چٹکی بجا کر مسئلہ ہی حل کر دیا تو میر آہل نے اُسے گھور کر دیکھا۔

"سب کچھ خود طے کرے بیٹھے ہو تم تو پھر انتظار کس بات کا ہے" وہ زِچ ہوا

"آپ کی ہاں کا سر" وہ فٹ سے بولا تو میر آہل کی ہنسی نکل گئی۔

"مائیک۔۔۔۔ آر یو شیور اُسے ریڈ روزز پسند آئے گے" وہ تصدیق چاہتا تھا۔

"سر ریڈ روزز لڑکیوں کی کمزوری ہوتی ہے اور میم تو ویسے بھی بڑی ٹھنڈی اور نازک مزاج کی ہیں" وہ بات بنانے لگا تو میر آہل نے انگلی سے اپنی ٹھوڑی کھجائی۔

"ہاں تم ابھی اس ٹھنڈی اور نازُک مزاج خاتون کو جانتے کہا ہو بنا چھری کے ہی زبان سے سلاد بنا لیتی ہے میری بیوی" وہ سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔

"سوری سر آپ نے کچھ کہا"

"ہاں میں کہہ رہا تھا کہ تم بلکل ٹھیک کہہ رہے ہو میم کے بارے میں" وہ ٹائی درست کرنے لگا۔

"اوکے سر پھر برمنگھم لینڈ کرتے ہی سب سے پہلا کام میں یہی کروں گا" وہ پرجوش تھا۔

"تم ضرورت سے زیادہ آکسائیٹڈ نہیں ہو رہے مائیک" اُسے ابھی بھی اس خیال پر شبہ تھا۔

"سر مائیکل کے نسخے کبھی فیل نہیں ہوتے۔ میم فریش ریڈ روزز دیکھ کر بہت خوش ہو جائے گی" اُسے اپنے پلان پر پورا بھروسہ تھا۔ میر آہل نے سر کو افسوس سے دائیں بائیں ہلایا۔

مائیکل دنیا کا پہلا انسان تھا جو اپنے باس کی بیگم کو اپنے ہی باس کی جانب سے پھول دینے کے لئے اتنا اکسائیٹڈ ہو رہا تھا۔

مگر وہ اس بات سے بلکل بے خبر تھا کے اس کا یہ پھول دینے والا آئیڈیا بُری طرح سے فلاپ ہونے والا تھا۔

میر آہل نے آرام سے سر پیچھے گرا کر پیر سیدھے کر لئے چہرے پر ایک عجیب سا اطمینان تھا۔

دل آویز کو دیکھے پورے اڑتالیس گھنٹے بیت چکے تھے۔ اس کی ہنسی، اس کی خوشی اس کے آنسوں اچانک سب بہت انمول ہو گئے تھے۔

وہ دل آویز کے لئے جذبات رکھنے لگا تھا یہ الگ بات تھی کہ اُس نے اِن جذباتوں کو ابھی کوئی نام نہیں دیا تھا پر سینے میں دھڑکتے اس آٹھ انچ کے دل میں وہ اب رہنے لگی تھی۔

جب آہل نے پہلی بار اُسے دیکھا تھا تو اُسے دل آویز کو دیکھ کر سخت چِڑ سی ہوئی تھی۔

پھر بی جان کے انتقال کے بعد سے وہ دل آویز کے لئے ہمدردی جیسے جذبات رکھنے لگا۔

اُسے یاد تھا محض ٹکٹس نامل پانے پر دل آویز اس کے ساتھ انگلینڈ نہیں آسکی تھی۔ وہ بہت فکر مند تھا، ایک بے چینی تھی کہ دل آویز وہ دو دن اُس حویلی میں کس طرح بسر کرے گی۔

انگلینڈ آتے ہی اُس نے سب سے پہلے پرائیویٹ جیٹ خریدا تھا۔۔۔ تاکہ پھر ان کے درمیان ایسی دوریاں نا آئے۔ دل سے دور سہی پر میر آہل۔۔۔ دل آویز کو نظر کے سامنے رکھنا چاہتا تھا۔

"جتنا ہوسکے گا مسز میر آہل میں اُس سے تھوڑا زیادہ کروں گا تمہارے لئے" میر آہل دل ہی دل میں سوچ کر مسکرایا تھا۔

اب دل آویز کی فکر کے علاوہ ایک اور چیز تھی جو میر آہل کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ وہ تھی دل آویز کو سوچتے ہوئے اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ۔

☆...☆...☆

(برمنگھم لینڈ کرتے ہی میر آہل نے گھر جانے کے بجائے آفس کا رُخ کیا تھا۔ آفس کے گیٹ اپ میں وہ بلکل فریش اور ایئر جیٹ سا لگ رہا تھا ہمیشہ کی طرح۔

وہ گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر اپنی ٹائی اور کوٹ درست کرتا بلڈنگ کی انٹرنس کی جانب بڑھ گیا۔

دروازے پر کھڑے گیٹ کیپر نے میر آہل کو سلام کرتے ہوئے شیشے کا دروازہ مسکراتے ہوئے کھولا تھا۔

جواباً اس نے ایک نرم سی مسکراہٹ گیٹ کیپر کی جانب اچھالی اور آگے بڑھ گیا۔)

"سر ویسے یہ سرپرائز میری جگہ آپ دل آویز میم کو دیتے تو انہیں زیادہ خوشی ہوتی اور آپ اُن کے چہرے کے تاثرات بھی دیکھ سکتے"

مائیکل نے موبائل کان سے لگاتے ہوئے سامنے دروازے کی جانب دیکھا اور پھر کلائی پر بندھی گھڑی کو...وہ بلکل صحیح وقت پر گھر پہنچا تھا۔ جب دل آویز یونیورسٹی کے لئے نکلنے والی تھی۔

"آئیڈیا تمہارا تھا مائیک مجھے اس میں مت گھسیٹو"

(میر آہل نے لفٹ میں داخل ہوتے ہوئے کان پر لگے بلوٹوتھ کو چُھوا۔

لفٹ کی دیوار میں وہ اپنا عکس دیکھ سکتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح پر وقار اور معتبر۔)

"اٹس اوکے سر آپ ان کی آواز سے ہی اندازہ لگا لیجئے گا کہ وہ کتنا خوش ہونے والی ہیں اس سرپرائز کو دیکھ کر پھر آپ کو یقیناً یہاں موجود نہ ہونے کا پچھتاوا ہو گا" مائیکل حد سے زیادہ پُرجوش تھا۔

(میر آہل نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ اس وقت راہداری سے گزر رہا تھا اور دائیں بائیں بنے کیبنز میں موجود ایمپلائز اُسے اُٹھ اُٹھ کر گِریٹ کر رہے تھے۔ جِسے وہ سر کے اشارے سے ریسیو کرتے ہوئے اپنے آفس کی سمت جا رہا تھا۔)

دوسری جانب روزمرہ کی طرح دل آویز یونیورسٹی جانے کے لئے بلکل تیار تھی۔ جولیانہ دروازے پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"سر دل آویز میم باہر آ رہی ہیں"

مائیکل کی آکسائیٹمنٹ بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔

(میر آہل اپنی پاور سیٹ پر بیٹھ کر دونوں ہاتھ باہم ملاتے ہوئے سامنے ٹیبل کی جانب ہلکا سا جُھکا)

جیسے ہی دل آویز اور جولیانہ گھر سے باہر نکلے مائیکل کو سامنے دونوں ہاتھ مؤدبانہ انداز میں باندھے کھڑا دیکھا۔ دونوں نے تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر مائیکل کے مسکراتے چہرے کو۔

(میر آہل اس لمحے وہاں موجود نہیں تھا مگر وہ دل آویز کی موجودگی کو فون پر سُن سکتا تھا، محسوس کر سکتا تھا)

جولیانہ پیچھے اسٹیپس پر ہی رُک گئی جبکہ دل آویز حیرانگی کے تاثرات لئے دو قدم آگے آئی۔

"میم سر نے آپ کے لئے ایک چھوٹا سا سرپرائز بھیجا ہے" مائیکل مسکراتے ہوئے گاڑی کے سامنے سے ہٹا اور گاڑی کی پچھلی ونڈو کا شیشہ آہستگی سے نیچے ہونے لگا۔

("مائیکل کے بچے میرا نام لینے کی کیا ضرورت تھی" اس نے آہستگی سے سرگوشی کی جو مائیکل کی سماعتوں نے سن لی۔

"ٹرسٹ مِی سر"

اُس کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی)

کھڑکی کا شیشہ نیچے ہوا گاڑی کی پچھلی سیٹ لال گلابوں سے بھری پڑی تھی جس میں سے اٹھتی مہک پیچھے کھڑی جولیانہ تک آرہی تھی۔

دل آویز نے ایک نظر گاڑی کے اندر ڈالی۔۔۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی دل آویز کے منہ سے ایک زور دار چھینک بر آمد ہوئی۔

(میر آہل جھینک کی آواز سن کر پاور سیٹ سے فوراً کھڑا ہو گیا۔۔اُسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہاں آخر ہو کیا رہا ہے)

"آر یُو اوکے میم؟"مائیکل نے فوراً سوال کیا۔

"تمہارے سر کو ریڈ روزز کے سوا دنیا کی کوئی دوسری چیز نہیں ملی تھی سرپرائز دینے کے لئے"دل آویز نے چھوٹتے ہی کہا اور ساتھ ایک چھینک کا اضافہ بھی کیا۔

(میر آہل نے ہونٹ دباتے ہوئے گردن مسلی)

"آ۔۔آ۔۔وہ اُنہیں لگا آپ کو ریڈ روزز پسند ہونگے"مائیکل کو ملک الموت صاف دکھائی دے رہا تھا۔

("مجھے نہیں۔۔۔تمہیں لگا تھا کہ اُسے ریڈ روزز پسند ہونگے ایڈیٹ"میر آہل نے ضبط سے مٹھیاں بھیجتے ہوئے کہا)

مائیکل نے تھوک نِگلا۔۔۔اب میر آہل نام کے شیطان سے اُسے کون بچاتا اُففف بیٹھے بٹھائے یہ کونسی مصیبت گلے پال لی تھی اُس نے۔

"ضروری نہیں ہر لڑکی کو ریڈ روزز پسند ہو مائیکل کہہ دینا اپنے سر سے۔۔۔آہ چھوووو"ایک اور چھینک اس کے منہ سے خارج ہوئی تو جولیانہ فوراً دوڑ کر دل آویز کے پاس آئی۔

"اب کھڑے کیوں ہو ہٹاؤ اِسے یہاں سے دیکھ نہیں رہے اُن کو الیرجی ہے ریڈ روزز سے"جولیانہ نے دل آویز کو شانوں سے پکڑتے ہوئے مائیکل کو جھڑکا تو مائیکل کو ہوش آیا اس نے فوراً ڈرائیور سے گاڑی آگے لینے کو کہا۔

"مائیکل یو آر ڈیڈ ناؤ"میر آہل فون پر دھمکی دیتے ہوئے بولا شکر وہ اس وقت یہاں موجود نہیں تھا ورنہ مائیکل کا جنازہ تو پکا تھا۔

جولیانہ اور دل آویز دوسری گاڑی کی جانب بڑھنے لگیں جب مائیکل نے دل آویز کو سہمے ہوئے انداز میں مخاطب کیا۔

"میم۔۔۔ آگر آپ کو ریڈ روزز پسند نہیں تو پھر کونسے فلاورز پسند ہیں؟"

وہ تجسس میں تھا اُسے آج تک یہی لگتا رہا کہ لڑکیوں کو لال گلاب ہی پسند ہوتے ہیں اور پھر لال گلاب انگلینڈ کا قومی پھول بھی تو تھا۔ اُس کی ناقص عقل میں یہ بات کبھی آئی ہی نہیں کہ لڑکیوں کو لال گلاب کے علاوہ بھی کوئی پھول پسند ہو سکتے ہیں۔

("ڈیم مائیکل۔۔۔ اتنی بے عزتی کافی تھی آج کے لئے" میر آہل نے سر مسلتے ہوئے زیر لب کہا)

دل آویز جاتے جاتے آہستگی سے پلٹی بار بار چھینکنے کی وجہ سے اُس کی ناک سُرخ ہو گئی تھی۔

"مجھے"

وہ رُکی

"مجھے ڈیزی پسند ہے"

وہ آہستگی سے مُسکرائی اور ایک نظر اُس کے ہاتھ میں پکڑے موبائل فون پر ڈالی۔

"مجھے ڈیزی بہت پسند ہے" کہہ کر وہ پلٹ گئی۔

میر آہل کے دل کی رفتار آہستہ ہوئی وہ دونوں ہاتھ ٹیبل پر جمائے آگے کو جُھکا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"مجھے ڈیزی بہت پسند ہیں" بس ایک یہی آواز اس کے ارد گرد چکرانے لگی اور آس پاس کا سارا شور مدھم ہوتا چلا گیا۔

کیا چیز تھی وہ۔۔۔ جو میر آہل کے دل و دماغ پر ایسے سوار ہوئی تھی۔ کاش وہ واقعی اِس وقت وہاں ہوتا تو دیکھ سکتا کہ کتنے مان سے دل آویز نے پہلی بار اپنی پسند کا میر آہل سے اظہار کیا تھا۔

"سر۔۔ سر۔۔ کیا آپ مجھے سُن سکتے ہیں" مائیکل کی آواز اُسے دوبارہ ہوش میں لیکر آئی تھی۔

"مائیک میں تمہیں سُن ہی نہیں بلکہ جان سے مار بھی سکتا ہوں" میر آہل نے لفظ چباتے ہوئے کہا۔

"س۔۔ سوری سر" وہ جھجکا

"پندرہ منٹ میں آفس پہنچوں مائیکل اگر سولہواں منٹ ہوا تو تمہاری خیر نہیں" یہ کہتے ہی اس نے بلوٹوتھ کان سے نکال کر سامنے ٹیبل پر اچھال دیا اور خود نڈھال سا اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔

ساری ایزی جی اور آکسائیٹمنٹ کا کچرہ ہو گیا تھا مگر پھر بھی اُسے بُرا نہیں لگ رہا تھا۔

میر آہل کو معلوم نہیں تھا مگر یہ محبت کی وہ سیڑھی تھی جہاں انسان اپنی عزت نفس کو ہنستے کھیلتے آگ لگاتا ہے اور اس وقت اس کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا تھا اور مزے کی بات یہ تھی کہ اُسے پتا ہی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ ایسا ہو گیا ہے۔

خیر عشق بھی انسان سے کیسے کیسے کام کرواتا ہے۔

☆...☆...☆____

گاڑی میں مکمل سناٹا تھا۔ دل آویز ہر دو منٹ بعد ٹِشو سے اپنی ناک رگڑ رہی تھی۔ ہونٹوں کے کناروں پر ہلکے سے گڑھے پڑھ رہے تھے۔ شاید وہ اپنی مسکراہٹ دبا رہی تھی۔ اس نے ایک بار بھی گردن موڑ کر جولیانہ کی جانب نہیں دیکھا تھا۔

وہ مُسلسل کھڑکی کے باہر دیکھے جا رہی تھی۔ اُسے معلوم تھا جولیانہ کب سے اُسے ہی گھورے جا رہی ہے۔

" آہم آہم "

جولیانہ نے شرارتی سے گلہ کھنگالا۔

دل آویز کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔۔ وہ اب بھی کھڑکی کے باہر گھور رہی تھی۔

"اب تو اعتبار آ گیا آپ کو"

وہ سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے رعب سے بولی۔ دل آویز نے مستفسرانہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

"کہ سر بہت زیادہ لوونگ اور کیئرنگ ہیں" وہ بہت زیادہ خوش تھی۔

"ہمم" دل آویز کے منہ سے بس اتنا ہی نکلا۔

دل کا حال لفظ بیان نہیں کر سکتے تھے۔

"ہیں۔۔۔؟بس ہمم۔۔ سیریسلی؟بہت نخرے ہیں آپ کے دل آویز، اگر کوئی میرے لئے ایسا کرتا نہ۔۔۔ اُفففف"

اس نے حسرت سے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے آنکھیں گول گول گُھمائیں تو دل آویز نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔

"خوابوں کی دنیا سے باہر آجاؤ لڑکی"

"باہر ہی ہوں۔۔۔ میرے لئے تو بس یہ خواب ہی ہے جو کبھی پورا نہیں ہو سکتا" اس کے چہرے پر اُداسی پھیل گئی۔ اس کی اُداس آنکھوں نے دل آویز کا دل جکڑا وہ خاموشی سے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔

"آہم آہم" دل آویز نے اس کی جانب رُخ کیا مگر جولیانہ باہر ہی دیکھتی رہی۔

"ویسے کوئی ہے جو آپ کے لئے لال گلابوں کا پورا باغ خرید سکتا ہے" اس نے جولیانہ کے کان پر جھکتے ہوئے شرارتی سے سرگوشی کی تو جولیانہ فوراً سے پلٹی۔

"کیا مطلب؟" اُسے کچھ سمجھ نہیں آیا۔

"مطلب یہ کہ وہ ایک عدد پانچ فٹ دو انچ کا چمپینزی ہے نا۔۔۔ کیا نام ہے اُس کا" وہ مصنوعی انداز میں سوچتے ہوئے بولی۔

جولیانہ سمجھ گئی تھی کہ وہ کس کی بات کر رہی ہے۔

"ہاں یاد آیا۔۔۔ مِسٹر الہان ڈِی سُوزا" دل آویز نے کُن اکھیوں سے جولیانہ کے چہرے پر پھیلتی سُرخی دیکھی۔ وہ شرما کر لال ٹماٹر ہو رہی تھی۔

"آپ کا دماغ چل گیا ہے دل آویز ہم دونوں کہیں سے بھی میچ نہیں کرتے اُس کے اور میرے اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق ہے" وہ لب کاٹنے لگی۔

"محبت سوچ سمجھ کر دل پر حاوی نہیں ہوتی۔ یہ بس ہو جاتی ہے۔ محبت کی کسی بھی منزل پر یہ دنیاوی فلسفے فِٹ نہیں ہوتے کہ سامنے والے کا اسٹیٹس، کاسٹ، نسل کیا ہے۔ محبت زمانے کی بندشوں اور فرسودہ رسموں سے آزاد ایک جذبہ ہے جُولی" دل آویز نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے نرمی سے دبایا۔

"پر الہان مجھے اپنا اچھا دوست سمجھتا ہے" وہ دانت سے اپنے انگھوٹے کا ناخن چباتے ہوئے بولی۔

"ہاں اور اُس دوست کے سر پر سینگ ہیں جو بلاوجہ وہ تم سے دوستی کرے گا" دل آویز نے کہنی سے اُسے ٹہوکا دیا تو کچھ کچھ بات جولیانہ کو بھی سمجھ آنے لگی۔

"Ehmm Ehmm someone is blushing"

دل آویز نے معنی خیز انداز میں کہا تو وہ بلکل ہی سُرخ ہو گئی۔

"اچھا بندوق کا رُخ میری جانب مت کریں میڈم۔۔ یہاں آپ کی اور میر سر کی بات ہو رہی تھی" وہ دل آویز کی ٹانگ کھینچنے کے موڈ میں تھی۔

دل آویز پھر سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور اُسے مسکراتے ہوئے نظر انداز کرنے لگی۔

"بتائیں نا دل آویز آپ کو میر سر کا سرپرائز کیسا لگا" وہ اُسکا بازوں ہلاتے ہوئے بولی۔

"میں یہ احساس لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی جُولی" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

"دنیا میں موجود کوئی بھی الفاظ میرے اس جذبے کو ترتیب نہیں دے سکتے" جولیانہ اُس کی بات سُن کر مسکرائی۔

"میر سر آپ سے محبت کرتے ہیں دل آویز" جولیانہ نے اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"وہ مجھ سے ہمدردی کرتے ہیں جُولی۔۔۔ محبت نہیں اور یہ وہ حقیقت ہے جس کو میں نے اُسی دن قبول کر لیا تھا جب۔۔۔" اس نے زور سے آنکھیں میچی آنکھوں کی پتلیوں پر کچھ پرانی یادیں فلم کی طرح چلنے لگیں۔

(آپ کے کہنے پر میں دل آویز سے شادی کر رہا ہوں بی جان حالانکہ میں اُسے کبھی بھی اپنی زندگی میں شامل کرنے کے حق میں نہیں تھا)

ماضی کسی حولناک سائے کی طرح اس کے وجود پر منڈلانے لگا۔ اُس نے ٹھٹک کر اپنی آنکھیں کھول دیں۔

"ایسا نہیں ہے دل آویز ٹرسٹ مِی میں نے اُن کی نظریں دیکھی ہیں۔ وہ جب آپ کو دیکھتے ہیں تو پھر کسی دوسری شہہ کو نہیں دیکھتے۔۔۔ وہ آپ کو چاہنے لگے ہیں دل آویز"

"میں کہانیاں لکھتی ہوں جُولی پر رہتی حقیقت میں ہی ہوں" وہ بے دھیانی میں نجانے کیا بول گئی تھی اُسے خود بھی نہیں معلوم تھا۔

"کیا مطلب کہانی لکھتی ہوں" جولیانہ اُلجھی۔

"ن۔۔نا۔۔ نہیں کچھ نہیں" اس نے فوراًبات کو وہیں دبا دیا۔

☆...☆...☆

دل آویز بینچ پر بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے ہینڈ بیگ سے ایک سیاہ رنگ کی کتاب نکالی اور مسکراتے ہوئے ہاتھ کتاب کی جِلد پر پھیرا۔۔۔ کتاب کھولتے ہی پہلے صفحے پر خوبصورت سی ہینڈ رائٹنگ میں انگریزی میں "مائے بیٹر ہالف " لکھا تھا۔

اس نے ایک گہری سانس ہوا میں خارج کی۔۔۔ یہ ناول اُس نے تب لکھنا شروع کیا تھا۔ جب میر آہل سالوں بعد حویلی واپس آیا تھا۔

اس سے پہلے بھی اس نے بہت افسانے اور ناولز لکھے تھے پر کبھی بھی انہیں شائع کروانے کی جرأت نہیں کی تھی۔

اس کا قلم اس کی ڈھال تھا جس نے اب تک اُسے برقرار رکھا ہوا تھا۔ رات کے اندھیروں میں اپنے اندر اٹھتے طوفان کے شور کو وہ اپنے لفظوں کی شدت سے ٹھنڈا کیا کرتی تھی۔

ورنہ وہ تو کب کا اِس شور شرابے میں پاگل ہو جاتی۔

اچھا لکھنے والے لفظوں کا سہارا لے کر خود کو اپنی مضبوط تحریروں کے پیچھے چھپا لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا سہارا صرف اُن کے الفاظ ہی بن سکتے ہیں۔ یہ عام لوگوں کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔۔۔ لکھاریوں کی واحد امید ان کا قلم ہی ہوتا ہے اُن کا کُل اثاثہ۔

دل آویز کی سوچوں کا تسلسل الہان کی اچانک آمد سے ٹوٹا تھا۔ وہ ایک بار پھر کسی جِن کی طرح نمودار ہوا تھا۔ وہ واقعی کوئی جِن تھا بس فرق صرف اتنا تھا کہ وہ بوتل سے نہیں نکلتا تھا۔

"In the name of my beloved husband "

الہان پیچھے سے بینچ کے اوپر سے کُود کر دل آویز کے برابر میں آکر بیٹھ گیا۔ دل آویز نے فٹافٹ کتاب بند کر دی اور چونک کر الہان کو دیکھا۔

"اچھا لکھ لیتی ہو مگر پختگی کی کمی ہے۔۔۔ حقیقت بتاؤں تو قابل اشاعت نہیں ہے ابھی" وہ دائیں ہاتھ کے ناخنوں پر پھونک مارتے ہوئے بولا۔

"الہان میں تمہارا سر توڑ دوں گی تم بہت ہی بد تمیز اور بے کار انسان ہو" اُسے الہان کی اس حرکت پر بہت زیادہ غصہ آیا۔

"تم نے مجھ سے پوچھے بغیر میری کتاب کو ہاتھ کیوں لگایا" وہ برہمی سے کتاب واپس بیگ میں ڈالتے ہوئے بولی۔

"یار دیکھو میں ایسا کرنا تو نہیں چاہتا تھا۔۔ مگر میں ایسا نہیں کرتا تو میرے اندر کا شیطان مجھ سے خفا ہو جاتا" وہ مصنوعی معصومیت سے بولا تو دل آویز نے نوٹ بُک اس کی جانب پھینکی جسے اُسے نے بروقت پکڑ لیا۔

"میں تم سے زندگی میں کبھی بات نہیں کروں گی" وہ اپنا سامان سمیٹنے لگی۔

"قسم کھاؤ؟" الہان نے دانتوں کی نمائش کی تو اُس نے کندھے اُچکائے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر خاموشی سے سامنے پھولوں کی کیاری کو گھورنے لگی۔

الہان بھی خاموشی سے اُسے گھورنے لگا۔۔ چند لمحے یوں ہی گزر گئے تو دل آویز نے اُس کی نظروں سے تنگ آ کر کہا۔

"تم مجھے ان ججمینٹل نگاہوں سے گُھورنا بند کرو گے؟"

"نہیں" وہ کھل کر مسکرایا۔

دل آویز نے نڈھال انداز میں بینچ سے ٹیک لگایا۔ وہ اب بھی سامنے ہی دیکھ رہی تھی اور الہان اُسے۔

"پہلے کبھی ہمت نہیں ہوئی کسی کو یہ بات بتانے کی یا پھر یہ کہہ لو کہ کبھی کسی نے ضروری ہی نہیں سمجھا یہ جاننا کہ میں کیا چاہتی ہوں" اس کی آنکھ نم ہوئی۔

"تم کیا چاہتی ہو دل آویز" الہان یکدم سنجیدہ ہوا تو دل آویز نے فوراً گردن موڑ کر اُسے دیکھا۔

"میں بہت اچھی رائٹر بننا چاہتی ہوں" وہ سرعت سے بول گئی۔

"ہمم۔۔ مشکل ہے مگر چلو کوشش کی جا سکتی ہے" وہ اچانک ہی زور سے ہنسا تو دل آویز ہوش میں آئی۔

"تم کبھی نہیں سُدھر سکتے۔۔۔ میں جا رہی ہوں" وہ اٹھنے لگی۔

"ارے سوری سوری میں مزاق کر رہا ہوں یار۔۔۔ قسم سے میں نے چار چیپٹر پڑھے ہیں تمہاری کتاب کے اینڈ ٹرسٹ مِی مجھے پہلے تو یقین نہیں آیا کہ یہ تم نے لکھے ہیں دل آویز" دل آویز نے اس کے چہرے کے تاثرات ٹٹولے وہ واقعی سچ بول رہا تھا۔

"پرامس" وہ یقین دھیانی کرنے والے لہجے میں بولی۔

"پِنکی پرامس" الہان سیدھے ہاتھ کی چھوٹی انگلی لہراتے ہوئے بولا تو دل آویز ہنسنے لگی۔

"تو تم یہ کتاب اپنے شوہر صاحب کو ڈیڈیکیٹ کرنا چاہتی ہو" اس کے سوال پر اس نے نظریں جُھکا دیں۔

الہان کچھ دیر اُسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھتا رہا دل آویز جواباً خاموش رہی۔

"تم آہل سے محبت کرتی ہو دل آویز؟" اس کا سوال غیر متوقع تھا دل آویز جھینپ گئی۔

کچھ پل کی خاموشی۔

"بہت" وہ کچھ دیر اپنی کھلی ہتھیلیوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"اور آہل تم سے محبت کرتا ہے؟" اس سوال کا جواب دینا دل آویز کے لئے دنیا کا سب سے مشکل ترین کام تھا۔

"پتا نہیں" اس کی آواز بھر آئی۔

اُس روز الہان اس سے سوال پر سوال کرتا رہا اور دل آویز بنا کچھ سوچے سمجھے اُس کے ہر ایک سوال کا بنا کسی مزاحمت اور ایمانداری سے جواب دیتی رہی۔

زندگی میں کوئی ایک ایسا دوست تو ہونا ہی چاہئیے اپنے دل کے غموں کو ہلکا کرنے کے لئے۔۔۔ جو صرف آپ کی سُنے اور بنا آپ کو جَج کئے آپ کو سمجھے۔

انسان کے وہی غم اُسے اندر سے کھا جاتے ہیں جنہیں "وہ لوگ کیا کہیں گے" کہ ڈر سے اندر چُھپا کر رکھتا ہے، اِنہیں باہر آنے دو ورنہ زندگی جہنم بن جائے گی۔

دل آویز نے اپنے اندر پلتے غم کو الہان کے سامنے نکال پھینکا تھا۔۔۔ نا جانے وہ کتنی دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ وہ آج بہت ہلکا محسوس کر رہی تھی۔

☆...☆...☆☆...☆...☆

میر خلیل اس وقت ڈیرے پر موجود حساب کتاب کا جائزہ لے رہے تھے۔ ان کے ماتھے پر سلوٹوں کا جال تھا۔

وہ ایک بڑے سے مضبوط شاخ دار درخت کے نیچے بچھی چارپائی پر براجمان تھے۔

"جلالی کچھ خبر ملی کہ پچھلے مہینے کھیتوں میں آگ کیسے لگی تھی؟" وہ حساب کا کھاتہ بند کرتے ہوئے مستفسر ہوئے۔۔

"میر سردار وہ۔۔"

جلالی نے ایک گہری سانس کھینچ کر بات کا آغاز کیا۔

"پچھلے مہینے کریم بابا" وہ کہتے کہتے رُک گئے۔ میر خلیل کے تاثرات سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کتنے غصے میں تھے۔

"بولتے رہو جلالی" وہ ضبط سے لفظ چباتے وہوئے بولے

"وہ شراب کے نشے میں دھت تھے۔۔۔اور" میر خلیل نے ہاتھ جھلا کر انہیں خاموش کروادیا۔

اس سے زیادہ وہ اپنی سماعتوں پر بوجھ نہیں ڈال سکتے تھے۔انہوں نے غصے سے حساب کے کھاتے کو پرے پھینکا کریم کی اس حرکت کی وجہ انہیں بہت بڑا نقصان ہوا تھا۔کھیتوں میں آگ لگنے کی وجہ سے فصل جل کر راکھ ہو گئی تھی۔

جس کا خمیازہ انہیں کی بھگتنا تھا۔ان کے کھیتوں میں کام کرنے والے تمام کسان ایک ایک کر کے جارہے تھے کیونکہ کریم آئے دن نشے میں دُھت ان کی بہن بیٹیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور بدتمیزی کرتا تھا۔کبھی بازار، کبھی کھیت تو کبھی گاؤں کے نکڑ پر وہ لڑکیوں کو چھیڑتا اور لڑائی جھگڑوں میں مصروف رہتا۔

جس کی وجہ سے میر خاندان کا نام مٹی میں مل رہا تھا۔اور اب اس کی لاپرواہی کی وجہ سے انہیں کاروبار میں بھی اتنا بڑا نقصان ہوا تھا۔

انہیں سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کریں۔۔۔بی جان کے انتقال کے بعد سب کچھ بگڑتا چلا جارہا تھا۔

زلیخا بستر مرگ پر موجود تھی۔ریما دب بدن خاموش ہوتی جارہی تھی اور اوپر سے کریم تھا جو اپنی بے ہودہ حرکتوں سے باز نہیں آرہا تھا۔

جلالی کو اپنے مالک پر بے انتہا ترس آیا۔۔۔سو آج یہ بھی ثابت ہوا تھا کہ انسان کے لئے اولاد ایک بہت بڑی آزمائش ہے۔

وہ اس لمحے خود کو بہت تنہا محسوس کر رہے تھے۔اتنے سالوں سے وہ یہ زمہ داریاں تنہا نبھا رہے تھے۔کبھی کبھی انسان کو اپنے کندھے پر رکھنے کے لئے ایک ہاتھ چاہئے ہوتا ہے۔ایک ساتھ ایک سہارا درکار ہوتا ہے جو مشکل حالات سے لڑنے کا حوصلہ دے اور اس وقت میر خلیل کو ایسے ساتھ کی سخت ضرورت تھی۔

وہ حویلی کی چھت پر تنہا ٹہل رہے تھے۔دونوں ہاتھ پیچھے باندھے وہ زمین پر بنتے اپنے سائے کو گھور رہے تھے۔

("اگر تم چاہو تو یہ فاصلہ ہم مل کر طے کر لے گے آہل۔ کچھ قدم تم طے کر لینا اور کچھ قدم میں آگے بڑھا لوں گا")

یکدم وہاں ماضی کا ایک منظر چلنے لگا جہاں میر خلیل اور میر آہل آمنے سامنے کھڑے تھے۔

(بات ساری اس لفظ (اگر) پر اکر ٹھہر جاتی ہے چاچو اور میں (اگر مگر) کے چکر میں اپنا وقت پہلے سے ضائع ہو چکے وقت پر مزید ضائع نہیں کرتا")

کتنے بے رحم انداز میں آہل نے میر خلیل کے بڑھتے ہاتھ کو جھڑکا تھا۔ اُس روز انہیں احساس ہوا تھا کہ وہ ان کا بھتیجا نہیں رہا تھا وہ اب میر آہل تھا جو بچہ نہیں تھا۔

بچپن میں جب بھی میر خلیل اپنے بڑے بھائی میر رحمان کے ساتھ کھیتوں میں جانے کے لئے حویلی سے نکل رہے ہوتے تو آہل بھاگتا ہوا آکر میر خلیل کی ٹانگوں سے لٹک جاتا۔۔۔ آہل اپنے باپ کے بعد سب سے زیادہ کسی کے نزدیک تھا تو وہ میر خلیل تھے۔

وہ دن کا زیادہ تر وقت کھیتوں میں میر خلیل کی گود میں گزارا کرتا تھا۔

"چِی چُو میں بھی آپ کے ساتھ رہہ کر کام کروں گا" میر آہل۔۔۔ میر خلیل کو چاچو کے بجائے پیار سے چِی چُو بلایا کرتا تھا۔

"آہل ابھی تم بہت چھوٹے ہو پڑھائی پر دھیان دو فلحال کیونکہ حساب کتاب دیکھنے کے لئے پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے" وہ اپنی گود میں بیٹھے معصوم سے بچے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

"لیکن آپ تو ان پڑھ ہیں چِی چُو پھر بھی حساب کتاب دیکھتے ہیں" چھ سال کے معصوم سے میر آہل کو اندازہ ہی نہیں ہوا کہ اس نے میر خلیل کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"تمہیں کس نے کہاں کے چِی چُو ان پڑھ ہیں؟" وہ سنجیدہ ہوئے۔

"بابا نے کہا" میر خلیل کے دل پر زبردست گھونسا پڑا

وہ بلکل خاموش ہو گئے۔ اب وہ ایک معصوم چھوٹے بچے سے کیا کہتے۔ لیکن انہیں اپنے بڑے بھائی سے اس طرح کی کسی بھی بات کی توقع نہیں تھی۔)

میر خلیل نے گہری سانس پھیپھڑوں میں اتار کر آنکھیں کھولیں تو پھر سے خود کو تنہا کھڑے دیکھا وہاں اُن کے سوا کوئی نہیں تھا۔ بس ماضی کی کچھ یادیں تھیں اور یادیں بھی کیا۔۔۔ کچھ نہیں !!

انہیں شدت سے احساس ہوا کہ کاش ایسے حالات میں میر آہل ان کے ساتھ ہوتا جیسے وہ ہمیشہ بچپن میں ان کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔

کسی شہد کی مکھی کی طرح آس پاس گھومتا۔۔۔ زندگی کے بدمزاح اور پھیکے پلوں میں اپنی باتوں اور بچگانہ حرکتوں سے مٹھاس بھرتا۔

مگر افسوس اب نا وہ میر آہل تھا نا میر خلیل اور نا وہ ماضی تھا۔۔۔ اب کچھ تھا تو محض تنہائی، اذیت اور یادیں تھیں۔

☆...☆...☆

"چاچو"

میر آہل نے ہڑبڑا کر آنکھ کھولی تھی آفس میں کام کرتے کرتے نا جانے کیسے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ وہ کوئی پراجکٹ فائل چیک کر رہا تھا پھر مسلسل لیپ ٹاپ کے آگے جُھکے رہنے کی وجہ سے اس کی گردن دُکھنے لگی تھی اور وہ لندن سے برمنگھم آنے کے بعد گھر جانے کے بجائے سیدھا آفس آ گیا تھا۔

اس نے بس پانچ منٹ کے لئے پیچھے کرسی سے ٹیک لگایا تھا۔ اور نجانے کب سفر کی تھکان غالب آ گئی اور وہ خواب خرگوشی میں اتر گیا۔

اس نے خواب میں میر خلیل کو اُسے روتے ہوئے پکارتے دیکھا تھا۔ کہتے ہیں اگر خواب میں کوئی شخص آپ کو نظر آئے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ شخص آپ سے ملنا چاہتا ہے۔

اس نے فوراً سامنے ٹیبل پر رکھا اپنا فون اٹھایا اور میر خلیل کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ ابھی وہ ڈائل بٹن دبانے ہی والا تھا کہ یکدم اُس کے ماں باپ کی کیچڑ میں لت پت لاش اُس کی آنکھوں کے سامنے بجلی کی طرح چمکی۔۔۔ سیکنڈز میں دردناک ماضی کا ہر ایک پل کسی کلر فلم کی طرح اُس کے اردگرد گردش کرنے لگا۔

گھبراہٹ میں فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

اُسی وقت مائیکل بھی ڈرتے ڈرتے آفس روم میں داخل ہوا تھا کہ اپنی پھول والی حماقت پر میر آہل اس کی کیا درگت بنانے والا تھا پر وہ آہل کو ایسی حالت میں دیکھ کر بوکھلا گیا اور فوراً اس کی سمت دوڑتا ہوا آیا۔

میر آہل کے وجود پر کپکپی طاری تھی۔ مائیکل نے فوراً ٹیبل پر رکھا پانی کا گلاس اٹھا کر میر آہل کے لبوں سے لگایا۔ جسے اُس نے ایک سانس میں اپنے اندر انڈیل لیا۔ یہ پہلی بار نہیں تھا کہ میر آہل کو ایسا پینک اٹیک آیا تھا۔

شروع شروع میں اکثر اُس پر اس طرح کی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ وہ ماضی میں ڈپریشن اور انزائٹی اٹیکس سے بھی دوچار ہو چکا تھا۔

میر آہل جو آج اتنا مکمل اور مضبوط دکھائی دیتا تھا۔ اُس نے پتھریلی زمین پر ننگے پاؤں لمبے سفر تنہا طے کئے تھے تب جا کر وہ اس مقام اور بلندی پر پہنچا تھا جہاں سے لوگ اُسے دیکھ کر محض باتیں کر سکتے تھے مگر کوئی وہاں اس کے ساتھ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ مقام اُس کا تھا۔ وہ جگہ اُس کی تھی۔

مگر انسان اور درد کا آپس میں تعلق دل اور دھڑکن جیسا ہوتا ہے۔ دونوں ازل سے ابد تک ساتھ رہتے ہیں۔

درد کبھی بھی آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور آپ کبھی درد سے اپنا پیچھا نہیں چھڑا پاتے، ایک نئے پیکر میں، نئ وجوہات کے ساتھ آپ کی زندگی میں آپ کے ساتھ، آپ کے دل میں درد دھڑکن بن کر دھڑکتا رہتا ہے۔

"سر لمبی سانس لیں"

مائیکل نے اُس کی ٹائی ڈھیلی کی میر آہل کو سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔

آہل اپنی پاور سیٹ پر تقریباً لیٹا ہوا تھا اور مائیکل اس کی جانب جھک کر اس کا سینہ مسل رہا تھا۔

"میں ڈاکٹر کو کال کرتا ہوں آپ پریشان نا ہوئے پلیز"

مائیکل نے کوٹ کی ملحقہ جیب میں فون نکالنے کے لئے ہاتھ ڈالا۔

"مجھے گلے سے لگا لو مائیک ورنہ میں مر جاؤں گا" آہل نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔

مائیکل کا سانس ساکن ہوا بنا کچھ سوچے سمجھے اُس نے میر آہل کو کس کر اپنے مضبوط بازوؤں میں بھینچ لیا تھا۔ ایسے جیسے اگر اُس کی ذرا سی بھی گرفت آہل پر ہلکی ہوئی تو وہ اس سے دور چلا جائے گا اور وہ میر آہل کو کسی بھی حال میں کھونا نہیں چاہتا تھا۔ نا جانے کب مائیکل کے آنسو بہنے لگے۔

"You’re my ideal sir, you can’t give up"

وہ چھوٹے بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ میر آہل کی آنکھوں سے بھی زار و قطار آنسو نکلنے لگے تھے۔

ہر مرض کا علاج ڈاکٹر کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ مرض جو لاعِلاج ہوتے ہیں ان کا تریاق اُن ہی لوگوں کے پاس ہوتا ہے جن سے آپ محبت کرتے ہیں۔ اُن کے سینے سے لگتے ہی بیماری کا اثر زائل ہونے لگتا ہے۔

میر آہل کو لگا اس کی جان میں جان آگئی ہے۔ اب اُسے سانس لینے میں تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ اُس نے مائیکل کی پیٹ کو نرمی سے تھپکا جو اب ہچکیوں کے ساتھ رو رہا تھا۔

کچھ پل یوں ہی گزر گئے تو مائیکل نے خجالت سے میر آہل سے خود کو الگ کیا اور کوٹ کے آستین سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگا۔

میر آہل نے ٹشو باکس سے ایک لیف کھینچ کر مائیکل کی جانب بڑھایا جسے اُس نے خاموشی سے پکڑ لیا۔

"آپ ٹھیک ہیں نا سر؟"

"ہمم" اس نے اثبات میں سر ہلایا

یکدم ماحول میں ایک عجیب سی جھجک پھیل گئی تھی مائیکل مسلسل زمین یا پھر اپنے جوتوں کو دیکھ رہا تھا اور میر آہل مائیکل کو۔

رونے کی وجہ سے مائیکل کی ناک بہنے لگی تھی۔

میر آہل نے ٹشو باکس سے ایک اور ٹشو نکالا۔۔۔ مائیکل نے ٹشو لینے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا تھا مگر آہل نے ذرا سا آگے بڑھ کر خود ہی مائیکل کی ناک صاف کر دی۔ وہ مزید جھینپ گیا تو آہل نم آنکھوں سے مسکرایا۔

"ویسے مائیک دل آویز کو امپریس کرنے کا یہ ریڈ روز والا آئیڈیا تو فلاپ ہو گیا۔ کچھ اور ہے تمہارے ذہن میں اب؟"

مائیکل اس لمحے بہت آکورڈ محسوس کر رہا تھا اور وہ بہت دکھی بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اس لئے آہل نے مائیکل کا موڈ بحال کرنے کی کوشش کی۔

"سر میں سوچ رہا تھا کہ اس بار دل آویز میم کو امپریس کرنے کے لئے ہم گھر کے گارڈن میں چاکلیٹ فاؤنٹین لگائے گے۔ میں نے سُنا ہے کہ لڑکیوں کو چاکلیٹس بہت پسند ہوتی ہیں"

مائیکل نے ناک کھینچتے ہوئے کہا۔

"گڈ آئیڈیا۔۔۔ ہمم ویری گڈ آئیڈیا"

آہل نے ضبط سے ٹائی کستے ہوئے مائیکل کو دیکھا۔۔۔ مائیکل سمجھ گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین۔۔۔

"I will kill you Mich" آہل نے ہاتھ کا مُکا اس کی جانب بڑھاتے ہوئے زور سے کہا اور مائیکل دروازے کی طرف دُم دبا کر بھاگا تھا۔ آہل نے بہت مشکل سے اپنے قہقہہ پر بریک لگایا دروازے سے نکلتے ہوئے مائیکل نے پلٹ کر میر آہل کو دیکھا۔ وہ بھی مائیکل کو تشکر نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"تھینک یو"

دونوں نے بروقت کہا تھا اور پھر دونوں بروقت مسکرائے تھے۔

☆...☆...☆

جولیانہ اور دل آویز لبرٹی بُک شاپ میں موجود لمبی سی ایک ریک کے سامنے کھڑی کتابیں دیکھ رہی تھیں۔ دل آویز کو کچھ ضروری کتابیں چاہئے تھیں۔ اس لئے یونیورسٹی سے واپسی پر وہ دونوں مال آگئی تھیں۔

"دل آویز آپ سے ایک بات پوچھوں؟"

جولیانہ بے مقصد ہی کتابوں پر انگلی پھیرتے ہوئے بولی۔

"ہمم۔۔۔"

وہ کتابیں دیکھنے میں مشغول تھی۔

"کیا الہان واقعی مجھ سے۔۔۔" وہ بولتے بولتے رک گئی۔ دل آویز نے گہری سانس کھینچ کر کتاب بند کی اور ایڑیوں کے بل جولیانہ کی جانب مُڑی۔

"ہاں ناجولی۔۔۔ اب کیا لکھ کر دوں تمہیں تو یقین آئے گا" وہ کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی تو جولیانہ کے سفید گال گلابی ہو گئے۔

"اب دلہن کی طرح شرمانا بند کرو اور۔۔۔" یکدم دل آویز کے قدم منجمد ہوئے اور زبان فریز ہو گئی۔

"کیا ہوا دل آویز کہاں کھو گئیں آپ"

جولیانہ نے اس کے چہرے کے سامنے چٹکی بجائی پر وہ کچھ نا بولی تو جولیانہ نے اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا اور لمحوں میں سارا ماجرا سمجھ گئی۔

اینا اورنگزیب اپنی اونچی سیاہ رنگ کی ہیلز میں چلتی ہوئی دل آویز کے پاس آئی۔

وہ دونوں دو ریک کے درمیان آمنے سامنے کھڑی تھیں اور جولیانہ اینا سے ایک قدم پیچھے۔

"افسوس کی بات ہے کہ آہل نے جس لڑکی سے شادی کی ہے اُس کی تو ابھی تک اسکولنگ تک مکمل نہیں ہوئی ہے" اینا نے دل آویز کے ہاتھوں سے کتاب لیکر آہستگی سے صفحے پلٹنے لگی۔

"تمہیں نہیں لگتا دل آویز کہ آہل اپنے اسٹینڈرڈ کی کوئی لڑکی ڈیزرو کرتا ہے نا کہ تم جیسی تھرڈ کلاس لڑکی جسے نا پہننے اوڑھنے کا ڈھنگ ہے اور نا ہی جس میں کانفیڈنس ہے" اس نے غصے سے کتاب اس کے ہتھیلی پر دھر دی۔

دل آویز کی آنکھوں میں آنسوں تیرنے لگے وہ بنا کچھ کہے بس سر جھکائے اینا کی جلی کٹی سُنتی رہی۔

"پتا نہیں اُس کی کیا مجبوری تھی کہ اُس نے مجھے چھوڑ کر تم جیسی گوار سے شادی کر لی"

اینا کی نظروں میں دل آویز کے لئے زہر صاف دکھائی دے رہا تھا جو اس وقت اُس کی زبان اگل رہی تھی۔

"وہ اب بھی مجھ سے محبت کرتا ہے۔۔۔ تمہارے ساتھ یہ رشتہ محض سمجھوتہ ہے۔ جتنی جلدی یہ بات اپنے دماغ میں بٹھا لو گی اتنا اچھا ہو گا ورنہ "

اس نے سختی سے دل آویز کا چہرہ ٹھوڑی سے پکڑ کر اوپر کیا تو دونوں کی نظریں براہِ راست ہوئیں۔

"ورنہ میں تمہیں وہاں بھیجوں گی جہاں سے تم کبھی لوٹ کر نہیں آؤ گی"

ایک سخت نگاہ وہ دل آویز اور پھر جولیانہ پر ڈال کر پاؤں پٹختے ہوئے شاپ سے نکل گئی۔

آس پاس موجود لوگوں نے اُس کی ہیل سے پیدا ہوتی ٹھک ٹھک کی آواز پر مڑ کر بھی دیکھا تھا۔

"آپ نے اُسے کچھ کہا کیوں نہیں دل آویز" جولیانہ نے دل آویز کے چہرے پر آنسوں بہتے دیکھ کر اُس کو بازوں سے پکڑا۔

"وہ اپنی جگہ بلکل ٹھیک کہہ رہی تھی جُولی"

"مگر دل آویز"

وہ بنا کچھ سُنے کتابیں جولیانہ کو تھما کر آنسوں پونچھتے ہوئے شاپ سے باہر نکل گئی۔

☆...☆...☆

آج میر آہل کو زبردست قسم کی شرمندگی ہو رہی تھی گھر جانے میں۔۔۔ ناجانے وہ دل آویز کو آج کس طرح سے فیس کرنے والا تھا۔

مائیکل کی بے وقوفی کی وجہ سے میر آہل کا جورَف اینڈ ٹَف والا اوراتھا۔ اُس کا بلکل کچرہ ہو گیا تھا۔

اس نے گاڑی سے اترنے سے پہلے مصنوعی غصے سے مائیکل کو گھور کر دیکھا جو مکمل طور پر پیچھے بیٹھے میر آہل کو نظر انداز کر رہا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمت تک نہیں کی تھی۔

اُسے معلوم تھا میر آہل فٹنس فریک ہے اور اس کا ایک مُکا اس کے چہرے کے نقشے کو بگاڑنے کے لئے کافی تھا۔ اس لئے اس نے آہل کو انگلی نا کرنے میں ہی اپنی آفیت سمجھی۔

وہ کوٹ کے بٹن کھولتے ہوئے گھر میں داخل ہوا تو ایک غیر معمولی سا سناٹا تھا۔ اُس نے چونک کر اطراف میں نظر ڈالی اور سٹنگ ایریا کی جانب آ گیا۔ اُسی وقت اُسے ڈرائنگ روم سے دل آویز اور جولیانہ کے قہقہوں کی آواز آئی۔

وہ بنا قدموں کی چاپ پیدا کئے دبے پاؤں سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگا پر افسوس ڈرائنگ روم کا دروازہ بلکل کھلا ہوا تھا۔ جولیانہ نے میر آہل کو پہلی سیڑھی پر ہی دیکھ لیا تھا اور فوراً اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی تو مجبوراً آہل کو بھی رُکنا پڑا۔

"ہیلو سر" جولیانہ کی مسکراہٹ روکے نہیں رُک رہی تھی۔ دل آویز نے اپنا نچلا لب کاٹتے ہوئے کن اکھیوں سے میر آہل کو دیکھا وہ کافی شرمندہ سا دکھائی دے رہا تھا۔

"ہائے جولیانہ گھر میں سب کیسے ہیں" اس نے مروتاً پوچھ لیا۔

"بلکل ٹھیک ہیں" وہ ہونٹ آپس میں دباتے ہوئے مسکرائی اور نظر گھما کر دل آویز کو دیکھا۔

"آپ فریش ہو کر آجائے کھانا تیار ہے"

میر آہل نے سر اثبات میں ہلایا اور اوپر اپنے کمرے میں فریش ہونے چلا گیا۔

"اوکے دل آویز اب میں بھی چلتی ہوں اور پلیز اب رونا مت بھول جاؤں آج مال میں جو کچھ بھی ہوا" وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی

"مت جاوں نا جولی کم از کم کھانے تک رُک جاؤں مجھے بہت عجیب لگ رہا ہے"

اس نے صبح مائیکل کو میر آہل کے حوالے سے جو بات کہی تھی اُسے اُس بات پر اب بہت شرمندگی ہو رہی تھی۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ میر آہل فون پر ان کی تمام گفتگو سن رہا ہو گا اور پھر اپنا سے اچانک ملاقات آج کا دن اس کے لئے بلکل بھی اچھا ثابت نہیں ہوا تھا۔

"پلیز آپ کا معاملہ ہے آپس میں خود سلجھائے مجھے دیر ہو رہی ہے میں تو چلی" وہ پاس رکھے کنسول ٹیبل سے اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے اوپر لگے آئینے میں اپنے بالوں کو سیٹ کرتے ہوئے بولی۔

"بہت ہی بے وفا ہو تم جولی۔۔۔ اللہ کرے الہان نام کا عذاب زندگی بھر کے لئے تم پر نازل ہو جائے"

"آمین ثم آمین" جولیانہ دونوں ہاتھوں کا پیالہ چہرے پر پھیرتے ہوئے بولی تو دل آویز نے ناک پھلا کر اُسے دیکھا۔

جولیانہ کے جاتے ہی دل آویز نے کھانا گرم کر کے ٹیبل پر لگا دیا تھا۔ اُسے آج ویسے ہی بھوک نہیں تھی۔۔۔ اینا کی جلی کٹی باتوں سے ہی اس کا پیٹ آج بھر چکا تھا۔ وہ اوپر ٹیرس میں کھلے آسمان کے نیچے کچھ دیر بیٹھنا چاہتی تھی۔

جیسے ہی اس نے سیڑھیوں کا رُخ کیا تو دیکھا میر آہل فریش ہو کر گرے رنگ کی ٹراؤزر اور سیاہ رنگ کی ٹی شرٹ پہنے نیچے ہی آرہا تھا۔ وہ دل آویز کو نیچے کھڑا دیکھ کر آخری سیڑھی پر آکر رُک گیا۔

وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ میر آہل دائیں جانب کو مڑا تو دل آویز بھی اُسی جانب کو مُڑی۔

میر آہل کو دھند میں لپٹی ایک یاد نے ستایا۔۔۔ اُن کی دوسری ملاقات ایسے ہی ہوئی تھی۔ قسمت ہر بار انہیں ایک دوسرے کے سامنے لے آتی تھی۔

دل آویز سر جھٹک کر بائیں جانب کو بڑھی تو اتفاق سے میر آہل بھی اُسی طرف بڑھا تھا۔

"یہ کالی بلی کب میرا راستہ کاٹنا بند کرے گی" دل آویز نے من ہی من کہا تھا۔

"کچھ فرمایا آپ نے" وہ اُسے تند مزاجی سے گھورتا سیڑھی سے نیچے اُترا۔

"افففف" وہ کیسے اس کی دل میں کہی باتیں سُن لیتا تھا۔ دل آویز لب کاٹتی ایک قدم پیچھے ہوئی۔

"ہم ایک دوسرے کا راستہ کاٹے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ بھی تو چل سکتے ہیں نا دل آویز" وہ قدم بقدم اس کے نزدیک آتا اپنے گمبھیر لہجے میں بول رہا تھا۔

"بولو دل آویز؟" اس کی نرم اور پر کشش آواز نے اس کو سُن کر دیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے وہ سب کچھ بھول گئی۔

"کھانا۔۔۔" دل آویز نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے تھے مگر میر آہل نے اپنی اُنگلی اس کے ہونٹوں پر رکھ کر اُسے خاموش کروا دیا۔

دل آویز کا دل کیا کہ وہ دونوں کسی ٹائم پاکٹ میں پھنس جائے اور یہ لمحہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے۔

ناجانے کہاں سے اس کے اندر اتنی ہمت آگئی تھی کہ وہ مبہوت سے میر آہل کو دیکھتی چلی گئی۔ میر آہل کے ضبط کے تمام بندھن ٹوٹنے لگے۔

ناجانے میر آہل کے وجود سے اٹھتی مہک میں ایسا کیا تھا۔ جو اُس کے دل و دماغ کو مدہوش کر دیتی تھی۔ دل آویز خود بخود اس کی جانب کھچتی چلی جاتی تھی۔

(پتا نہیں اُس کی کیا مجبوری تھی کہ اُس نے مجھے چھوڑ کر تم جیسی گوار سے شادی کر لی۔۔۔)

کسی نے دل آویز کی سماعتوں میں زہر گھولا

(وہ اب بھی مجھ سے محبت کرتا ہے۔۔۔ تمہارے ساتھ یہ رشتہ محض سمجھوتہ ہے۔)

اس نے جھٹکے سے اپنی آنکھیں کھولیں۔۔۔ آہل کی خوشبو کا اثر زائل ہوا۔

(آپ کے کہنے پر میں دل آویز سے شادی کر رہا ہوں بی جان حالانکہ میں اُسے کبھی بھی اپنی زندگی میں شامل کرنے کے حق میں نہیں تھا)

ماضی کی ایک جھلک اور اُس لمحے کا فسوں دُھواں دُھواں ہو گیا۔

دل آویز نے یکدم ٹھٹک کر اُسے ہلکا سا پیچھے کو دھکا دیا۔ میر آہل نے چونک کر دل آویز کو دیکھا وہ اس لمحے کچھ بھی سمجھ نہیں پایا۔

"بی جان سے کیا گیا وعدہ پورا کرنے کے لئے آپ کو یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں ہے آہل" وہ اچانک ہی سخت ہوئی۔ آہل حیران نظروں سے اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

" آپ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے تھے مگر بی جان کے اسرار پر آپ نے کی"

"مجھے معلوم ہے آپ اینا کو اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتے تھے مجھے نہیں۔۔۔ پھر یہ سب کیوں" وہ یکدم ہی پھٹ پڑی۔

میر آہل نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں۔

"دل آویز"

میر آہل نے اسے بازوں سے بھینچ کر اپنے قریب کیا۔

" آپ مجھے اس طرح سے ڈومینیٹ نہیں کر سکتے، آپ میرے ساتھ زبردستی بلکل نہیں کر سکتے"

دل آویز نے دونوں ہتھیلیوں سے اُسے پیچھے کی جانب دھکیلا۔ میر آہل کی آنکھیں سُرخ ہوئیں۔

"Be gentle Ahil" وہ اس کی خون رنگ ہوتی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اس کے قریب آئی تو میر آہل نے سختی سے بھینچی مٹھیاں کھول دیں۔

"دل آویز"

اب کی بار اس کا لہجہ پہلے جیسا سخت نہیں تھا۔

"آپ نے میرے لئے بہت کچھ کیا ہے آہل پلیز میرے لئے ایک اور چیز کریں گے ؟"

وہ تکان زدہ لہجے میں بولی۔ میر آہل اُسے مستفسرانہ نظروں سے دیکھتا رہا۔۔

"پلیز مجھے میری نظروں میں مت گرنے دیں" منت تھی، حکم تھا یہ التجا، میر آہل سمجھ نہیں پایا۔

جو بھی تھا میر آہل کے چہرے پر کسی تھپڑ کی طرح لگا تھا۔

"میری وجہ سے آپ کو اپنا دل مارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ اور اینا۔۔۔"

"میر آہل اپنے فیصلوں میں ہمیشہ سے آزاد رہا ہے اور اپنے دل سے یہ خوش فہمی نکال دو کہ میں نے اینا کو تمہاری وجہ سے نہیں اپنایا"

برسوں بعد میر آہل کا نرم پڑتا دل ایک بار پھر سے سخت ہو گیا تھا۔ ایک بار پھر میر آہل نے اپنے دل پر نفرت اور سختی کا خول چڑھا لیا تھا۔

"چلی جاؤں میری نظروں کے سامنے سے دل آویز ورنہ میں۔۔۔" اس نے زور سے پیچھے دیوار پر لگے فریم پر مُکا مارتے ہوئے کہا تھا۔ فریم کا کانچ میر آہل کے بھرم کی طرح چکنا چور ہو کر فرش پر بکھر گیا تھا۔

دل آویز بنا کچھ کہے برابر سے نکل کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور میر آہل نے غصے سے کنسول ٹیبل پر رکھے ڈیکوریشن پیس ہاتھ مار کر زمین پر گرا دیئے۔ توڑ پھوڑ کی آوازیں دل آویز نے اپنے کمرے تک سُنی تھی وہ وہی دروازے سے ٹیک لگائے نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ آنسوں تھے جو تھم نہیں رہے تھے۔

دونوں کے درمیان فاصلوں نے ایک بار پھر جگہ لے لی تھی۔ جذباتی توڑ پھوڑ نے دل آویز اور میر آہل دونوں کو ہی بکھیر کر رکھ دیا تھا۔

☆...☆...☆☆...☆...☆

(الہان ڈِی سُوزا)

الارم کے شور نے اُس کی نیند میں زبردست خلل ڈالا تھا۔ اس نے بمشکل نیند سے بھری آنکھوں کو وا کیا۔

(انگلینڈ کے ایک نامور سرجن کا بیٹا)

اُس نے جھنجھلا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھے الارم کو ہاتھ بڑھا کر نیچے پٹخ دیا اور چادر پھینک کر انگڑائی لیتے ہوئے بستر پر بیٹھ گیا۔

(بی ایس سی فرسٹ ایئر کا اسٹوڈنٹ)

صبح کے نو بج رہے تھے اور وہ پہلے ہی آدھا گھنٹہ لیٹ تھا۔ اس نے ہاتھ سے جمائی کو روکتے ہوئے۔ پاؤں سلیپر میں ڈالا۔

(اُسے بی ایس سی کی ڈگری میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہ ڈگری اس کے باپ کی خواہش تھی)

وہ نیند میں بھیگی آنکھوں کو مسلتے ہوئے باتھ روم میں گھس گیا۔

(وہ تو میوزیشن بننا چاہتا تھا۔۔ اُسے سنگیت سے بہت لگاؤ تھا)

وہ ٹھنڈے پانی سے شاور لیتے ہوئے سیٹی پر اپنی کوئی پسندیدہ دُھن بجا رہا تھا۔

(کہنے کو وہ بی ایس سی فرسٹ ایئر کا اسٹوڈنٹ تھا مگر وہ پچھلے دو سالوں سے پہلے ہی سیمسٹر کو کریک کرنے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا۔)

ٹاول سے گیلے چہرے کو خشک کرتے کرتے وہ اپنی وارڈروب سے گرے کلر کی ٹی شرٹ، نیلے رنگ کی ڈیمج جینز اور ایک سیاہ رنگ کا ہُڈی نکال لایا۔

(الہان اپنے والدین کا ایک لوتا بیٹا تھا۔ اس لئے بچپن سے ہی اُس کی ہر خواہش کا بڑا احترام کیا گیا تھا۔)

اگلے دس منٹ میں وہ اپنے نئے لباس میں ملبوس آئینے کے سامنے کھڑا اپنے بالوں پر برش پھیر رہا تھا۔

(لڑکیوں میں اُس کے گھنے بکھرے آدھے سیدھے آدھے گھنگرالے بال بڑے مشہور تھے)

اب وہ گلے میں اپنی مخصوص چین اور انگلیوں میں انگوٹھیاں پہن رہا تھا۔

اُسے فرفیومز بلکل بھی پسند نہیں تھے پر وہ عطر بہت شوق سے استعمال کرتا تھا۔

(دل آویز کو پہلی نظر میں الہان کا حلیہ بے حد بُرا لگا تھا)

ڈائننگ ٹیبل پر رکھی اپنی بائیک اور اپارٹمنٹ کی چابیاں اٹھا کر وہ بیرونی دروازے کی جانب جا رہا تھا۔

یہ تو وہ تعارف تھا جو الہان ڈی سُوزا نے دنیا کو دیا تھا پر در حقیقت الہان ڈی سُوزا کون تھا؟

سننے میں اس کا انٹروڈکشن کتنا پرفیکٹ لگتا تھا پر کیا بس یہی تھا۔۔۔ الہان ڈی سُوزا کے بارے میں جو آپ سب جانتے تھے؟ ایک کیوٹ شرارتی سالڑ کا جو اپنے باپ کے کہنے پر ایسٹن پچھلے دو سالوں سے ڈگری مکمل کر رہا تھا۔ جس کا باپ شہر کا ایک مشہور سرجن تھا۔ اُسے اس یونیورسٹی میں سب جانتے تھے۔۔۔ بقول الہان ڈی سُوزا کے اُسے بائیکس بہت پسند تھیں اور اُسے میوزک میں خاصا انٹرسٹ بھی تھا۔

How filmy۔

It was all made up

Yes, it was made to trap.

A sweet lil girl

Dilawaiz Meer

اس نے دروازہ کھولا اور وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ وہ اُس کے سامنے سینے پر ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ الہان نے باری باری دونوں آئی بروز آچکا کر گردن ایک جانب گراتے ہوئے مستفسرانہ نظروں سے سر سے پاؤں تک اُسے دیکھا۔ اس کی آمد غیر متوقع تھی اور وہ یونیورسٹی کے لئے لیٹ بھی ہو رہا تھا۔

☆...☆...☆☆...☆...☆

میر آہل ایک انا پرست انسان تھا اس نے آج تک کسی کو اپنے دل میں جگہ نہیں دی تھی کیونکہ اُسے جھکنا پسند نہیں تھا۔

محبت کے الگ الگ روپ ہوتے ہیں الگ الگ سانچے، کبھی دھوپ کبھی چھاؤں، کبھی ریت کبھی پانی، کسی کے لئے مکمل کسی کے لئے ادھوری کہانی۔

محبت کبھی پھول برساتی ہے تو کبھی چپل کو مخمل کے کپڑے میں لپیٹ کر انسان کے دل پر مارتی ہے۔ محبت کی مار ایسی مار ہے جسے کھا کر انسان کے آنسوں تو نکلتے ہیں پر مسکراتے رہنا واجب ہو جاتا ہے۔

کیونکہ محبت کا فریب سب سے خوبصورت، محبت کا زہر سب سے میٹھا۔

آج میر آہل کو بھی لگا تھا کہ کسی نے کھینچ کر جوتا اس کے دل پر مارا ہے۔

میر آہل سیاہ چشمہ آنکھوں پر ٹکائے موبائل کی اسکرین کو گھور رہا تھا۔ گاڑی آفس کی طرف گامزن تھی

"مائیکل میرے لئے ایک کافی لے آو" گاڑی سگنل پر رکی تھی۔

مائیکل نے سیکنڈز میں گردن گھوما کر پچھلی سیٹ پر بیٹھے میر آہل کو دیکھا تھا۔ وہ نہایت ہی پرسکون اور بلکل ٹھیک نظر آرہا تھا۔ مطلب کہ کچھ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ وہ کیوں تھا ایسا بنا کچھ سُنے ہی سب سمجھ لیا کرتا تھا۔ مائیکل کچھ دیر آہل کو ٹٹولتی نگاہوں سے گھورتا رہا۔

"میرا ایکس رے نکال لیا ہے تو برائے مہربانی میری کافی لے آو" وہ موبائل سے نظر ہٹاتے ہوئے بولا تو مائیکل کو ہوش آیا۔

ڈرائیور نے گاڑی سائیڈ میں لگائی اور مائیکل اسٹاربکس کی فرنچائز میں داخل ہو گیا۔

کچھ دیر بعد وہ کافی کا ایک کپ لئے گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ میر آہل نے کافی کا پہلا سپ لیتے ہی عجیب سامنہ بنایا شاید کافی کا ذائقہ اُسے اچھا نہیں لگا تھا۔

"ان کی کافی اب پہلے جیسی نہیں رہی مائیک" اس نے زبان ہونٹوں پر پھیری۔

"کافی تو پہلے جیسی ہی ہے سر بس آپ بدل گئے ہیں۔ کچھ وقت تو لگے گا ٹیسٹ بڈس کو ایڈجسٹ ہونے میں"

آہل نے کافی کپ ہولڈر میں رکھ دی۔

"وہ آپ کا کمفرٹ زون ہے سر۔۔۔۔ یہ نہیں اگر یہ آپ کا کمفرٹ زون ہوتا تو آپ کبھی اُس رنگ میں نہیں رنگتے" وہ مختصر سی بات کر کے خاموش ہو گیا تھا۔

"اللہ نے انسان کو مٹی سے تشکیل دیا ہے۔ انسان میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وقت اور حالات کے ساتھ خود بخود ایڈجسٹ ہو جاتا ہے۔ میں بھی ہو جاؤں گا مائیک تم فکر مت کرو"

وہ کھڑکی سے باہر خلا میں کسی نادیدہ نقطے کو تلاش کرتے ہوئے بولا۔

دل بہت سے ٹکڑوں میں ٹوٹ کر بکھرا تھا اور سامنے والے کی ضد تھی کہ جیتنا ہے، تو آہل نے بھی صلح کا پرچم جلا دیا۔

☆...☆...☆

دل آویز کچن میں سنک کے ساتھ لگ کر نلقے سے ٹپکتے پانی کی بوند کو کھوئے ہوئے انداز میں دیکھ رہی تھی۔ میر آہل نے ہر بار خود سے اس کی جانب قدم بڑھایا تھا مگر یہ دل آویز ہی تھی جو ہر دفع فاصلوں کی زنجیر میں خود کو جکڑ لیتی تھی کل بھی اس نے یہی کیا تھا۔

عزت نفس کی حفاظت کے اس کھیل میں وہ کھالی ہاتھ رہ گئی تھی۔ میر آہل کے جانے کے بعد جب وہ ڈائننگ روم میں داخل ہوئی تو ناشتہ جُوں کا تُوں پڑا تھا۔ دل آویز کو سینے میں چبھن کا احساس ہوا۔

شدید چبھن۔۔۔۔ اتنا درد تو اپنا کی اُن جلی کٹی باتوں کو سُن کر نہیں ہوا تھا جتنا اب ہو رہا تھا۔

"دل آویز آپ اب تک تیار نہیں ہوئی یونیورسٹی کے لئے لیٹ ہو رہے ہیں ہم" جولیانہ ڈائننگ روم کے دروازے پر کھڑی تھی۔

"جُولی میرا دل نہیں ہے آج یونیورسٹی جانے کا" وہ ایک کرسی کھینچ کر وہی بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔

"خیریت ہے دل آویز آپ نے اپنا اور نگزیب کی باتوں کو بہت زیادہ سنجیدگی سے لے لیا ہے شاید" وہ نزدیک آتے ہوئے بولی پھر اچانک ہی اس کے چہرے کو چھوا۔ "دل آویز آپ کو تو بہت تیز بخار ہے" دل آویز کا جسم بھٹی ہو رہا تھا۔

"یہ آپ نے کیا حالت بنالی ہے اپنی دل آویز جس عورت کو میر سر نے کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا اُسے آپ کیوں اتنا سیریسلی لے رہی ہیں" وہ جگ سے پانی گلاس میں انڈیلتے ہوئے بولی

"کیا مطلب؟" دل آویز سٹپٹا گئی۔

"اینا اورنگزیب ابھی سے نہیں کئیں سالوں سے میر سر پر ڈورے ڈال رہی ہیں مگر سر نے اُسے کبھی بھی گھاس نہیں ڈالی"

"پر اینا تو کہہ رہی تھی کہ"

"اینا کیا بولتی ہے وہ معنی نہیں رکھتا میر سر کیا سوچتے ہیں وہ معنی رکھتا ہے دل آویز" وہ پانی کا گلاس دل آویز کے لبوں سے لگاتے ہوئے بولی مگر پانی اس کی حلق میں ہی اٹک گیا۔

"مگر جولی آہل نے مجھ سے بی جان کے دباؤ میں آ کر شادی کی تھی وہ مجھ سے محبت نہیں کرتے" وہ گھوم پھر کر اسکوائر ون پر آ گئی تھی۔

"چھوٹی بچی ہو کیا" جولیانہ سر پیٹتے ہوئے بولی۔

"چلیں مان لیا اس وقت انہوں نے آپ کی بی جان کے دباؤ میں آ کر آپ سے شادی کی تھی۔ مگر دل آویز تب میں اور اب میں آپ کو کوئی فرق نظر نہیں آتا؟"

وہ سراپا سوال بن گئی۔

وقت بدلتا ہے تو انسان بھی بدل جاتے ہیں یہ فطرت ہے یہی حقیقت ہے۔

اور اگر غور کیا جائے تو یہی وہ لمحہ تھا جس نے دل آویز کے دل پر پڑی تمام گرہیں کھول دی تھیں۔

"کیا ہوا بُت بنی کیوں بیٹھی ہیں آپ" وہ اس کے سامنے چٹکی بجاتے ہوئے بولی۔

"جُولی مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے" دل آویز گلاس پر انگوٹھا پھیرتے ہوئے بولی

"پلیز اب یہ مت کہیں گا کہ اینا کی باتیں سن کر آپ نے۔۔۔" اور وہ دل آویز کا اثبات میں ہلتا ہوا سر دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

دل آویز نے ساری باتیں جولیانہ کے گوش گزار کی تو جولیانہ نے اپنا سر پکڑ لیا۔

"اب میں کیا کروں جُولی وہ مجھ سے اتنا ناراض ہیں کہ ناشتہ بھی کر کے نہیں گئے" وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی اسے اپنی حماقت پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ آہل کا دل دکھا کر تو سکون میں وہ بھی نہیں تھی۔

"آئیڈیا" وہ یکدم کرسی سے کھڑی ہوتے ہوئے بولی

"مرد کہیں پگھلے نا پگھلے مگر بیوی کو تکلیف میں دیکھ کر ضرور پگھلتا ہے میں ابھی میر سر کو کال کر کے کہتی ہوں کہ آپ کو بہت تیز بخار ہے جو کہ واقعی میں ہے۔۔۔ پھر دیکھئے گا کیسے دوڑ کر آتے ہیں آپ کی تیمارداری کرنے" وہ کنسول پر رکھے موبائل کی جانب بڑھتے ہوئے بولی۔

"مگر جُولی کیا یہ آئیڈیا کام کرے گا؟" وہ اب بھی پریشان دکھائی دے رہی تھی۔

"ارے ایسا ویسا بعد میں دعائیں دینگی آپ مجھے دیکھ لیجئے گا" اس نے موبائل کان اور کندھوں کے درمیان ٹکا رکھا تھا۔

"وہ تو بعد میں ہی پتا چلے گا جُولی" وہ پریشانی سے ٹہلنے لگی۔ دوسری جانب تیسری بیل پر ہی کال ریسیو کرلی گئی تھی۔

"ہیلو سر" اس نے سامنے لگے آئینے میں دل آویز کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی کہیئے میر سر ابھی میٹنگ میں بزی ہیں" آواز سنتے ہی جولیانہ کی آنکھوں کی چمک بجھ گئی۔

اُسے دیکھ کر دل آویز بھی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ "وہ دراصل ایمرجنسی ہے دل آویز میم کی طبیعت بہت خراب ہے بہت تیز بخار ہو رہا ہے اُنہیں" اس نے بناوٹی لہجے میں کہا۔

"اوکے سر جیسے ہی میٹنگ سے فارغ ہوتے ہیں میں انہیں آپ کا میسج دے دیتا ہوں" آگے سے بلکل ٹھنڈا ردعمل ملا جس کی جولیانہ کو توقع نہیں تھی۔

"میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ انہیں بہت تیز بخار ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ میٹنگ ختم ہونے کا انتظار کرے گے آپ" اُسے مائیکل پر سخت غصہ آیا۔

"سوری بٹ سر کا آرڈر ہے چاہے دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے اُنہیں کوئی پریشان نہ کرے"

اس سے پہلے کہ جولیانہ کچھ بھی کہتی مائیکل نے فٹ سے کال منقطع کر دی۔

جولیانہ نے کھلے منہ کے ساتھ ایک نظر ہاتھ میں پکڑے موبائل پر اور پھر دوسری نظر دل آویز پر ڈالی جس کے چہرے پر سیدھا تیرہ بج چکے تھے۔

مائیکل نے کال منقطع کر کے موبائل دوبارہ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

"سر اب آپ ضرورت سے زیادہ ہی سختی دکھا رہے ہیں" وہ میر آہل کو سکون سے بیٹھا دیکھ کر حیران ہوا تھا۔

"ہمم۔۔۔ میں اس کام میں ماہر ہوں مائیک"
آہل نے سینڈوچ کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا

"بٹ سر شاید دل آویز میم کو آپ کی ضرورت ہے"

"اُسے میری نہیں دوائیوں کی ضرورت ہے۔۔۔ فون کر کے ایک ڈاکٹر گھر بھجوا دو مائیک"
وہ اب اورنج جوس کا گلاس لبوں سے لگا رہا تھا۔
"سر لیکن"
"اور جاتے ہوئے دروازہ ٹھیک سے بند کر کے جانا" وہ ٹشو سے ہونٹ کے کنارے صاف کرتے ہوئے بولا۔

مائیکل نے افسوس سے سر دائیں بائیں ہلایا اور ٹیبل پر رکھی فائل اٹھا کر چلتا بنا کیونکہ یہ وہ بھینس تھی جس کے آگے بین بجانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔
مائیکل جیسے ہی کمرے سے باہر گیا میر آہل کے تاثرات یکسر بدل گئے۔ لاپرواہی کی جگہ بے چینی نے لے لی تھی۔ اس نے پریشانی سے پیشانی مسلی تھی۔
"افففف دل آویز کیوں کر رہی ہو میرے ساتھ ایسا"
اس نے آنکھ موند کر معنی خیز انداز میں سرگوشی کی، گھٹن سے میر آہل کی سانس بند ہو رہی تھی۔ وہ تکلیف میں تھی اور وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

زندگی کو جینے کے لئے ہمیں چیزوں کو اپنے حال پر چھوڑ دینے کا عمل سیکھ لینا چاہئے کیونکہ آپ ہر شہہ کو مٹھی میں دبا کر نہیں رکھ سکتے۔

چیزوں کو جانے دینا، تھام کر رکھنے سے زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اس میں تکلیف کم ہوتی ہے۔

☆...☆...☆

"تم یہاں؟" الہان اُسے دیکھ کر اچنبھے میں آ گیا۔

"کیوں میں نہیں آسکتی یہاں" وہ آئی بروز اُچکاتے ہوئے بولی۔

"نہیں میں یونیورسٹی کے لئے ہی نکل رہا تھا آج ایک ضروری اسائمنٹ جمع کروانا ہے دل آویز نے بتایا ہی ہو گا" وہ دروازے کے سامنے سے ہٹتے ہوئے بولا تو جولیانہ دروازہ مقفل کر کے اندر آ گئی۔

"ارے اسائمنٹ کو گولی مارو" وہ الہان کے پیچھے پیچھے ہال میں آ گئی جو سٹنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

"کیوں تمہاری لاٹری نکل آئی ہے" وہ اوپن کچن کے کاؤنٹر سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا

"نہیں دل آویز کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے" وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا اُسے" وہ یکدم پریشان ہوا

"وہ دراصل" جولیانہ نے تمام باتیں اول تا آخر الہان کو بتا دیں۔

"یار یہ چوہیا ایک نمبر کی فلم ہے"

الہان نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا.

"حد ہوتی ہے الہان ایک تو وہ بیچاری پریشان ہے اور تم اُنہیں چوہیا کہہ رہے ہو"

جولیانہ نے اُسے گھورا

"ظاہر ہے چوہیا ہی کہوں گا چوہا تو کہنے سے رہا اور آپ اُس بیمار عورت کی زیادہ طرف داری مت کیجئے" وہ ڈائننگ ٹیبل کی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"اونہوں۔۔۔ آپ یونیورسٹی کے لئے لیٹ نہیں ہو رہے تھے جناب"

وہ پاؤں پر پاؤں چڑھاتے ہوئے بولی۔

"ہاں ہو تو رہا تھا مگر اب جا کر کیا کروں گا میں"

وہ چابیوں کا گچھا واپس ٹیبل پر رکھتے ہوئے مایوسی سے بولا

"کیوں اسائمنٹ جمع نہیں کروانا"

وہ مستفسر ہوئی۔

"گولی مارو اسائمنٹ کو دل آویز نہیں ہو گی تو میں کیا چنے بیچوں گا یونیورسٹی میں اور ویسے بھی میرا اسائمنٹ بھی دل آویز کے پاس ہی ہے سو جانے کا فائدہ نہیں"

وہ مرے مرے انداز میں بولتا ہوا کچن میں گھس گیا اور کافی بنانے لگا۔

جولیانہ صوفے سے اٹھ کر کچن کاؤنٹر کے پاس آکر رک گئی۔ کاؤنٹر پر کہنی کے بل دائیں ہاتھ کے مکے پر ٹھوڑی ٹکائے وہ خالی نگاہوں سے الہان کو کافی پھینٹتے ہوئے دیکھنے لگی۔

الہان کے آدھے سیدھے اور گھنرالے بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ پورے انہماک سے کافی بنا رہا تھا اور ساتھ ساتھ کوئی گیت بھی گنگنا رہا تھا۔

"بس کرو جولی مجھے نظر جلدی لگ جاتی ہے"

وہ کافی پھینٹتے پھینٹتے بنا جولیانہ کی جانب دیکھے بولا تو جولیانہ فوراً سنبھلی۔

"کمال کا وہم ہے"

وہ ناک چڑھاتے ہوئے بولی۔ الہان نے کیبنٹ سے دو مگ نکالے۔

"نہ وہم ہے نا گمان۔۔۔ یہ حقیقت ہے اور سب جانتے ہیں کہ جولیانہ اصغر مجھے کتنی گندی نظروں سے دیکھتی ہے"

اس نے کافی کا مگ جولیانہ کی جانب کھسکایا۔

"یہ کافی کا کپ کافی ہو گا ڈوب کر مرنے کے لئے" جولیانہ نے غصے سے ناک پھلاتے ہوئے کہا۔

"کوئی احمق ہی ہو گا جو تمہاری آنکھوں کو چھوڑ کر اس کافی کے کپ میں ڈوبنا چاہے گا"

الہان نے کاؤنٹر پر دونوں ہتھیلیاں جماتے ہوئے جولیانہ کی آنکھوں میں مسکرا کر جھانکا تو جولیانہ کے دونوں ہاتھ ٹھنڈے ہو گئے۔

"دل آویز ہوتی تو اس وقت اتنی خراب پک اپ لائن مارنے پر آپ کی اچھی خاصی بے عزتی کر چکی ہوتیں"

وہ کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولی۔

جولیانہ اور الہان ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے بس درمیان میں کچن کاؤنٹر تھا۔

"یار میں قسم سے آج بور ہونے والا ہوں بہت"

"اچھا پلیز اب مرنے مت لگ جانا ایک کام کرتے ہیں ہم دل آویز کے گھر چلتے ہیں۔اُن کا دل بھی بہل جائے گا" اس نے فوراً حل پیش کیا۔

"یہ اچھا آئیڈیا ہے اِسی بہانے اُس کے شوہر میر جاہل اوہ سوری میر آہل سے بھی ملاقات ہو جائے گی، میں بھی تو دیکھوں کون ہے یہ شخص جس نے الہان ڈی سوزا کو ٹکر دینے کی سوچی"

اس نے اپنی امڈتی ہوئی ہنسی کو قابو کیا۔

"دل آویز نے سُن لیا نہ کے تم میر سر کو اس نام سے بلایا ہے تو تمہیں چھوڑیں گی نہیں وہ"

جولیانہ کو میر آہل کے نئے نام پر ہنسی آئی۔

"اور اگر آپ نے اس چوہیا کو بتایا تو میں آپ کو نہیں چھوڑوں گا"

اس نے کافی کا گھونٹ لیا

"پرامس"

جولیانہ نے ایک آنکھ دباتے ہوئے یکدم کہا تو الہان کے منہ سے کافی کا فوارہ چھوٹا۔

"طوبہ طوبہ حسین لڑکا دیکھا نہیں کہ فلرٹ کرنا شروع"

الہان بمشکل بولا

"ہاں تو کیا سارا فلرٹ تم ہی کرو گے"

جولیانہ نے بلند بانگ قہقہہ لگایا۔

☆...☆...☆

"کتے کی دُم ہیں سر یہاں بیٹھ کر تڑپتے رہے گے مگر گھر جا کر دل آویز میڈم کی طبیعت نہیں پوچھے گے" پچھلے ایک گھنٹے میں یہ پانچویں کال تھی جو انہوں نے ڈاکٹر کو کی تھی جسے میر آہل نے دل آویز کا چیک اپ کرنے کے لئے گھر بھیجا تھا۔

میر آہل کو لگا تھا کہ مائیکل کو اس بات کی بھنک تک نہیں پہنچے گی مگر وہ یہ بھول گئے تھے کہ مائیکل کے پاس بھی ایک عدد موبائل تھا اور ڈاکٹر کا نمبر بھی۔

"سر آپ کہیں تو باقی کی دو میٹنگز کینسل کر دوں؟" مائیکل نے آہل سے کانفرنس روم سے نکلتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں مائیکل کسی کا ولیما ہے آج"

وہ چلتے چلتے یکدم رُک کر مُڑا تو مائیکل گومگو اس کی شکل دیکھنے لگا۔

"میرے پاس بہت کام ہیں آج کی تاریخ میں کرنے کے لئے مائیکل اس لئے بہتر ہے کہ تم بھی اپنا دھیان کام پر دو"

اپنی بات مکمل کر کے آہل آگے بڑھ گیا جبکہ مائیکل افسوس سے سر جھٹکتا ہوا وہی کھڑا رہ گیا۔

"بیچاری میم کیسے گزارا کرتیں ہو گی اِن کے ساتھ" اس نے سر کو دائیں بائیں گھوماتے ہوئے دل ہی دل میں کہا تھا۔

☆...☆...☆

"سرپرائز"

الہان اور جولیانہ بروقت چلائے تھے اور دل آویز ڈرائنگ روم کے دروازے پر چیخ مارتے ہوئے اُچھل پڑی تھی۔

"یہ اللہ ابھی میں فوت ہو جاتی قسم سے"

وہ دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"پچاس روپے کاٹو اس کے اوور ایکٹنگ کے"

الہان واپس صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا

"تم کس خوشی میں آئے ہو یہاں"

دل آویز سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی

"شرم آتی ہے تمہیں چوہیا؟"

الہان نے منہ سُجایا

"ہیں۔۔؟ شرم؟ تمہاری ڈکشنری میں اس لفظ کا اضافہ کب ہوا"

دل آویز شرارت سے مسکرائی

"آپ دونوں پھر سے لگ گئے بھولے مت یہاں میں بھی ہوں"

اس سے پہلے کہ الہان لب کشائی کرتا جولیانہ نے مداخلت کی۔

"بائے داوے یہ پھول تمہارے لئے"

الہان نے سفید اور پیلے رنگ کے پھولوں کا گلدستہ اُس کی جانب بڑھایا۔

دل آویز نے حیرانگی سے ایک نظر الہان اور پھر پھولوں کی جانب دیکھا۔

"تمہیں کیسے پتا کہ مجھے ڈیزی پسند ہیں"

اس نے گلدستہ تھامتے ہوئے استفسار کیا۔

"مجھے تو ان ڈیزیز کے پیچھے کی پوری کہانی بھی پتا ہے"

الہان نے جولیانہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تو دل آویز نے غصے سے جولیانہ کو گھورا جو اس وقت خود کو اس گفتگو سے ایسے لاتعلق ظاہر کر رہی تھی کہ جیسے وہ یہاں موجود ہی نا ہو۔

"جُولی"

دل آویز نے آئی بروز اُچکاتے ہوئے اُسے گھورا تو جولیانہ نے ملامتی نظروں سے الہان کو دیکھا۔

"دل آویز کو بتادوں تم میر سر کو کس نام سے پکار رہے تھے"

اب طوپوں کا رُخ الہان کی جانب موڑ دیا گیا۔

"تم بہت بولنے لگی ہو لڑکی تمہیں ٹھکانے لگانا پڑے گا" الھان نے جولیانہ کی جانب کُشن پھینکا جِسے اس نے فوراً کیچ کر لیا۔

"آخر کوئی مجھے بتائے گا کہ تم دونوں کے درمیان کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ تم بتاؤ جولی یہ آہل کو کس نام سے پکار رہا تھا"

جولیانہ کی ہنسی چھوٹی

الھان نے اُسے گھور کر خاموش رہنے کی تنبی کی اور دل آویز نے جولیانہ کے کندھے پر چپٹ لگائی۔

الھان اور جولیانہ کے ساتھ وقت کب گزرا دل آویز کو پتا ہی نہیں چلا۔

☆...☆...☆

"مائیکل ایک کام کرو اس کے بعد والی میٹنگ کینسل کر دو میری طبیعت کچھ ناساز لگ رہی ہے"

وہ میٹنگ روم میں سربراہی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے دائیں جانب مائیکل براجمان تھا۔

"آپ ٹھیک ہیں سر؟" وہ فکرمند ہوا

"ہاں بس بخار سا محسوس ہو رہا ہے" میر آہل نے گردن مسلی۔۔

"اوہ اوکے سر"

"دیر آئے، دُرست آئے"

مائیکل نے اپنی اُمڈتی ہوئی مسکراہٹ دباتے ہوئے اندر ہی اندر سوچا تھا۔

"ویسے سر اب آپ میں کام کو لیکر پہلے والا جذبہ اور پیشن نہیں رہا"

وہ سامنے لگے پروجیکٹر کو گھورتے ہوئے بولا

"کیا مطلب؟"

آہل نے فوراً گردن ترچھی کر کے مائیک کو دیکھا۔

"نہیں پہلے آپ چاہے جتنی بھی طبیعت ناساز ہو آپ دوائی لیکر کام کیا کرتے تھے پر گھر نہیں جاتے تھے"

انداز گول تھا پر بات سیدھی تھی۔

"ہمم۔۔۔ آہل آہستگی سے کھانسا"

اُسے کوئی مناسب جواب نہیں سُوجا

"اٹس اوکے سر آپ کی طبیعت خراب ہے آپ کو وٹامن ڈِی کی ضرورت ہے"

اس نے منہ ہی منہ میں کہا۔ ڈِی سے مراد دل آویز تھا۔

"اور تمہیں وٹامن ایل، جِی اور سی کی"

"ہیں۔۔ میں سمجھا نہیں سر"

"لات، گھونسا اور چپل"

میر آہل سامنے دیکھتے ہوئے بولا تو مائیک نے بمشکل اپنی ہنسی روکی۔

☆...☆...☆

میر آہل ناچاہتے ہوئے بھی گھر جلدی آگیا تھا اور آتے ہی اس نے دل پر دو سو کلو کا پتھر رکھ کر رُخ دل آویز کے کمرے کی جانب موڑا ہی تھا کہ ڈرائنگ روم سے کسی مرد کے ہنسنے کی آواز آئی۔

میر آہل کا وجود سر سے پاؤں تک جم گیا وہ لمبے ڈگ بھرتا ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گیا۔

صوفے پر الہان ڈی سوزا کو دیکھ کر میر آہل کے اعصاب تن گئے وہ سیکنڈز کے ہزارویں حصّے میں صوفے پر بیٹھے اُس شخص کو پہچان گیا تھا۔

ساتھ والے سنگل صوفے پر جولیانہ بیٹھی تھی۔ میر آہل کو وہاں دیکھ کر سب یکدم صوفے سے کھڑے ہو گئے۔

"ہیلو سر کیسے ہیں آپ" جولیانہ تذبذب سے بولی

"وہ آج میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو"

"تو ہم دل آویز کی خیریت پوچھنے گھر آ گئے"

الہان نے دل آویز کا جملہ مکمل کیا۔

"ہیلو میں الہان" اس نے فوراً مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔

جولیانہ اور دل آویز نے کُن اکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر الہان اور میر آہل کو۔

"ہیلو"

اس نے الہان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کھنچے کھنچے انداز میں اُسے سر سے لیکر پاؤں تک گھورتے ہوئے جواب دیا تو دل آویز نے تھوک نگلا۔

"آپ لوگ میرے آتے ہی کھڑے کیوں ہو گئے تشریف رکھیے" وہ اطمینان سے آکر دل آویز کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ دل آویز نے حیرانگی سے میر آہل کو دیکھا۔

"آپ کھڑی کیوں ہیں بیٹھ جائے"

آہل نے نرمی سے دل آویز کا ہاتھ تھامتے ہوئے اُسے اپنے پہلو میں بٹھالیا تو باقی سب بھی بیٹھ گئے۔ کمرے میں ایک عجیب ساتناؤ تھا۔

اس پورے وقت میں آہل کی نظر پہلی بار سینٹر ٹیبل پر رکھے ڈیزی کے پھولوں کے گلدستے پر پڑی اُس نے ضبط سے سانس اندر کھینچی۔

"یہ پھول الہان لیکر آیا ہے دل آویز میم کے لئے اُنہیں پسند ہے نا ڈیزی"

بڑے ہی غلط موقعہ پر جولیانہ نے غلط بات کی تھی۔

دل آویز نے اتنی لمبی سانس کھینچی کہ سانس چھوڑنا ہی بھول گئی۔ میر آہل نے غیر آرام دہ ہو کر پہلو بدلا۔

"ہمم ویری نائس"

آہل نے تھوک نگلتے ہوئے کہا اور اپنا بازو پیچھے صوفے پر پھیلا دیا۔ جولیانہ نے فوراً میر آہل کی یہ حرکت نوٹ کی۔

"جی الہان اور دل آویز بیسٹ فرینڈز ہیں۔ آج میم یونیورسٹی نہیں گئیں تو الہان بھی آج یونیورسٹی نہیں گیا بلکہ ہم اِدھر آگئے انہیں کمپنی دینے تاکہ میم بیٹر فیل کریں"

ایک اور بم بڑے اطمینان سے پھوڑا گیا۔

میر آہل کا صوفے پر پھیلا بازوں سرک کر اب دل آویز کے گرد آ چکا تھا۔ دل آویز نے ہلکی سی گردن موڑ کر میر آہل کو دیکھا وہ اس کے بہت نزدیک تھا۔

اُس کے پہلو میں بیٹھے۔۔۔ اپنے بازوں کو دل آویز کے گرد حمائل کئے وہ کافی سنجیدگی سے جولیانہ کی باتیں سُن رہا تھا۔

"نائس ٹو میٹ یو مسٹر میر اب ہم چلتے ہیں"

الہان موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

"مگر دل آویز میم نے تمہارے لئے چکن سینڈوچز بنائے ہیں الہان تم کھائے بغیر ہی چلے جاوں گے"

اتنے بم تو ہیروشیما اور ناگاساکی پر نہیں گرے تھے جتنے جولیانہ نے پچھلے دس منٹ میں میر آہل پر گرادیئے تھے۔

"حالانکہ کے اتنا بخار تھا اُنہیں پھر بھی تمہاری فرمائش پر سینڈوچ بنائے ہیں اُنہوں نے "اس نے مسکراتے ہوئے کن اکھیوں سے میر آہل کی شکل دیکھی۔

"پھر کبھی کھالونگا میں جُولی ابھی چلو"

الہان نے جولیانہ کا ہاتھ پکڑا اور فوراً وہاں سے نکل گیا۔ کمرے کا درجہ حرارت گرم ہو چکا تھا۔ اگر الہان وہاں سے نہیں نکلتا تو یقیناً نکال دیا جاتا۔

☆...☆...☆

"تمہارا دماغ جگہ پر ہے جُولی اندر کیا بکواس کر رہی تھی تم" الہان نے اُس کا ہاتھ کو زور سے جھٹکتے ہوئے کہا

"تم نے اس میر آہل کی شکل دیکھی تھی غصے سے لال ہو گیا تھا تمہاری باتیں سُن کر"

وہ دونوں دل آویز کے گھر کے باہر سڑک کے وسط میں آمنے سامنے کھڑے تھے۔

"بُدھو۔۔۔ غصے سے نہیں جلن سے لال ہو رہے تھے"

اس نے الہان کے سر پر چپٹ لگائی۔

"کیا مطلب" الہان نے ناسمجھی سے اُسے دیکھا

"بے وقوف یہی وقت ہے دل آویز کی ہیلپ کرنے کا"

"اچھااور وہ کیسے "وہ مستفسر ہوا

"وہ ایسے کہ جب میں سر میر کے سامنے تمہاری اور دل آویز کی باتیں کر رہی تھی تو وہ جیلس ہو رہے تھے اور اب تم دیکھنامیر سرپاگل ہو جائے گے دل آویز کے پیچھے"

جولیانہ کو بڑامزا آرہاتھا۔

"سیریسلی جُولی میر آہل چھوٹابچہ نہیں ہے"

وہ جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے مصنوعی غصے سے بولا

"جسٹ ویٹ اینڈ واچ اب ان کے اندر کامشرقی شوہر جاگے گا اور"

"اور پھر کیاہو گا"

الہان اس کی باتوں سے زچ ہو گیا تھا۔

"اور ان دونوں کے بیچ جو دوریاں اُس چڑیل اینانے پیدا کی ہیں وہ خود بخود ختم ہو جائے گی"

وہ چہکتے ہوئے بولی اور الہان خالی الذہنی کی حالت میں اس کے ساتھ چلتے چلتے ساری باتیں بنا کچھ کہے سنتا رہا۔ برمنگھم کی ہوا میں ہلکی ہلکی نمی گھلنے لگی تھی۔ دور اُفق پر کالے بادلوں میں ہچکولے لیتا چاند خاموشی سے اُن دونوں کو دور جاتا دیکھتا رہا۔

رات جواں تھی

رات لمبی تھی

ابھی بہت کچھ ہونا تھا

ابھی بہت کچھ باقی تھا۔۔۔۔۔

☆...☆...☆

"آپ فریش ہو جائے میں کھانا لگوادیتی ہوں" دل آویز ڈرائنگ روم سے باہر جانے لگی

"نہیں میرا پیٹ پہلے ہی کافی بھر چکا ہے۔۔۔ تم زحمت مت کرو" اس کا انداز ایسا تھا کہ دل آویز نے ٹھٹک کر میر آہل کو دیکھا۔

"اب کیا کر دیا میں نے آپ غصہ کیوں ہو رہے ہیں"

وہ جانتی تھی اس کا یہ رد عمل کس بات پر تھا پر وہ اس ٹاپک پر بحث نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"رئیلی! دل آویز تم نے کچھ نہیں کیا"

وہ کوٹ صوفے پر پھینکتے ہوئے اس کے قریب آیا

"آپ اوورری ایکٹ کر رہے ہیں" وہ اپنے کمرے میں جانے لگی۔

"تم۔۔۔ پتا نہیں کونسا گناہ سرزد ہوا تھا مجھ سے جو میری تم سے شادی ہوئی" وہ اس کے پیچھے اس کے کمرے میں آیا۔

"میں بھی آج کل یہی سوچتی ہوں"

دل آویز ٹس سے مس نہیں ہوئی ایسا لگ رہا تھا کہ بخار نے سیدھا اُس کے دماغ پر اثر کیا ہے۔

"کیا۔۔۔ کیا کہا تم نے؟" میر آہل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ دل آویز کا سر پھوڑ دے۔

"جاتے ہوئے دروازہ بند کر دیجیئے گا"

دل آویز نے میر آہل کو اُسی کے انداز میں جھاڑ پلائی تو وہ حیرانگی سے دل آویز کی شکل دیکھتا رہ گیا۔

"واٹ۔۔۔"

آہل آگے بڑھا پر دل آویز بنا کچھ سُنے واش روم میں گھس گئی اور دروازہ میر آہل کے منہ پر دے مارا۔۔۔

کسی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ بیوی بیوی ہی ہوتی ہے چاہے پھر اُس کا شوہر شیر ہی کیوں نہ ہو پر بیوی کے سامنے بھیگی بلی ہی رہتا ہے۔

میر آہل کا چہرہ اُتر گیا تھا اور وہ اس لمحے بھیگی بلی سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ وہ چھوٹے بچوں کی طرح منہ بنائے کمرے سے باہر آگیا اور ہال میں دونوں ہاتھ کمر پر ٹکائے کچھ دیر خالی دیواریں گھورتا رہا۔

اُسی وقت باہر کا دروازہ کھول کر مائیکل اندر داخل ہوا اور ہال میں میر آہل کو اس طرح کھڑا دیکھ کر وہی رُک گیا۔

"اُدھر کیوں رُک گئے اندر آجاوں" وہ ناخن سے پیشانی خرچتے ہوئے بولا

"یہ آپ کو کیا ہوا ہے سر" وہ میر آہل کی اُتری ہوئی شکل کو دیکھتے ہوئے بولا

"مجھے۔۔۔کچھ بھی تو نہیں۔۔۔مجھے کیا ہونا ہے" وہ خود کو کمپوز کرتے ہوئے بولا

"خیر تم اچانک اس وقت" وہ ایک نظر دیوار پر ٹنگی گھڑی پر ڈالتے ہوئے بولا

"وہ سر آپ یہ لال والی فائل بھول گئے تھے تو وہی دینے واپس آیا ہوں" وہ اب بھی میر آہل کے چہرے پر بکھرے تاثرات کو ٹٹولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اب کھڑے میری شکل کیا دیکھ رہے ہو جاؤ"

آہل نے فائل اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے مصنوعی غصے میں کہا۔

"اوکے سر گُڈ نائٹ"

وہ کہہ دروازے کی سمت چل پڑا اس امید پر کے ابھی میر آہل اُسے پیچھے سے روک لیگا اور وہی ہوا

"مائیک"

میر آہل نے اُسے پکارا اور پھر رات لمبی تھی اور مائیک ٹھہر اسد اکا فارغ

"آپ کو یاد ہے سر کچھ مہینے پہلے یہی کھڑے ہو کر میں نے آپ کو بیسٹ آف لک کہا تھا"

مائیکل اور میر آہل گھر کے باہر۔۔۔دروازے کے سامنے بنی سیڑھیوں کے پاس آمنے سامنے کھڑے تھے۔

"ہمم تب میں سمجھا نہیں تھا پر اب مجھے میرا جواب مل گیا ہے۔ تم صحیح تھے ازدواجی زندگی میں سروایو کرنا قلع فتح کرنے سے کئی زیادہ مشکل ہے" وہ مسکرایا

"But sir don't you think it's show time" مائیکل نے مسکرا کر آہل کو دیکھا

"?Show time"

اس نے استفسار کرتی نظروں سے مائیکل کو دیکھا اور اُس کی معنی خیز مسکراہٹ کچھ اور ہی پیغام دے رہی تھی۔

"Ohh Micheal, it's show time" میر آہل نے اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے زیر لب اس کی بات دہرائی۔

☆...☆...☆

"ویسے بڑے ہیرو بنتے ہیں اور ایک معمولی سی شکل صورت والے شخص سے جل گئے بڑے آئے میر آہل اونہوں"

دل آویز نے بستر پر پاؤں پھیلائے ہوئے تھے اور ران پر کتاب کھلی پڑی تھی۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہی تھی۔ پھر ایک دم ہی اس کے گلابی متورم ہونٹوں پر نرم سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ ایک عجیب سے احساس نے اُس کے دل پر دستک دی تھی۔

"وہ الہان سے جیلس کیوں ہو رہے تھے؟"

اس کے دل نے استفسار کیا تھا۔

"اونہوں۔۔۔ اچھا ہے سڑتے رہیں"

اگلے ہی پل اُس نے ذہن میں آئے سارے خیالات کو جھٹکا تھا۔

یکدم طوفان کی طرح کمرے کا دروازہ کُھلا دل آویز تو اِس اچانک حملے پر بستر سے تقریباً اُچھل ہی پڑی تھی۔

اس نے دیکھا میر آہل دروازے پر ڈھیلی ٹائی اور شرٹ کے آستین کہنیوں تک موڑے کھڑا ہے۔

"آپ۔۔۔؟"

اس نے ابھی منہ کھولا ہی تھا کہ میر آہل آندھی کی طرح دل آویز کے سر پر پہنچ گیا تھا۔

"کیا کہا تھا تم نے جاتے ہوئے دروازہ بند کر دیجئے گا۔۔۔ ابھی اتنے بُرے دن نہیں آئے کہ میری بلی مجھے ہی میاؤں کرے"

اس نے اپنی سحر زدہ آواز میں جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا اور اسے کلائی سے کھینچتا ہوا اوپر اپنے کمرے میں لے گیا۔

دل آویز اپنے نازک سراپے کو سنبھالتی میر آہل کی مضبوط گرفت سے اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر دل آویز کی ساری مزاحمتیں بیکار جا رہی تھیں۔

"کیا کر رہے ہیں آپ"

میر آہل نے اُسے جھٹکے سے کمرے میں لا کر چھوڑا اور کمرے کا دروازہ لاک کیا۔

"اپنا حق جتا رہا ہوں مسز میر آہل"

وہ سیکنڈز میں اس کے قریب آیا تو وہ گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹی۔

"تم چاہے جتنے فاصلے کھینچ لو ہمارے درمیان مگر میں ہر فاصلے کو عبور کر کے تمہارے قریب آتا جاؤں گا" وہ گھمبیر لہجے میں بولا۔

"آپ شوہر ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ میری اجازت کے بغیر"

میر آہل نے انگلی اس کے سفید پڑتے ہونٹوں پر رکھ کر اُسے خاموش کروا دیا۔

"میں اُن ذہنی بیماروں میں سے نہیں ہوں جو میریٹل ریپ کو رومانٹیسائیز کرے۔۔۔ نیور۔۔۔ میرے لئے تم سے جڑا یہ رشتہ بے حد معتبر ہے اور اُس سے بھی زیادہ معتبر ہو تم" وہ دل آویز کے لبوں پر اُنگلی رکھے، اُس کی آنکھوں کی گہرائی میں جھانکتے ہوئے نہایت ہی گھمبیر لہجے میں بولا۔ صدق اس کی آنکھوں میں جھلک رہا تھا۔

"شادی صرف زبانی یا تحریری اقرار نہیں ہے یہ زندگی بھر کی کمٹمنٹ ہے جِسے باتوں سے پورا نہیں کیا جا سکتا "

اور دل آویز تو بس اُس کی جادُوئی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ اُس کے چاشنی جیسے لبوں لہجے میں موم کی طرح پگھل رہی تھی۔

"سو مسز میر آہل آج سے میں تم سے اپنے سارے حق ادا کرواؤں گا"

وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے ذرا پیچھے ہوا اور دل آویز نے چونک کر آہل کی شکل دیکھی۔

"اور آپ کے حقوق بھی پورے کروں گا"

وہ زیر لب مسکرایا تو دل آویز نے جھینپ کر نظر نیچے کرلی۔

"اس لئے اپنی قمر کس لیں آپ۔۔۔ کیوں کہ میر آہل بہت سی من مانیاں کرنے والا ہے" وہ خوشمگین انداز میں بولا۔

☆...☆...☆

الہان کافی تھکا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

اس نے کی ہول میں اپارٹمنٹ کی چابی ڈال کر گھومائی اور ہلکی سی چر چراہٹ کے ساتھ دروازہ کُھلتا چلا گیا۔

پورے اپارٹمنٹ میں اندھیرے کا راج تھا۔ اس نے دروازہ مقفل کر کے لائٹس آن کی اور ایک زور دار چیخ مار کر دروازے سے چپک گیا۔

"یہ اللہ بھوتنی"

وہ سامنے صوفے پر۔۔۔ پاؤں پر پاؤں چڑھائے بیٹھی اینا اور نگزیب کو دیکھ کر بولا تھا۔

الہان اُسے اچانک اپنے اپارٹمنٹ میں دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا تھا۔

"زیادہ ڈرامہ مت کرو ورنہ اِنہی ہیلز سے مار مار کر تمہارا سر لہولہان کر دوں گی"

اینا نے آنکھ سے اپنی جِمی چُو کے ہلکے عنابی رنگ کی چمکدار گلیٹر ہیلز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"میری طبیعت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا مگر ہاں تمہارے چار لاکھ کے جوتے شہید ہو جائے گے"

الہان اس کی بالمقابل صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے بولا تو اینا بُھن گئی۔

اینا نے سفید رنگ کی جینز اور ٹی شرٹ پر عنابی رنگ کا لونگ کوٹ پہنا ہوا تھا اور وہ بہت تپی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

"بکواس بند کرو اپنی الہان" وہ فوراً سیدھی ہوئی۔

"یہ بتاؤں تم میرے اپارٹمنٹ میں کیسے گھسی" وہ بھی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"یہ اپارٹمنٹ میرے باپ نے میرے نام پر خرید اتھا مت بھولو" اینا نے اُسے گھورا

"اور اُس باپ کا ڈی-این-اے میرے ڈی-این-اے سے میچ کرتا ہے یہ بات تم مت بھولو"

الہان تیوری چڑھا کر بولا تو اینا کے سر میں آگ لگی تلووں میں بُجھی۔

"تم کسی کام کے نہیں ہو مجھے معلوم تھا"

"ہاں تبھی تم نے اپنے اُس پرانے عاشق پیٹر کو بھیجا دل آویز کو ٹریپ کرنے کے لئے مگر اینا اورنگزیب تم نے اچھا نہیں کیا مجھے انڈر ایسٹیمیٹ کر کے" وہ صوفے سے کھڑا ہو گیا۔

"ہاں تو اتنے مہینوں میں تم نے کونسا تیر مار لیا ایک لڑکی تو تم سے پھنسی نہیں اوپر سے اُس تھرڈ کلاس سرونٹ جولیانہ سے عشق لڑا رہے ہو۔۔۔بڑے آئے کیسانووا" اینا نے چوٹ کی۔

"کم از کم میں تمہاری طرح خود کو اپنی نظروں میں گِرا تو نہیں رہا اینا" الہان نے سنجیدگی سے کہا تو اینا جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

"انسان جب محبت کی دہلیز پار کرتا ہے تو اپنی عزتِ نفس دہلیز کے باہر چھوڑ کر اندر داخل ہوتا ہے۔۔۔پر یہ بات تم نہیں سمجھو گے کیونکہ تم نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی ہے نا الہان اورنگزیب" اینا نڈھال سی صوفے سے اُٹھی سینٹر ٹیبل سے اپنا سیل فون اٹھایا اور دروازے کی جانب جانے لگی۔

"اینا وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں تم چاہے کچھ بھی کر لو اِنہیں جُدا نہیں کر سکتی اتنے عرصے میں مجھے یہ بات معلوم ہو گئی ہے۔۔۔بہتر ہے تم بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لو" وہ دونوں کی ایک دوسرے کی جانب پیٹھ تھی۔

اینا کی آنکھوں کا رنگ یکدم بدلا اس نے الہان کو کندھے سے پکڑ کر اپنی جانب موڑا۔

"آہل دل آویز سے محبت نہیں ہمدردی کرتا ہے سمجھے" وہ غرائی

"اور اکثر محبت کی شروعات ہمدردی سے ہوتی ہے" وہ یاسیت بھرے لہجے میں بولا

اینا ایک قدم آگے آئی اور ٹھوڑی سے الہان کے چہرے کو ذرا اوپر کیا اور اُسے جانچتی نظروں سے گھورتی رہی اس کے چہرے پر اس وقت چٹان سے بھی زیادہ سخت تاثرات اُبھرے تھے۔

"تمہارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا الہان"

"دوستی سے بڑھ کر مجھے کچھ چاہئے بھی نہیں اینا" جواب دوٹوک تھا۔ الہان اورنگزیب نے اپنا راستہ چُن لیا تھا۔

"اگر اینا اورنگزیب کے ارادوں کے بیچ کسی نے بھی آنے کی کوشش کی تو میں یہ دنیا اس کے لئے جہنم بنادوں گی چاہے پھر وہ میرا اپنا بھائی ہی کیوں نا ہو الہان اورنگزیب" اُس کی آنکھوں میں الہان نے جلتے انگارے دیکھے تھے۔

"اور تم اینا۔۔۔ تم اپنے ارادوں میں کبھی کامیاب نہیں ہو گی یہ الہان اورنگزیب کا تم سے وعدہ ہے"

اُس نے اینا کو دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھ لیں گے" وہ چیلنج کرنے والے انداز میں بولی تھی۔

اینا کے وہاں سے جاتے ہی الہان کے تاثرات مزید سخت ہو گئے تھے وہ نڈھال سا سنگل صوفے پر گِرا تھا۔

الہان اورنگزیب مشہور بزنس مین کا بیٹا اور اینا اورنگزیب کا بھائی تھا۔

اینا اورنگزیب۔۔۔۔ اورنگزیب عالمگیر کی ایک لوتی بیٹی تھی جی ہاں ایک لوتی بیٹی۔۔۔ ایک لوتی اولاد نہیں۔ اورنگزیب عالمگیر کے دو بچے تھے ایک الہان اور دوسری اینا اورنگزیب۔

دونوں ایک دوسرے سے یکسر مختلف تھے مگر اُن کی مختلف شخصیت کبھی بھی ان کے درمیان کسی بھی قسم کے فساد کی وجہ نہیں بنی تھی۔

الہان نے لندن اکیڈمی آف میوزک اینڈ ڈرامیٹک آرٹ سے میوزک پروڈکشن میں بی-اے آنرس کیا تھا اور ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی برمنگھم واپس لوٹا تھا۔ الہان نے اپنی اسکولنگ کے کچھ سال اور پھر باقی کی تمام پڑھائی بھی لندن میں ہی مکمل کی جس کی وجہ اس کا برمنگھم آنا جانا بہت کم ہوا کرتا تھا پر اینا ہر مہینے میں دو سے تین بار الہان سے ملنے اور اپنے دل کے بوجھ کو کم کرنے الہان کے پاس لندن ضرور جایا کرتی تھی۔

میر آہل کو اب تک الہان نے اینا کی باتوں سے ہی جانا تھا یہ پہلی بار تھا جب وہ میر آہل سے آمنے سامنے ملا تھا اور جتنا سُنا تھا اس سے بڑھ کر ہی پایا تھا۔

دل آویز کی یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا، اس سے دوستی کرنا سب ایک پلین کے تحت تھا۔

اینااورنگزیب کا دل آویز کو اپنے بھائی کے ذریعے میر آہل سے الگ کرنے کا پلین مگر وہ بھول گئی تھی کہ الہان اور نگزیب کا صرف ڈی-این-اے اینا اور نگزیب سے میچ کرتا تھا۔۔۔ پرسنیلٹی نہیں۔۔۔اور یہی تھا اُن دونوں کے درمیان آنے والا پہلا کلیش۔

☆...☆...☆

سفید ستونوں والی یہ حویلی باہر سے دکھنے میں جتنی شاندار اور فصیح دکھائی دیتی تھی اندر سے اُتنی ہی پراسرار اور مخفی بھی تھی۔

یہاں ہر دیوار کے کان تھے، ہر کمرے کی آنکھیں تھیں، ایک ایک اینٹ کے نیچے سو سو راز دفن تھے۔خوبصورتی خراج مانگتی ہے۔۔۔

آج خاموشی سے کھڑی اِس اداس حویلی کے آنگن میں کبھی تتلیاں اُڑا کرتی تھیں، پھول کھلا کرتے تھے۔ یہاں کے لوگ بھی تہوار منایا کرتے تھے۔ہنستے تھے، گاتے تھے خوشیاں مناتے تھے۔ مگر آج اس حویلی پر خاموشی کا پہرا تھا۔

اداسی اس حویلی کا طواف کرتی تھی۔ غم یہاں کے مکینوں کی زندگی کا محور بن گیا تھا۔اب یہ حویلی اینٹ اور پتھر کی چار دیواری بن کہ رہ گئی تھی جہاں چلتی پھرتی سانس لیتی زندہ لاشیں رہا کرتی تھیں۔انسان تو کب کا یہاں سے کُوچ کر گئے تھے۔

زندگی کا ہر گزرتا دن میر خلیل کو مایوسی اور اُداسیوں کے اندھیرے میں دھکیل رہا تھا۔زلیخا کی بیماری کو اب ڈیڑھ مہینہ ہونے کو آیا تھا مگر ان کی حالت میں رتی بھر سُدھار نہیں آیا تھا۔

ریما اپنا سارا وقت کمرے میں گزارا کرتی تھی ایک عرصے سے اس نے سورج نہیں دیکھا تھا۔رات کے اندھیرے میں کھڑکی سے لگ کر وہ محض تارے دیکھا کرتی تھی اور اس لمحے کو فراموش کرنے کی جدوجہد میں رہتی تھی۔

جب اُس نے اپنی ماں کو بی جان کے منہ پر تکیہ رکھ کر ان کو قتل کرتے ہوئے دیکھا۔اس ایک لمحے نے ریما سے اس کی مسکراہٹ اس کے دل کا سکون اور اس کی معصومیت چھین لی تھی۔

لاعلمی بھی ایک نعمت ہوتی ہے مگر اللہ ہر کسی کو ایسی نعمتوں سے نہیں نوازتا۔۔۔۔یہ ریمانے اُس دن جان لیا تھا۔

کبھی کبھی حقیقت انسان پر بڑی بے رحم ثابت ہوتی ہے اور وقت سے پہلے سمجھداری معصومیت چھین لیتی ہے۔

کریم اب گھر میں کم اور اپنے لفنگے دوستوں کے ساتھ گاؤں کی سڑکوں پر زیادہ پایا جاتا تھا۔ آئے دن کریم کے کارناموں کی ایک لمبی فہرست لئے جلالی حاضر ہوتا تھا۔ انگنت نقصانوں کا ڈھیر تھا جس کی بھرپائی کا بھار میر خلیل اُٹھا رہے تھے۔ جس کی وجہ سے کاروبار میں نفع کم نقصان زیادہ ہو رہا تھا۔

ایسا لگ رہا تھا کالے بادلوں نے اس حویلی کو اپنی زد میں لے لیا ہے۔ آہستہ آہستہ سب ختم ہو رہا تھا اور میر خلیل کچھ نہیں کر پا رہے تھے۔

جیسی کرنی ویسی بھرنی نہ مانے تو کر کے دیکھ جنت بھی ہے دوزخ بھی ہے نہ مانے تو مر کے دیکھ

میر خلیل اس وقت صحن میں موجود صوفے پر سر پیچھے گرائے آنکھیں موند کر بیٹھے ہوئے تھے۔ سینٹر ٹیبل پر زمینوں کے حساب کتاب کا کھاتہ رکھا ہوا تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے جلالی لیکر حاضر ہوا تھا۔

انہوں نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے لینڈ لائن کی جانب ہاتھ بڑھایا اور میر آہل کا نمبر ڈائل کرنے لگے۔

پھر کسی احساس کے تحت اُنہوں نے ریسیور دوبارہ رکھ دیا۔ بن موسم بادل برسنے لگے تھے۔ آسمان پر بجلی اتنے زور سے کڑکی کے سفید ستونوں والی حویلی رات کے کالے سائے میں چمکنے لگی۔

☆...☆...☆

دل آویز چُپ چاپ بستر پر آلتی پالتی مارے سرہانے سے ٹیک لگائے ہاتھ سینے پر باندھے بیٹھی ہوئی تھی اور میر آہل کی کارستانیاں دیکھ رہی تھی۔

"مجھے اپنے بستر کے سوا کہیں اور نیند نہیں آتی" دل آویز نے اپنے ناخن کو گھورتے ہوئے کہا تو میر آہل جو جھک کر اپنا تکیہ ٹھیک کر رہا تھا رک کر دل آویز کو دیکھا۔ وہ سیاہ رنگ کے نائٹ سوٹ میں ملبوس تھا۔ بال بکھرے ہوئے سے تھے۔

"یہ تمہارا ہی بستر ہے مسز میر آہل" وہ رسان سے اپنی سائیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔

"نہیں یہ آپ کا کمرہ ہے اور یہ آپ کا بستر ہے"

وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولی اور ایسا کرتے ہوئے وہ میر آہل کو اور بھی زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔

میر آہل نے گردن ترچھی کر کے دل آویز کو دیکھا جو اب بھی اپنے ناخنوں کو گھور رہی تھی تو وہ دائیں کہنی کے بل دل آویز کی طرف جُھکا۔

"یہ کمرہ بھی تمہارا ہے اور یہ بستر بھی تمہارا ہے"

اپنائیت اور نرمی سے کہتے ہوئے۔ اُس نے دل آویز کا بازوں پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

"اور آج سے میں بھی تمہارا ہوں" اس کی سمندر جیسی خاموش اور گہری آنکھیں دل آویز کی آنکھوں میں گڑ گئی تھیں۔

میر آہل کا انداز تھا یہ کوئی دو دھاری تلوار جو دل آویز کے دل میں پیوست ہوا تھا۔

"م۔۔ میں کپڑے بدل کر آتی ہوں" وہ بازوں چھڑا کر بولی۔

"ہمم اندر کلازٹ سے میرے کپڑے نکال لو کل میں سرونٹ کو بول کر تمہارا سارا سامان یہاں شفٹ کرنے کے لئے کہہ دوں گا" وہ واپس لیٹتے ہوئے بولا۔

"میں آپ کے کپڑے کیسے پہن سکتی ہوں" وہ تذبذب سے بولی۔

"اٹس اوکے ویسے بھی میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں"

وہ آنکھ بند کر کے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا

"ہیں؟"

دل آویز کو اُس کی بات سمجھ نہیں آئی

"اب تم جارہی ہو یہ میں آؤں تمہاری مدد کے لئے"

وہ بستر سے اٹھتے ہوئے بولا دوسرے معنوں میں دھمکی دی۔

"نہیں۔۔۔ نہیں میں جاتی ہوں"

وہ فوراًواش روم میں گُھس گئی تو کچھ دیر میر آہل واش روم کے دروازے کو مسکرا کر تکتا رہا۔

کچھ دیر بعد دل آویز میر آہل کا ڈھیلا ڈھالا سا سرمئی رنگ کا نائٹ سوٹ پہنے واش روم سے نکلی۔ سیاہ لمبے بال دائیں کندھے سے ہو کر آگے کو گر رہے تھے۔ دل آویز مارے شرم کے پانی پانی ہو رہی تھی اور میر آہل کی نظریں تھیں جنہیں دل آویز کے سراپے سے ہٹانا اس وقت مشکل ہو گیا تھا۔

میر آہل کا وجود اس طرح سے جم گیا تھا جیسے مقناطیس کی کشش سے لوہا جم جاتا ہے۔

میر آہل کی نظروں کا ارتکاز سمجھتے ہوئے دل آویز مزید جھینپ گئی۔ میر آہل نے خود پر ضبط کرتے ہوئے کروٹ بائیں جانب لے لی۔

اب اُس کا رُخ ٹیرس کی جانب تھا۔۔۔ دل آویز چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے بیڈ تک آئی اور خاموشی سے دائیں کروٹ پر لیٹ گئی۔ دونوں کی ایک دوسرے کی جانب پشت تھی مگر دل میں خیال ایک دوسرے کا تھا۔ درمیان میں محض پانچ اِنچ کا فاصلہ حائل تھا مگر یوں لگتا تھا کہ صدیوں کی مسافت ہے۔

انسان جو دل میں محسوس کرتا ہے وہ کہہ کیوں نہیں پاتا غلطی دل کی ہوتی ہے یہ انسان کی۔

☆...☆...☆

اینا اور نگزیب برمنگھم کی خالی سڑکوں پر دیوانہ وار گاڑی بھاگا رہی تھی۔ گاڑی کا اسپیکر فُل والیم پر بج رہا تھا۔ یہ کیسی دیوانگی تھی جس نے اُس کی دنیا میں قیامت بپا کر دی تھی۔

میر آہل۔۔۔ اب اُس کی زد نہیں رہا تھا۔

میر آہل۔۔۔ اب اس کی جنونیت بن چُکا تھا۔

اور جنونیت اکثر انسان کو زندگی اور موت کے پُل سرات پر لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔

رات کا ایک بج رہا تھا لیکن اینا کے لئے دن رات برابر ہو گئے تھے۔ جنونیت دن کے سارے پہر اور وقت کا حساب تباہ کر دیتی ہے۔

اُس کا دل دُکھ رہا تھا اور دنیا بھر کی تمام تر قیمتی اشیاء بھی مِل کر اُس دکھ کا ازالہ نہیں کر پا رہی تھیں۔۔۔

جو محبت کرتے ہیں انہیں دنیا خوار کیوں کرتی ہے؟

اینا کی سرخ آنکھوں میں ہلکا سا پانی اُتر آیا تھا جس میں وہ اپنے ارمانوں کو ڈوبتے دیکھ رہی تھی۔

دکھ ہوتا ہے جب آپ کسی کو پوری شدت سے چاہو، اُسے ہر پل اپنے رب سے مانگو پر وہ شخص بنا کسی جدوجہد کہ کسی اور کو مِل جائے۔

محبت کا اتحاس لکھنے والوں نے یہ کیوں نہیں لکھا کہ محبت پر ایک طرفہ پیار کرنے والوں کا سب سے زیادہ حق ہوتا ہے۔ جو کہانیاں مکمل نہیں ہوتیں ان کہانیوں کو دنیا کیوں یاد نہیں کرتی؟

کیوں کامل محبتوں کو عنوان کا محور بنایا جاتا ہے؟ یک طرفہ محبتیں کیا اتنی فرسودہ اور بیکار ہوتی ہیں جن کا ذکر ان کتابوں میں نہیں جہاں لیلہ مجنوں کی داستانیں رقم ہیں۔

اور لمحوں کی بات تھی اینا کا دھیان بھٹکا اسے خیال ہی نہیں رہا کہ وہ گاڑی رونگ وے چلا رہی ہے۔ سامنے سے آنے والی کار کی تیز ہیڈلائٹ نے اینا کی آنکھوں کو چندھیا دیا تھا۔ اس نے اسٹیئرنگ تیزی سے گھمایا اور گاڑی زور سے سڑک کے کنارے پر موجود ایک بلند قامت درخت سے جا ٹکرائی۔ ہوا میں دھواں سا پھیل گیا۔

اینا کا سر زور سے اسٹیئرنگ سے ٹکرایا اور آہستہ آہستہ اُس کی آنکھوں کے سامنے دُھندلاہٹ پھیل گئی۔ اس دُھند میں اُسے ایک پیکر دکھا تھا۔۔۔ وہ کون تھا اس کا ذہن پہچان نہیں پا رہا تھا۔

ایک لمس تھا جس نے اینا کو سہارا دے کر گاڑی سے باہر نکالا تھا۔ ایک آواز تھی جو شناسائی کا پیغام دے رہی تھی اور اینا بے ہوش ہو گئی۔ جیسے اُسے اطمینان تھا کہ وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔

☆...☆...☆

دل آویز خواب خرگوشی میں تھی ہر شہہ سے بے نیاز مگر میر آہل کی نیندیں تو اُڑ گئی تھیں۔

ایک کروٹ پر لیٹے لیٹے اس کی گردن اور بازو اکڑ گئے تھے۔ اس نے آہستگی سے کروٹ بدلی تو نظروں کے آگے دل آویز کا بے پرواہی سے بکھرا سراپا تھا۔

زندگی کی افراتفری میں اس نے کبھی دل آویز کو فرصت سے دیکھا ہی نہیں تھا۔

اس کی آنکھیں، نرم ریشم جیسی پلکیں، سرخ متورم ہونٹ اور سفید ٹمٹماتے گال۔۔۔ اچانک ہی میر آہل کو اپنی غفلت پر حیرت ہوئی تھی۔

دل آویز کے سلکی نرم بال اس کے ماتھے سے پھسل کر اس کی آنکھوں اور چہرے کو چوم رہے تھے۔ میر آہل نے انہیں اُس کے چہرے سے ہٹانے کی کوشش نہیں کی کہ اگر یہ خواب تھا تو جاگنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ بس دل آویز کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا، کتنے لمحے اس نے بنا پلکیں جھپکائے گزار دیئے۔ اُسے اپنی دھڑکن کی تیزی میں واضح فرق محسوس ہوا تھا۔ اُسے اب احساس ہوا تھا کہ اس کا دل آج تک کسی دوسری عورت کے لئے نرم کیوں نہیں پڑا تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ میر آہل نے کبھی خوبصورتی دیکھی نہیں تھی پر جو دل آویز میں تھا وہ کسی دوسری عورت میں نہیں تھا اور نا ہی ہو سکتا تھا۔۔۔ کیونکہ کوئی دوسری عورت اُس کے نکاح میں نہیں تھی۔

گھڑی کے کانٹوں کی کھچ کھچ اور تیزی سے دھڑکتا ہوا دل۔۔۔ میر آہل اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

اس نے پیچھے مُڑ کر دیکھنے کی جرأت نہیں کی تھی 'یوں جیسے پیچھے مڑ کر دیکھتا تو مٹی کا مجسمہ بن جاتا۔ وہ اٹھ کر ٹیرس کی کھلی فضا میں آ گیا۔

ریلنگ پر دونوں ہتھیلیاں جمائے وہ نیچے دور تک پھیلے سبزہ زار کو دیکھ رہا تھا۔

آسمان پر چاند چہک رہا تھا۔۔۔ شرارت کرتی فضائوں نے میر آہل کے بالوں کو الجھا دیا تھا۔ اس نے بالوں میں ہاتھ پھیر کر اُنہیں دُرست کیا۔

اس کے لبوں کی مسکراہٹ کچھ اور ہی پیغام دے رہی تھی وہی جو میر آہل سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

☆...☆...☆

دل آویز کی آنکھ آج الارم سے نہیں بلکے کسی کے قدموں کی آہٹ سے کھلی تھی۔اُس نے گلابی ڈوروں سے سجی آنکھوں کو کھولا تو وہ بلکل اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ٹاول سے اپنے گیلے بالوں کو رگڑتے ہوئے وہ دل آویز کو پوری توجہ سے دیکھ رہا تھا۔دل آویز فوراً سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"گُڈمارننگ مسز میر آہل"

وہ ٹاول بستر پر اُچھالتا ہوا دل آویز پر جُھکا تو وہ پیچھے کو کھسکی۔میر آہل کی خاموش گہری نگاہیں ایک بار پھر دل آویز کے خوبصورت سراپے کا طواف کرنے لگیں۔

وہ جیسے جیسے دل آویز کے نزدیک آرہا تھا۔دل آویز خود کو پیچھے دھکیلتی جارہی تھی۔یہاں تک کہ وہ بیڈ کراؤن سے جالگی تو میر آہل کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ اُبھری۔وہ دل آویز کو اس طرح بے چین کرکے بہت لطف اندوز ہوا تھا۔

اس نے سائیڈ ٹیبل سے اپنا موبائل اٹھایا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جاکر کھڑا ہو گیا۔

دل آویز نے دھوے دھار نظروں سے میر آہل کو دیکھا اور چادر سائیڈ میں پھینکتے ہوئے واش روم میں داخل ہوگئی پر جیسے ہی وہ دروازہ مقفل کرنے لگی میر آہل نے ہاتھ پھنسا کر دروازہ بند کرنے سے روک دیا۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں" وہ چونکی

"دروازہ بند نہیں ہوگا" وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

"لیکن مجھے منہ دھونا ہے اور" وہ برہمی سے کہتے کہتے رُک گئی۔

"اور مجھے اپنی بیوی کو منہ دھوتے ہوئے دیکھنے کی خواہش ہے" وہ مسکراتے ہوئے دونوں بازوں سینے پر لپیٹتے ہوئے بولا تو دل آویز سٹپٹا گئی۔

"یہ کیسی عجیب خواہش ہے" دل آویز کی شکل اُتر گئی۔

"خواہش ہے تو ہے اور میری خواہشات کا احترام کرنا تمہارا فرض ہے۔۔۔ہے نہ مسز میر آہل"

وہ دل آویز کے چہرے پر آئی لٹ کو کان کے پیچھے اڑستے ہوئے بولا۔

"اب آپ منہ دھو رہی ہیں یہ میں آپ کا منہ دھلواؤں" وہ آستین چڑھانے لگا تو دل آویز نے فوراً سے نل کھول دیا اور پانی کے چھینٹیں آہستگی سے اپنے چہرے پر مارنے لگی۔

میر آہل وہی واش بیسن کاؤنٹر سے لگ کر دل آویز کو دیکھنے لگا۔ خوشی، تسکین اور مسرت جیسے الفاظ کم تھے اس لمحے میر آہل کی کیفیت کو بیان کرنے کے لئے جو وہ اس پل دل آویز کو دیکھ کر محسوس کر رہا تھا۔ یہ محبت جسمانی محبتوں سے پرے تھی۔ سب سے عزیز اور سب سے معتبر۔

"میرا برش میرے واش روم میں ہے" میر آہل کا تسلسل دل آویز کی آواز سے ٹوٹا جو اُس سے مخاطب تھی۔

"کوئی بات نہیں تم میرا برش استعمال کر لو" اُس نے کیبنٹ سے اپنا برش نکال کر اُس کی جانب بڑھایا۔

دل آویز نے چونک کر میر آہل کو دیکھا جو اُسے پہلے ہی بڑی محبت اور توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے خاموشی سے اس کا برش تھام لیا۔

اگلے چند منٹ۔۔۔ جب تک دل آویز نے برش کر کے اپنا منہ صاف نہیں کر لیا وہ اسی طرح اُسے دیکھتا رہا۔ جیسے ہی دل آویز نے ٹاول بار کی جانب ہاتھ بڑھایا تو میر آہل نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

دل آویز کو لگا اُس کا سانس درمیان میں ہی اٹک گیا ہے وہ اپنی جگہ سے ہِل نہ سکی۔ میر آہل نے ٹاول بار سے ٹاول کھینچا اور دل آویز کے چہرے کو آہستگی سے پونچھنے لگا۔

اس پورے وقت میں میر آہل کی نظریں ایک پل کے لئے بھی دل آویز کے چہرے سے نہیں ہٹی تھیں۔ دل آویز کے صبیح چہرے پر سرخی چھا گئی۔

"میں یونیورسٹی کے لئے لیٹ ہو رہی ہوں"

دل آویز نے اُسے یاد دھیانی کروائی ورنہ میر آہل تو کسی اور ہی موڈ میں تھا۔

"جی مجھے معلوم ہے مگر میرا دل تمہیں پریشان کر کے ابھی پوری مطمئن نہیں ہوا ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ یہی کرسی ڈال کر بیٹھ جاؤں" وہ اُسے چھیڑتے ہوئے بولا۔

میر آہل کی بات پر دل آویز کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"مگر اٹس اوکے آج کے لئے اتنا کافی ہے آپ اطمینان سے نہالیں" وہ دل آویز کو پہلے ہی کافی ستا چُکا تھا۔ اس لئے اُس نے ننھی سی جان پر رحم کیا اور واش روم کا دروازہ مقفل کر کے باہر آ گیا اور نجانے کتنی دیر وہ باہر کھڑا بنا آواز کے ہنستا رہا تھا۔

"یہ اللہ یہ راتوں رات کونسا سسٹم فِٹ کر دیا ہے آپ نے اِن کے اندر" دل آویز اب بھی شاک کی کیفیت میں تھی۔ اُس کا دل ہزار کی اسپیڈ سے دھڑک رہا تھا۔

☆...☆...☆

دھیرے دھیرے اس کا دماغ غفلت کی تاریکیوں سے باہر آ رہا تھا۔ اس نے تھکی تھکی پلکوں کو اٹھا کر اطراف میں نظر ڈالی تو وہاں موجود ہر شہہ اُسے شناسا سا لگی۔

وہ کچھ دیر بیدار ہو جانے والے ذہن کے ساتھ چِت لیٹی چھت گھورتی رہی۔۔۔

"شُکر بٹیا رانی کی نیند کُھل گئی ورنہ میری تشریف یہاں بیٹھے بیٹھے کاؤچ کی ہی شکل اختیار کر لیتی" الہان اس کے سر پر آ کر کھڑا ہو گیا۔

"اُففف مکھی کی طرح بھنبھنانا بند کرو اور یہ بتاؤ مجھے ہوا کیا تھا" اینا اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگی مگر اس کے سر میں زبردست قسم کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔

"شراب حرام ہے اور شراب پینے والا حرام۔۔۔ کُھو کُھو" اس نے زور سے کھانس کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اب نشے میں دُھت گاڑی چلاؤ گی تو یہی ہو گا نہ۔۔۔ اپنی گاڑی کا ستیاناس کیا سو کیا میری کاواساکی کو بھی شہید کر دیا۔۔۔ نہیں مطلب اپنی گاڑی پھوڑی سو پھوڑی میری معصوم بائیک نے تمہارا کیا بگاڑا تھا جو اُسے جنت میں پہنچا دیا تم نے" وہ دونوں ہاتھ کمر پر ٹکائے برہمی سے اینا کو گھور رہا تھا۔

"بھاڑ میں جائے تمہاری بائیک۔۔۔ جو نقصان میرے دل کا ہوا ہے اس کے آگے یہ سب معمولی سی بات ہے" اینا اپنا سر پکڑتے ہوئے بولی

"تم ایڈیٹ ہو اینا کچھ بھی ہو سکتا تھا شکر کرو تمہیں کچھ نہیں ہوا اور نہ جس کی یاد میں تم پی کر ڈرائیو کر رہی تھی۔۔۔ تم مر جاتی اور وہ تمہاری قبر پر پھول تک ڈالنے نہیں آتا" الہان کا پارا ہائی ہوا۔

"محبت میں زد نہیں ہوتی، محبت اتنی سیلفِش نہیں ہوتی، محبت کسی کو اپنے پلو سے باندھ کر اُس کا سانس نہیں روکتی، محبت میں جکڑنا نہیں۔۔۔ آزاد کرنا سیکھو۔ خود بھی کھل کر سانس لو اور سامنے والے کو بھی لینے دو"

وہ یکدم ہی پھٹ پڑا تھا اینا نے حیرانگی سے سر اٹھا کر الہان کو دیکھا۔ وہ کبھی غصہ نہیں کرتا تھا وہ کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کیا کرتا تھا۔ وہ تو خوش اخلاق اور ہنسنے ہنسانے والوں میں سے تھا۔ اس کا یہ ردعمل اینا کو سراسر چونکا گیا تھا۔

"بس کرو یہ پاگل پن میں ماں کے بعد تمہیں کھونا افورڈ نہیں کر سکتا" وہ اچانک ہی سنجیدہ ہوا۔

وہ اپنا رُخ دیوار کی جانب موڑ چکا تھا۔ اینا کی جانب اُس کی پشت تھی۔ پتا نہیں کیا تھا جو وہ اینا سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تمہیں نہیں پتا اینا جب کوئی اپنا مرتا ہے تو کتنا درد ہوتا ہے" اس کی آواز بھرا گئی۔

جو لوگ اندر سے تباہ ہو جاتے ہیں وہ مسکراہٹ کو اپنا تکیہ کلام بنا کر دنیا کے سامنے دھڑلے سے خوش رہنے کی اداکاری کرتے ہیں۔

الہان مزید وہاں نہیں رُک سکا۔ اُسے معلوم تھا یہ باتیں یہ بھاشن سب رائیگاں ہیں۔

احساس وہ چیز ہے جو زبردستی کسی سے نہیں کروایا جا سکتا۔۔۔ آپ روئے، پیٹے، چیخے مارے یا مر جائے سامنے والے نے وہی کرنا ہے جو اُسے کرنا ہے۔

اینا کِتنی دیر گنگ سی بستر پر بیٹھی دروازے کو گھورتی رہی تھی۔ دل کو مارنا بڑا مشکل تھا خود کو مار دینے سے بھی زیادہ مشکل مگر جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی اور ہار ماننے والوں میں سے اینا اورنگزیب نہیں تھی۔

☆...☆...☆

دل آویز ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنے لمبے ریشمی بالوں میں برش پھیر رہی تھی اور گاہے بگاہے ٹیرس میں کھڑے میر آہل کو بھی دیکھ رہی تھی جو فون پر کسی سے محو گفتگو تھا۔

"بخار مجھے ہوا تھا اور دماغ ان کا چل گیا ہے" وہ جانچتی نظروں سے میر آہل کی پشت گھورتے ہوئے من ہی من میں بول رہی تھی۔

"اب کیا یہ اسی طرح مجھ پر سوار رہے گے"

اس نے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا کرنا چاہا مگر میر آہل نے اُسے ایسا کرنے سے روک دیا۔

"میرا غصہ ان پر مت نکالو۔۔۔ کُھلے رہنے دو اچھے لگتے ہیں" میر آہل اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

"چلو بھئی اب یہ بھی میر آہل ہی ڈیسائیڈ کریں گے سہی ہے ویسے بھی کونسا میری یہاں بہت چل رہی تھی"

اُس نے بیزاری سے مسکراتے ہوئے شیشے میں میر آہل کو دیکھا جو پہلے ہی دل آویز کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہیں؟"

وہ میر آہل کی نظروں سے تذبذب کا شکار ہوئی۔

"کچھ نہیں بس سوچ رہا ہوں کہ تمہاری زبان کینچی سے بھی زیادہ تیز چلتی ہے" وہ ناخن سے ٹھوڑی کھرچتے ہوئے بولا تو دل آویز ہکا بکا رہ گئی۔

"پ۔۔پر۔۔م۔۔میں نے تو کچھ کہا ہی نہیں"

وہ اپنی سیاہ بڑی آنکھیں گول گول گھوماتے ہوئے معصومیت سے بولی۔

"جو باتیں آپ اِن خوبصورت ہونٹوں سے نہیں بھی کہتیں وہ باتیں بھی میں سُن لیتا ہوں"

میر آہل نے اپنی ٹھوڑی دل آویز کے کندھے پر ٹکاتے ہوئے کہا۔ وہ برف کی طرح وہیں جم گئی اور یہ منظر میر آہل نے بڑے شوق سے سامنے آئینے میں دیکھا تھا۔

اس شخص کو سمجھنا بہت مشکل تھا۔ وہ جتنا اس سے دور بھاگتی تھی۔ وہ فرار کے تمام راستوں پر اُتنے ہی پہرے لگا دیتا تھا۔ دل آویز ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے ہٹنے لگی تو میر آہل نے اُس کا رستہ روک لیا۔

"آپ یہ سب کیوں کر رہے ہیں؟"

بوکھلاہٹ میں دل آویز کے لبوں سے پھسلا۔۔۔۔ میر آہل کی قربت اور نرمی دل آویز کے اوسان خطا کر رہی تھی۔

"میری محبت پر تمہارا حق ہے۔ میں بس تمہیں، تمہارا حق دے رہا ہوں"

اُس کے گمبھیر لہجے نے دل آویز کا سانس خشک کر دیا تھا۔

دل آویز کے بالوں سے اٹھتی مہک نے میر آہل کے دل کو تسکین دے رہی تھی۔ وہ بے ساختہ جھک کر اس کے بالوں کی خوشبو اپنے اندر اُتارنے لگا۔

"اینا آپ سے بہت محبت کرتی ہے آہل" نا جانے کیوں اس نے یہ بات کہی تھی۔

آہل نے یکدم اپنی آنکھیں کھولیں۔۔۔ اس لمحے کا سارا فُسوں ہوا ہو چُکا تھا۔ اس نے بازوں سے پکڑ کر دل آویز کا رُخ اپنی جانب کیا تھا۔

"تو تم کیا چاہتی ہو میں اُسے اٹھا کر اس گھر میں لے آؤں؟" اس نے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے کہا۔۔

"پر۔۔۔"

"پر کیا دل آویز کیا چاہتی ہو تم۔۔۔ میرے ضبط کو مت آزماؤ ورنہ بہت پچھتاؤ گی تم" میر آہل نے خون رنگ ہوتی آنکھوں کو دل آویز کی سیاہ آنکھوں میں گاڑتے ہوئے اُسے دونوں بازوؤں سے بھینچ کر اپنے اور قریب کیا۔۔

"کیا کریں گے آپ آہل" وہ اس کے سرخ ہوتے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں جو کروں گا نہ دل آویز وہ تمہارا دل برداشت نہیں کر پائے گا" اس کی گرفت اور سخت ہوئی۔

"بولو دل آویز دیکھنا چاہو گی میں کیا کروں گا۔"

اُس نے خفگی سے دل آویز کو خود سے دور کیا پھر ایک قدم نزدیک آکر ضبط سے کہا۔

"کیوں تم زبردستی اُس کا نام لیکر میرے دل میں خنجر چلاتی ہو" وہ سوال پر سوال کر رہا تھا اور دل آویز کے ہونٹوں پر جیسے قفل لگ گیا تھا۔

"میں کسی بھی چیز میں زبردستی کا قائل نہیں ہوں"

میر آہل نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے سرگوشی کی تھی۔

"مگر تم اِسی طرح مجھے اینا اورنگزیب کا نام لے لیکر پریشان کرتی رہی تو مجبوراً مجھے تمہیں لگام ڈالنی پڑے گی" وہ سنجیدگی سے کہتا، اس کے نزدیک آیا اور اس کے ماتھے پر مہر ثبت کی، نرمی سے اُسے ٹوکا۔

"آئندہ ہمارے درمیان اس عورت کا ذکر مت کرنا"

دل آویز کو اپنی دھڑکن رُکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ مزید کچھ کہنے لگا تھا کہ آہل کا فون اچانک بجنے لگا۔ اس نے برہمی سے کوٹ کی جیب سے فون نکالا تو اسکرین پر مائیکل کا نمبر اُس کا منہ چڑا رہا تھا۔

دل آویز تو موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً وہاں سے نو دو گیارہ ہو گئی۔

"اب کیا مسئلہ ہے مائیک"

میر آہل کا دل کیا کہ اُسے تھیلی میں بھر کر برمنگھم سے اتنا دور پھینکے جہاں کال کرنے کے لئے نیٹ ورک ہی موجود نا ہو۔

"کیا ہوا سر آپ کو ڈسٹرب کر دیا کیا میں نے؟" آگے سے معصوم سا سوال کیا گیا۔

"تم کب مجھے ڈسٹرب نہیں کرتے" آہل نے بھی چِڑ کر جواب دیا۔

"چلیں پھر میں بعد میں کال کرتا ہوں"

"نہیں نہیں اب چاند پر گرہن لگا ہی دیا ہے تو اب بول دو کیوں کال کی ہے تم نے" میر آہل نے پرفیوم لگاتے ہوئے کہا۔

"میں نے بس اتنا پوچھنا تھا کہ آپ آفس کے لئے کب نکلیں گے میں آپ کا پچھلے آدھے گھنٹے سے انتظار کر رہا ہوں باہر" میر آہل نے ضبط سے پرفیوم کی بوتل واپس ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی۔

"یقین کرو مائیکل آگر خون کرنا جرم نہیں ہوتا تو تم وہ پہلے شخص ہوتے جو میرے ہاتھوں اپنی جان گنواتے" میر آہل نے اُسے کھری کھوٹی سنا کر فون بند کر دیا اور دوسری جانب مائیکل سمجھ نہیں سکا کہ باس کا دماغ اتنا کیوں گرم ہو رہا ہے۔

"او نہوں۔۔۔ اچھے انسان کی تو کوئی قدر ہی نہیں ہے آج کے زمانے میں" مائیکل نے ناک سکوڑتے ہوئے موبائل کی اسکرین کو گھورا تھا۔

☆...☆...☆

دل آویز کی تو جیسے بھوک ہی اُڑ گئی تھی۔ میر آہل نے اتنی قربت جو ٹھوس دی تھی صبح صبح۔

وہ بے مقصد ہی پلیٹ میں رکھے بوائل ایگ کے ٹکڑوں کو کانٹے سے اِدھر اُدھر کر رہی تھی۔

میر آہل جب ڈائننگ روم میں داخل ہوا تو دل آویز اُسے کھوئی کھوئی سی دکھائی دی۔ وہ آرام سے اپنی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور چھری کانٹے کی مدد سے اپنا فرینچ ٹوسٹ اور آملیٹ کھانے لگا۔

ملازم نے فریش اورنج جوس آہل کے گلاس میں انڈیلا تو اس نے ہاتھ جھلا کر اُسے جانے کا اشارہ کیا۔

دل آویز کا کھویا کھویا انداز میر آہل کو تنگ کرنے لگا تو اُس نے دل آویز کے ہاتھ میں پکڑا کانٹا سائیڈ میں رکھا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

اُس کی اِس حرکت نے دل آویز کے خیال میں خلل پیدا کیا۔ اُس نے چونک کر آہل کو دیکھا۔ آہل نے فرینچ ٹوسٹ کا ایک ٹکڑا اُس کی جانب بڑھایا جسے وہ خالی ذہن کے ساتھ کچھ لمحے یوں ہی تکتی رہی۔

زندگی کے کتنے سال اُس نے کسی اپنے کی قربت کو ترستے ہوئے کاٹے تھے اُسے تو اب یاد بھی نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں۔۔۔ گلا بھر آیا تھا۔ محبت کی یہ زبان سب سے خوبصورت تھی۔ دل آویز نے بنا نظریں اٹھائے آگے بڑھ کر نوالہ منہ میں رکھ لیا۔۔۔ میر آہل نے ایسا کرتے ہوئے اُسے بہت غور سے دیکھا تھا۔

اس لمحے اُس کا بس چلتا وہ دنیا کی ہر خوشی ہر آرام دل آویز کے قدموں میں لا کر ڈھیر کر دیتا۔

کس نے کہا تھا کہ میر آہل ایک ضدی، کٹھور اور پتھر انسان تھا۔ جِسے محبت جتانی نہیں آتی تھی۔ اگر یہ میر آہل کی لو لینگویج تھی تو پھر لوگ اس لینگویج سے ناآشنا تھے۔

جذبات نے گھیر اتنگ کر دیا تھا ایسے میں دل آویز کو سُوکھا ٹوسٹ حلق سے اُتارنا مشکل لگ رہا تھا۔ اُسے غیر آرام دہ محسوس کر کے میر آہل نے اپنے جوس کا گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔

اُس نے اس بار بھی نظر اُٹھا کر پاس بیٹھے اس شخص کو نہیں دیکھا بس خاموشی سے ایک گھونٹ اپنے حلق سے اُتار لیا۔ اُس نے گلاس واپس ٹیبل پر رکھا ہی تھا کہ میر آہل نے وہی گلاس اٹھایا اور اُسے ہلکا سا گھومایا جیسے وہ دیکھنا چاہ رہا ہو کہ دل آویز نے گلاس کے کس حصے کو منہ لگا کر جوس پیا تھا۔

دل آویز نے دھیرے سے اپنی بھاری پلکوں کو اٹھا کر میر آہل کو دیکھا۔۔۔ ان نظروں میں بہت کچھ تھا۔۔۔ چاہت، تشکر، فخر اور مان۔۔۔

جس جگہ سے دل آویز نے جُوس پیا تھا میر آہل نے بھی اُسی جگہ سے منہ لگا کر جوس پیا تھا۔

دل آویز کا سینہ اس لمحے تفاخر سے پھول گیا۔ وہ چپ چاپ ناشتہ کرتا رہا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

میر آہل کے بہت سے روپ تھے اور ہر روپ ایک سے بڑھ کر ایک تھا پہلے میر آہل نے اُسے اپنی سختی سے گھائل کیا تھا اب وہ اُن زخموں کی بھرپائی اپنی محبت سے کر رہا تھا۔

☆...☆...☆

"کل تو تم بہت چہک رہی تھی اب کیوں پریشانی میں چکر کاٹ رہی ہو"

الہان بینچ پر پاؤں رکھ کر بیٹھا تھا اور جولیانہ سامنے دائیں سے بائیں چکر لگا رہی تھی۔

"ہاں مگر زیادہ منہ چلانے پر ڈانٹ بھی تو پڑے گی دل آویز سے اب انہیں کیا معلوم میں وہ باتیں کس مصلحت کے تحت بول رہی تھی" وہ دونوں ہاتھ آپس میں مسلتے ہوئے بولی۔

"ویسے دل آویز آج تمہارے ساتھ یونیورسٹی کیوں نہیں آئی" الہان نے سرسری سا سوال کیا۔۔

"پتا نہیں شاید ناراض ہیں مجھ سے اس لئے۔۔۔ کہہ رہی تھیں کہ زحمت کرنے کی ضرورت نہیں آج وہ خود آجائے گی" بتاتے ہوئے جولیانہ کا منہ اُتر گیا۔

"ارے وہ دیکھو دل آویز آرہی ہے" الہان نے دور سے سبزہ زار کے درمیان بنی سڑک پر چلتی ہوئی دل آویز کو اُنہی کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔

"بیٹا آگئی ہے چڑیل خیر مناؤ اپنی اب"

الہان کیٹ فائٹ کے لئے خود کو بینچ پر کمفرٹیبل کر رہا تھا لیکن اگلے پل جو ہوا وہ دیکھ کر اس کا جبڑا کھلا کا کھلا رہہ گیا۔

"تھینک یو جُولی۔۔۔۔ تھینک یو سو مچ"

دل آویز آکر سیدھا جولیانہ کے گلے سے لگ گئی تھی۔

الہان تو الہان جولیانہ کا خود کا منہ بھی کُھلا کا کھلا رہہ گیا تھا۔

"میں ہمیشہ اپنے برے حالات کی ذمہ دار خود کی قسمت کو سمجھتی تھی۔۔۔ سمجھتی تھی کہ میرے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا ہے میں اُسی کی حقدار ہوں لیکن اللہ میری تکلیفوں کا صلہ اتنے خوبصورت انداز میں دیگا میں نے سوچا نہیں تھا" دل آویز رو رہی تھی اور جولیانہ کو با قاعدہ اپنے کندھے گیلے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔

"میں بہت خوش قسمت ہوں کہ میری زندگی میں تم جیسی دوست ہے" وہ اس سے الگ ہوتے ہوئے پر جوشی سے بولی تو جولیانہ کا چہرہ لال ہو گیا۔

"اب آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں دل آویز" اس کی آنکھیں بھی نم ہونے لگیں۔

"واہ کیا ایموشنل سین ہے بس بیک گراؤنڈ میوزک کی کمی ہے۔۔۔ دِھم تنانانانانانانا" وہ مضحکہ خیز انداز میں بولا تو وہ دونوں ہنس پڑی۔

"چلو شکر یہ خواتین مسکرائی بالآخر" وہ بھی مسکرایا۔

"کہیں ہمارا پیار دیکھ کر تمہیں جلن تو نہیں ہو رہی الہان" جولیانہ نے آنکھ دبائی۔

"جلن اونہوں یہ لفظ میری ڈکشنری میں دور دور تک نہیں ہے میڈم" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔

"ویسے جُولی وہ مائیکل تم سے کیا بات کر رہا تھا کیا تمہیں کافی ڈیٹ کے لئے پوچھ رہا تھا؟"

دل آویز نے کن اکھیوں سے الہان کا چہرہ دیکھتے ہوئے جولیانہ کو اشارہ کیا۔

"ہاں کافی دن سے پوچھ رہا ہے سوچ رہی ہوں اُس بیچارے کی یہ خواہش پوری کر ہی دوں" جولیانہ نے اس کی آنکھ کا اشارہ سمجھتے ہوئے بات بنائی۔

"اب یہ مائیکل نام کا نمونا کون ہے بتانا پسند فرمائیں گی آپ دونوں" وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"ارے کچھ نہیں مائیکل آہل کے پی-اے ہے بلکہ چھوٹے بھائیوں جیسا ہے" دل آویز نے سرسری لہجہ بناتے ہوئے کہا۔

"اور یقین کرو تھوڑا بہت ہینڈسم بھی ہے" جولیانہ نے اپنی ہنسی پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"اِنَّ اللہَ مَعَ الصّٰبِرِینَ"

وہ سمجھ گیا تھا وہ دونوں کیا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"میں جا رہا ہوں کلاس۔۔۔۔ چلو بھاگو اب تم دونوں" وہ اپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گیا۔

"ارے ارے رُکو تو۔۔۔۔ اوئے کالی پینٹ والے"

"ارے سُنو تو جانے من"

پیچھے سے دل آویز اور جولیانہ چھچھوری لڑکیوں کی طرح اُسے آوازیں دینے لگیں۔

"مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا"

الہان نے انگلیاں دونوں کانوں میں ٹھوس لیں۔

گرمی کے موسم میں یکدم بہار آ گئی تھی۔ ایک بار پھر اُن سب کی زندگیاں پٹڑی پر آ گئی۔ ہنسی نے ایک بار پھر ان کے در پر دستک دینا شروع کر دی تھی۔ وقت بجلی سے بھی زیادہ تیز دوڑنے لگا۔

دل آویز اور میر آہل کے درمیان آئی دوریاں آہستہ آہستہ کم ہونے لگی تھیں۔ اِن دونوں کے درمیان پانچ اِنچ کا فاصلہ اب بھی برقرار تھا۔ مگر دِلوں میں آئی دوریاں کم ہو گئی تھیں۔

اب وہ دونوں بلاضرورت بھی بات کر لیا کرتے تھے۔ اکثر رات کے کھانے کے بعد میر آہل اور دل آویز ایک ساتھ واک پر بھی جایا کرتے تھے۔

اور کبھی کبھی وہ دل آویز سے فرمائش پر اپنی پسند کے کھانے بھی بنوایا کرتا تھا۔

میر آہل اب دل آویز کے سو جانے کے بعد سویا کرتا تھا کیونکہ دل آویز کو نیند کی وادیوں میں ڈوبے دیکھنا اب اُس کا پسندیدہ مشغلہ بن چکا تھا۔

☆...☆...☆

"دل آویز یہ کالم آپ نے لکھا ہے؟"

جولیانہ اس کی ڈائری تھامے حیرت کے ملے جلے تاثرات لئے بول رہی تھی۔

"کسی کی ڈائری پڑھنا اخلاقی گناہ ہے جُولی"

دل آویز نے فوراً اپنی ڈائری اس کے ہاتھ سے کھینچی۔

"مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا آپ اتنا اچھا لکھتی ہیں دل آویز" وہ ابھی بھی شاک میں تھی۔

"ہاں بس کبھی کبھی" وہ مسکرائی

وہ دونوں اِس وقت اسٹڈی روم کی دیوار سے ٹیک لگائے زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔

سامنے زمین پر اسنیکس اور سوفٹ ڈرنکس کے دو گلاس رکھے ہوئے تھے اور اطراف میں کاغذ اور کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔

دل آویز اپنے کسی پراجکٹ پر کام کر رہی تھی اور جولیانہ اُسے اکثر کمپنی دینے آجایا کرتی تھی۔ ہاں البتہ اِلہان اُس دن کے بعد سے کبھی دل آویز کے گھر اُس سے ملنے نہیں آیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کے اور میر آہل کے درمیان اب کسی بھی قسم کی دوری آئے۔

"آپ اِسے کسی میگزین یا کسی نیوز پیپر میں شائع کیوں نہیں کرتیں ٹرسٹ مِی بہت ہی زبردست لکھا ہے آپ نے" وہ پرجوش ہوئی۔

"تم پاگل ہو نہیں نہیں۔۔۔ بہت بکواس ہے یہ، کوئی بھی نہیں چھاپے گا اِس کالم کو" اس نے فوراً ٹال دیا تو جولیانہ کا منہ بن گیا۔

"یار آپ اتنی منفیت لاتیں کہاسے ہیں۔۔۔ جب بھی سوچتی ہیں منفی ہی سوچتی ہیں کبھی کچھ اچھا سوچتی ہی نہیں" وہ مصنوعی غصہ دکھاتے ہوئے بولی۔

"ارے تم غصہ مت ہو پلیز اور مجھے بتاؤ کہ میری برتھ ڈے پر مجھے کیا تحفہ دے رہی ہو" وہ گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے بولی۔

"ہمم سرپرائز ہے ابھی نہیں بتانے والی میں" وہ چہک کر بولی تو دل آویز بھی مسکرائی۔

"ویسے میر سر نے بھی تو کچھ پلان کیا ہو گا نہ آپ کے لئے"

"اُنہیں تو میری سالگرہ کا پتا ہی نہیں ہے پاگل" وہ کچھ اداس ہوئی۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ میر سر کو آپ کی برتھ ڈے ہی نہیں معلوم۔۔۔ میں نہیں مانتی" اس نے نفی میں سر ہلایا

"اُنہوں نے کبھی پوچھا ہی نہیں۔۔۔۔ خیر چھوڑو ابھی کام بہت ہے مجھے کل تک اس پراجیکٹ کو مکمل کرنا ہے اُففف "اُس نے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

"تو کیا الہان آپ کی کوئی مدد نہیں کر رہا اس پراجیکٹ پر؟"

"وہ چھ فِٹ کا اپنا کونڈا صرف میری ناک میں دم کر سکتا ہے۔۔۔ مدد نہیں" دل آویز نے انتہائی گندا منہ بنا کر بولا تو جولیانہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"یار کیا بنے گا آپ دونوں کا" وہ ہتھیلی پر چہرہ گراتے ہوئے بولی۔

☆...☆...☆

میر آہل سامنے کاؤچ پر بیٹھا ہوا تھا سامنے ٹیبل پر لیپ ٹاپ کُھلا ہوا تھا۔ سائیڈ میں کچھ فائلز رکھی ہوئی تھیں۔ وہ کافی مصروف دکھائی دے رہا تھا اور دل آویز جلے پاؤں کی بلی کی طرح کمرے کا اِدھر سے اُدھر چکر کاٹ رہی تھی۔

اس نے موبائل کی اسکرین آن کی تو ابھی بارہ بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ وہ نا جانے کس امید پر میر آہل کے سامنے کیٹ واک کر رہی تھی۔

جِسے سِرے سے معلوم ہی نہیں تھا کہ آج رات بارہ بجتے ہی اس کی بیوی کی سالگرہ شروع ہو جائے گی وہ دل آویز کی بے چینی سے بے خبر اپنے کام میں پوری طرح سے غلطاں تھا۔

یکدم دل آویز پاؤں پٹخ پٹخ کر چلنے لگی تو میر آہل نے سر اٹھا کر اُسے غور سے دیکھا۔

"کیا ہوا؟"

اس نے ایک آئی برو اُچکا کر اشارے میں پوچھا۔

"ک۔۔ کچھ نہیں"

دل آویز نے چہرہ کتاب کی اوٹ میں چھپا لیا۔

کچھ دیر بعد اس نے ہلکی سی آنکھ باہر نکال کر دیکھا تو وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو چکا تھا۔ دل آویز کو شدید غصہ آیا۔

"میں نے کبھی نہیں بھی بتایا تو کیا ہوا انہیں خود سے معلوم ہونا چاہئے تھا"

ہاں جیسے میر آہل کے پاس الدین کے چراغ سے نکلنے والا جن ہو۔۔۔ آخر وہ بزنس مین تھا نبض پکڑ کر مرض بتا دینے والا حکیم نہیں۔

اُس نے غصے سے کتاب سائیڈ ٹیبل پر پٹخی تو ایک بار پھر میر آہل نے نظریں لیپ ٹاپ اسکرین سے ہٹا کر دل آویز پر جمالیں۔

"رات کے بارہ بجنے والے ہیں کل آپ کو یونیورسٹی بھی جانا ہے میرے خیال سے۔۔۔ اس لئے برائے مہربانی چیزیں توڑنے کے بجائے آنکھ بند کر کے سو جائے مجھے ابھی بہت کام کرنا ہے"

وہ نہایت ہی مؤدبانہ انداز میں گزارش کرتے ہوئے بولا تو دل آویز ضبط سے اپنا منہ بند رکھتے ہوئے سائیڈ ٹیبل کا لیمپ آف کر کے اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے ایک نظر موبائل اسکرین پر دوسری سامنے بیٹھے شخص پر تھی۔

"اونہوں۔۔۔ میں آپ کے سارے حقوق پورے کروں گا بڑے آئے بیوی کا بر تھ ڈے تو پتا نہیں اور بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں"

دل ہی دل میں منہ ٹیڑھا میڑھا بناتے ہوئے اس نے میر آہل کو شکایت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

میر آہل کی توجہ، پیار اور اس پر جان نچھاور کرنے والی ہر ایک ادا اس وقت دل آویز بُھلا چکی تھی۔

اس وقت شکوہ تھا تو اُس کی سالگرہ معلوم نہیں ہونے کا شکوہ تھا اور بس۔۔۔۔

میر آہل کو یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ اس وقت ایک ایسے کمرے میں بیٹھا ہے جہاں انڈیا اور پاکستان کے بارڈر سے بھی زیادہ خطرہ ہے۔

کیونکہ یہاں اِس کمرے میں ایک بیوی بیٹھی ہے جو اپنے شوہر سے غصہ ہے اور کسی بھی وقت غصے سے پھٹ سکتی ہے۔

جیسے جیسے گھڑی کے کانٹے آگے کو سرک رہے تھے دل آویز کا ضبط اور غصہ اوپر جا رہا تھا۔

ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین

اُس نے غصے سے چادر منہ پر اوڑھی اور تکیے کو غصے سے بھینچ کر لیٹ گئی۔ آنکھ کے کنارے ہلکے ہلکے بھیگنے لگے۔ اُسے بہت برا لگ رہا تھا بہت زیادہ

بارہ بج چکے تھے اور میر آہل اپنے کام میں مصروف تھا۔۔۔۔۔۔۔ پر نہیں اچانک ہی کسی نے اُس کے چہرے سے چادر آہستہ آہستہ نیچے کی۔

دل آویز رو رہی تھی اُس نے آہستگی سے آنکھیں کھولیں تو میر آہل نیچے گھٹنے کے بل بیٹھا اُسے مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

"تم نے میر آہل کو کچھ زیادہ ہی انڈر اسٹیمیٹ کر لیا ہے جان"

اُس نے دل آویز کے کان پر جُھک کر سرگوشی کی تو دل آویز نے شرمندگی سے نظریں نیچے کر لیں۔

"ہیپی برتھ ڈے وائیفی"

اس نے جُھک کر اس کی گیلی پلکوں کو باری باری چُوما تو اس نے خجالت سے نظریں چرا لیں۔ اُسے دل آویز کی سالگرہ یاد تھی۔ اس کا مطلب وہ میر آہل کے لئے اہم تھی۔ اس کا دل رُک گیا تھا۔ُس کی سانس تک رُک چکی تھی۔ اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ چادر میں اپنا چہرہ چُھپا لے۔

میر آہل نے نرمی سے دل آویز کا ہاتھ پکڑا تو وہ حیا سے مزید سمٹ گئی۔ اُس نے اپنی ٹراوزر کے پاکٹ سے ایک ڈائمنڈ رنگ نکال کر دل آویز کی انگلی میں پہنا دی اور اس کے ہاتھ کو نرمی چُوما۔

اُس نے نیم اندھیرے میں دل آویز کے خوشی سے چمکتے ہوئے چہرے کو دیکھا تھا۔ وہ خوشی سے جی اُٹھی تھی۔ میر آہل نے اُس کے نازک سراپے کو نرمی سے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ چکے تھے۔

وہ شرمائی لجائی خود کو میر آہل کی گرفت میں بکھرتے ہوئے محسوس کر رہی تھی اور اُس کی دھڑکن ہر پگھلتے لمحے کے ساتھ رضامندی کا پیغام دے رہی تھی۔ میر آہل نے اُسے اپنی قربت کی چادر میں لپیٹ لیا تھا۔ یہ وہ فاصلہ تھا جو آج وہ دونوں طے کر چکے تھے۔ اب درمیان میں کچھ نہیں تھا سوائے محبت اور عقیدت کے۔

رات موم کی طرح جلِ رہی تھی۔۔۔۔ جہاں یہ موم کے قطرے دل آویز کے دل پر مرہم بن کر گرے تھے تو وہی کھڑکی سے لگ کر کھڑی گُم سُم سی اینا اور نگزیب کے دل کو چھلنی چھلنی کر گئے تھے۔

☆...☆...☆

برمنگھم کے آسمان پر سورج کی کرنوں نے اپنا جال پوری طرح بِچھا دیا تھا۔ ٹیرس سے آتی تازہ ٹھنڈی ہوا نے دل آویز کے چہرے کو چھو کر اُسے نئے دن کا پیغام دیا۔ اُس کے بالوں میں میر آہل کی سانسوں کی خوشبو اُلجھی ہوئی تھی اور اُس کا خوبصورت چمکتا ہوا چہرہ آہل کی قربت کے ڈوروں سے سجا ہوا تھا۔

وہ اپنے وجود پر اُس کا لمس ابھی تک محسوس کر رہی تھی۔

دل آویز نے اپنی ریشمی پلکوں کو اٹھا کر اپنے پہلو میں لیٹے شخص کو دیکھا جو تکیے پر کہنی کے بل لیٹا چہرہ ہتھیلی پر ٹکائے اُس کی آنکھوں میں نظر آتے اپنے عکس کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

میر آہل نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں بھر لیا۔ دل آویز کا چہرہ گلنار ہو چُکا تھا۔ وہ شرما کر پیچھے ہٹی تو میر آہل نے اُسے اپنی جانب کھینچ لیا۔

" آج میرے پراجیکٹ کی لاسٹ ڈیٹ ہے آہل" دل آویز نے اُس کی نیت کو بھانپتے ہوئے تذبذب سے کہا۔

" افففففف"

میر آہل نے بیزاری سے سر تکیے پرِ گرا دیا تو اس نے کِھلکھِلا کر ہنستے ہوئے اپنا چہرہ اس کے سینے پر ٹکا دیا۔

"تم جب مسکراتی ہو تو میری دھڑکن کی رفتار دھیمی ہو جاتی ہے" اُس نے تند مزاجی سے کہتے ہوئے حصار تنگ کیا۔

" اپنے دل سے کہیئے کہ میں آج کی تاریخ میں بہت مصروف ہوں" دل آویز شرارت سے کہتے ہوئے میر آہل سے دور ہوئی اور واش روم کی جانب بھاگی۔

" تمہیں تو میں دیکھ لوں گا۔"

میر آہل چیلنجِنگ انداز میں آئی بروز اُچکاتے ہوئے جھلانگ مار کر بستر سے اٹھا اور شرارت سے دل آویز کے تعاقب میں واش روم کی جانب بھاگا۔

☆...☆...☆

دل آویز نے آج سرخ رنگ کا لباس زیب تن کیا تھا۔ سلک کی لمبی تخنوں تک جھولتی فراک اور چوڑی دار پاجامہ اس کے سراپے کو مزید خوبصورت بنا رہا تھا۔ سرخ لباس میں سجی وہ آئینے کے سامنے اپنے بال سنوار رہی تھی۔ اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ اُس کے دل کے تمام بھید کھول رہے تھے۔

دل آویز نے شیشے میں اُسے ایک نظر دیکھا تھا۔ وہ دل آویز کے این پیچھے کھڑا اپنے گیلے بالوں کو ٹاول سے رگڑ رہا تھا۔

اُس نے لائٹ گرے سوٹ سیاہ واسکٹ کے ساتھ پہن رکھا تھا اور سیاہ رنگ کی پلین ٹائی گردن میں ڈال رکھی تھی۔ بال ماتھے پر لاپرواہی سے بکھرے ہوئے تھے۔ وہ یونانی دیوتا لگ رہا تھا۔ خطرناک حد تک جاذب نظر اور دل فریب۔۔۔

میر آہل نے شیشے میں دیکھتے ہوئے دل آویز کو اپنی ٹائی باندھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے معصومیت سے شانے اچکائے۔

"مجھے ٹائی باندھنی نہیں آتی"

"مسز میر۔۔۔!! آپ فرار کے راستے ڈھونڈنا بند کریں کیونکہ اب فرار ممکن نہیں ہے" اُس کا اشارہ صاف تھا۔

دل آویز کے ہونٹوں پر تالے لگ جاتے تھے جب بھی وہ اپنے گھمبیر لہجے میں اُس سے کچھ کہتا تھا۔

کتنا مشکل تھا اس کی آسان سی بات کا کوئی بھی جواب دینا۔

وہ کوئی ساحر تھا جو اپنی باتوں کے سحر میں دل آویز کو گھیر لیتا تھا۔ اس کی آنکھیں جادوئی تھیں جو دنیا کی ہر شہہ پس منظر سے غائب کر دیتی تھیں اور اُس کا لہجہ نشیلے مشروب جیسا تھا جو سننے والے کا دماغ خراب کرنے کے لئے کافی تھا۔

"لیکن مجھے واقعی ٹائی باندھنی نہیں آتی آہل"

اس نے ٹائی ہاتھوں میں لیتے ہوئے ٹائی کے دونوں سِروں کو باری باری دیکھتے ہوئے آہل کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

"ڈونٹ وری" اس نے مسکرا کر دل آویز کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے۔

"میں ہوں نا۔۔۔۔ میرے ہوتے ہوئے اب تمہیں کبھی کسی چیز کی پرواکرنے کی ضرورت نہیں ہے دل آویز۔۔۔۔ میں زندگی کے ہر موڑ پر تمہیں مکمل کرنے کے لئے کھڑا رہوں گا۔ ہمیشہ تمہارے ساتھ، تم سے پہلے اور تمہارے بعد۔۔۔۔"

اس نے جھک کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔

"پرامس"

دل آویز نے بڑے مان سے سر اٹھا کر آہل کو دیکھا تھا۔

"آئی پرامس وائیفی"

اس نے دل آویز کو اپنے حصار میں لیتے ہوئے یقین دھیانی کروائی تھی۔ یہ مان اُسے ہی رکھنا تھا زندگی بھر ۔۔۔۔ آخری سانس تک۔۔۔۔!!!

☆...☆...☆

دل آویز کی یونیورسٹی کی جانب بڑھتی گاڑی سگنل پر آکر رُکی۔ جولیانہ اس کے عقب میں بیٹھی ہوئی تھی اور مسلسل اُس کی اُنگلیاں اسکرین پر مچل رہی تھیں۔

دل آویز نے نظر ترچھی کرکے جولیانہ کو دیکھا جو کافی مصروف دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے جولی کے ہاتھوں سے موبائل لیکر اُسے الٹا کرکے سائیڈ پر رکھ دیا۔

"الہان سے بات کر رہی تھی ضروری ہے"

وہ جلدی سے بولی مگر دل آویز نے دھیان نہیں دیا۔ بس ایک مسکراہٹ کا تبادلہ کیا۔

"کیا بات ہے دل آویز آج تو بال سِلکی سِلکی اور گال مِلکی مِلکی لگ رہے ہیں"

اس نے دل آویز کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے شرارت سے کہا تو اس نے ہنس کر نظریں نیچے کرلیں۔

خوشی منہ سے بتائی نہیں جاتی چہرے پر بہار کی طرح بکھر جاتی ہے۔ اس کے چہرے پر بھی بہار آگئی تھی۔ جِسے سمجھنے کے لئے جولیانہ کو کسی بھی الفاظ کی ضرورت نہیں تھی۔

یکدم کھڑکی پر کسی نے دستک دی تو دل آویز اور جولیانہ نے شیشے کی جانب دیکھا۔

دل آویز نے اپنی جانب کا شیشہ نیچے کیا۔ باہر ایک چھوٹا دس سے بارہ سال کا بچہ ہاتھوں میں دل آویز کے پسندیدہ پھولوں کا گلدستہ لئے کھڑا تھا۔

"ہیپی برتھ ڈے"

اُس نے مسکرا کر دل آویز سے کہا اور گلدستہ اُسے پکڑا کر چلتا بنا اُس نے حیرت سے جولی کو دیکھا اور مسکرا کر شیشہ اوپر چڑھا لیا۔

سگنل کُھلا تو گاڑی کشادہ سڑک پر فراٹے بھرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ایک دوسرے سگنل پر گاڑی رُکی تو کھڑکی کے شیشے پر کسی نے پھر نوک کیا۔

دل آویز نے ایک بار پھر تعجب سے شیشہ نیچے گرا لیا اس بار ایک ادھیڑ عمر خاتون نے مسکرا کر ڈیزی کا ایک پھول دل آویز کی جانب بڑھایا تھا۔

"ہیپی برتھ ڈے مسز میر"

اور بس لمحے لگیں تھے اُسے سمجھنے میں۔۔۔۔ گاڑی غیر متوقع طور پر شاپنگ مال کے سامنے جا کر رُکی تھی۔ دل آویز نے سوالیہ نظروں سے جولیانہ کو دیکھا۔ "باس کا آرڈر ہے کہ آپ کو اچھی سی ڈریس دلائی جائے" اس نے شانے اُچکاتے ہوئے کہا اور گاڑی سے باہر آگئی دل آویز نے بھی اس کی تقلید کی۔

"مگر جولی میرا پراجیکٹ؟"

ابھی جملہ اس کے منہ میں تھا کہ جولیانہ نے اُسے دونوں بازوؤں سے تھاما۔

"آپ کسی بھی چیز کی فکر مت کریں وہ الہان نے سنبھال لیا ہے۔ آپ بس شاپنگ پر فوکس کریں کیونکہ میر سر نے آپ کے لئے ایک خوبصورت سا سرپرائز ارینج کیا ہے"

اس نے آنکھ مارتے ہوئے کہا تو دل آویز کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

تقریباً ایک سے ڈیڑھ گھنٹا گزر چکا تھا اور دل آویز بہت سے کپڑیں ٹرائی کر چکی تھی اب تو جولیانہ کی ہمت بھی جواب دے چکی تھی۔

"دل آویز اب بس بھی۔۔۔۔"

جولیانہ کا جملہ اس کے منہ میں ہی اٹک گیا جب دل آویز چینجنگ روم کا دروازہ کھول کر باہر آئی۔ جولیانہ سمیت اسٹور میں موجود باقی سب بھی اُسے رشک بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

دل آویز نے ایک نیلے رنگ کا آف شولڈر فلورل ڈریس پہن رکھا تھا جو ٹخنوں سے کچھ اُوپر تھا۔ ساتھ میں نیلے رنگ کی ہائی ہیلز اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگا رہے تھے۔

اس نے سب کی نظروں کا رخ اپنی طرف دیکھا تو بے آرامی سے بالوں کو دائیں جانب کرتے ہوئے اُس نے مستفسرانہ نظروں سے جولیانہ کو دیکھا تھا۔

جولیانہ نے "فنٹاسٹک" کہتے ہوئے سر کو جنبش دی۔۔۔۔ اس طرح کا لباس اس نے پہلی بار پہنا تھا اور یہ کہنا غلط نہیں ہو گا کہ وہ اس فلورل ڈریس میں انتہائی حسین لگ رہی تھی۔

"اب ہم کہاں جا رہے ہیں جُولی"

گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے پہلا سوال کیا۔

"بتا نہیں سکتی آپ کو۔۔۔ اوپر سے آرڈر ہے" وہ ہنسی تو دل آویز بھی مسکرائی۔

دل آویز برمنگھم کے راستوں سے زیادہ مانوس نہیں تھی سو اُسے نہیں معلوم تھا کہ وہ لوگ اب کہاں جا رہے تھے کہ جولیانہ نے دل آویز کی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی۔

"یہ۔۔ کیا ہے"

اس نے مزاحمت کی کوشش کی مگر جُولیانہ نے اس کی ایک نہیں سُنی۔ پتا نہیں وہ اُسے کہاں لے جا رہی تھی۔ دل آویز نے جولیانہ کا بازوں کس کر پکڑا ہوا تھا کہ کہیں وہ گر ہی نا جائے۔

یکدم دل آویز کو ٹھنڈک کا احساس ہوا جیسے وہ لوگ کسی کھلے میدان میں ہو۔ جولیانہ نے اُسے سیڑھیاں چڑھنے میں مدد کی تھی پھر دل آویز کو اپنی پشت پر ایک بھاری بھرکم دروازہ بند ہوتا سنائی دیا وہ کوئی لکڑی کا دروازہ نہیں تھا۔

"جولیانہ پلیز یہ پٹی تو کھولو" وہ مکمل خاموشی کی وجہ سے گھبرا کر بولی اُسے آس پاس سناٹا محسوس ہوا۔

کسی نے نرمی سے اُسے پُشت سے پکڑا تھا۔ دل آویز وہ لمس سیکنڈز میں پہچان گئ تھی۔ اس کے چہرے پر ایک سکون بھری مسکان پھیل گئی۔

پھر سیاہ منظر میں روشنی سی اُبھری۔۔۔ دل آویز نے اپنی آنکھیں آہستہ سے کھولیں اور وہ لمحے بھر کے لئے گنگ رہ گئی۔ وہ کسی پرائیویٹ جیٹ میں تھی۔

میر آہل نے اُسے پیچھے سے اپنی بانہوں میں بھینچا اور اپنی ٹھوڑی اس کے کندھے پر ٹکاتے ہوئے سرگوشی کی

"کیسا لگا"

کیبن پورا سفید اور پیلے رنگ کے ڈیزی اور غباروں سے سجا ہوا تھا۔

دل آویز نے ششدر نگاہیں اپنے اطراف میں دوڑائیں۔۔۔ پھولوں کی خوشبو اور میر آہل کے وجود سے اٹھتی مہک اس کے انگ انگ کو سلگھا رہی تھی۔

اگر یہ خواب تھا تو دل آویز نے اس سے زیادہ حسین خواب کبھی دیکھا نہیں تھا۔ وہ حیرانگی سے اپنے ایڑیوں کے بل گھوم کر چاروں طرف دیکھنے لگی اور میر آہل اس کے چہرے پر ٹمٹماتے جگنوؤں کو اپنی آنکھوں میں اُتارنے لگا۔

دل آویز نے مڑ کر آہل کو دیکھا جو سینے پر ہاتھ باندھے اُسے ہی تک رہا تھا۔ اس کی آنکھ کا کنارہ نمی کی زد میں تھا جب میر آہل نے اُسے اپنے گلے سے لگایا تھا۔ وہ دل آویز کی دھڑکن اپنے کانوں میں سُن سکتا تھا۔

"تھینک یو سو مچ آہل"

دل آویز نے اُس کے گرد بازوں لپیٹتے ہوئے کہا اور اپنی آنکھیں موندلیں۔ اس کی آواز بھرا گئی۔

دل جذبات سے تر تھا۔ اُس کا دل اتنے زور سے دھڑک رہا تھا کہ جیسے سینا توڑ کر باہر آجائے گا۔

آہل نے پہلی بار دل آویز کا بازوں اپنے گرد حمائل ہوتا ہوا محسوس کیا تھا۔ ورنہ وہ ہمیشہ جھجک اور شرم کے فاصلوں میں سمٹ کر رہ جاتی تھی۔

"آج تک کسی نے میرے لئے یہ سب نہیں کیا"

وہ رو رہی تھی۔ جذبات نے گھیرا تنگ کر دیا تھا۔ اس کے لہجے میں سنائی دیتی محبت کی محرومی نے میر آہل کے دل میں ہلچل مچا دی تھی۔

اور اس لمحے اگر دل آویز۔۔۔ میر آہل کو اپنی جان بھی اُس کے قدموں میں بچھانے کے لئے کہتی تو وہ اس کی خوشی کی خاطر یہ بھی کر گزرتا۔۔۔

sometimes we just move heaven and earth to see smile one someone else's face .

اور یقین کرو یہ دنیا کا سب سے خوبصورت اور دلکش

احساس ہے۔

"دل آویز"

اس نے محض اس کا نام پکارا اور کچھ نہیں کہا۔ کبھی کبھی دنیا بھر کے تمام الفاظ سمٹ کر ایک احساس میں جمع ہو جاتے ہیں۔ دل آویز کو خوش دیکھنے کا احساس بھی وہی تھا جسے وہ کبھی بھی لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔

میر آہل لفظوں کا جال بُننا بھول چکا تھا۔ کچھ حفظ تھا تو دل آویز کی ہنسی، اُس کی خوشی، اُس کے آنسوں، اُس کے غم اور باقی ہر شہہ اُسے بھول گئی تھی۔

☆...☆...☆

تقریباً ایک گھنٹے بعد اُنکا پرائیویٹ جیٹ اسکاٹ لینڈ کی سرزمین پر لینڈ ہوا تھا۔ ائیرپورٹ پر ان کے انتظار میں پہلے ہی ایک رینٹل کار موجود تھی۔ جو اُنہیں اولاپول تک لے جانے والی تھی۔

اولاپول ایک گاؤں اور بندرگاہ ہے جو شمالی اسکاٹ لینڈ میں واقع ہے۔ لوچ بروم کے مشرقی ساحل پر، اولاپول کو 1788 میں برٹش فشریز سوسائٹی نے ہیرنگ پورٹ کے طور پر قائم کیا تھا۔ اسے تھامس ٹیلفورڈ نے

ڈیزائن کیا تھا اور 1788 سے پہلے یہ قصبہ صرف بیس گھرانوں پر مشتمل ایک معمولی سی بستی تھی۔ بندر گاہ کو ماہی گیری کی بندر گاہ، یاٹنگ کی پناہ گاہ اور فیری پورٹ کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

دل آویز کافی پر جوش دکھائی دے رہی تھی کیونکہ وہ بہت خوبصورت جگہ تھی۔ وہ مسلسل گاڑی کی نشست سے اُٹھ اُٹھ کر کھڑکی کے باہر جھانک رہی تھی۔

میر آہل کی آنکھیں اُسے بچوں کی طرح پر جوش ہوتے دیکھ کر چمکی۔ اس نے نرمی سے اس کا ہاتھ دبایا۔

کچھ دیر بعد ان کی گاڑی ایک سڑک پر رک گئی۔ جس کے اطراف میں دور دور تک برف نظر آ رہی تھی۔

شوفر گاڑی کے اندر سے ایک بٹن دباتا ہے اور اگلے ہی سیکنڈ ایک بلند قامت دروازہ کُھلتا ہے۔

دل آویز کا بر منگھم سے اب تک کا تمام سفر قابل قدر تھا جب اس نے کار کا شیشہ نیچے کر کے اس الیشان ڈبل اسٹوری گھر کو دیکھا.

وہ سیاہ اور بھورے رنگ کا دو منزلہ گھر کسی خوبصورت پینٹنگ کا حصہ لگتا تھا۔ میر آہل نے دل آویز کی جانب کا دروازہ کھولا اور وہ دونوں بڑے دروازے سے گزر کر اندر داخل ہوئے۔

یہ گھر باہر سے جتنا خوبصورت اور الیشان تھا اندر سے بھی اتنا ہی حسین اور خوبصورت تھا۔

لکڑی کا فرش آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔ پہلی منزل پر ماسٹر بیڈ روم کے ساتھ ساتھ جدید طرز پر مشتمل ایک اوپن کچن بھی موجود تھا۔

کچن کے ساتھ ہی ڈائننگ ایریا تھا جہاں سے ٹیرس گارڈن کا دروازہ کھلتا تھا۔ نیچے کے فلور میں بڑا سا سٹنگ روم بھی موجود تھا جہاں پچاس انچ کا ٹی وی فائر پلیس کے بلکل اوپر نصب تھا۔

اس گھر میں کھڑکیاں ہی کھڑکیاں تھیں۔۔۔ کھڑکی پر سفید سلک کے پردے لگے ہوئے تھے جو ہوا کے جھونکے سے لہرانے لگتے تھے۔

دل آویز اپنی ایڑیوں پر گھوم گئی اور کسی چھوٹے بچے کی طرح ایک کمرے سے دوسرے کمرے کی جانب بھاگنے لگی۔ ٹیرس گارڈن سے نظر دوڑاو تو دور دور تک برف ہی برف نظر آ رہی تھی۔

برف سے ڈھکی زمین جہاں ختم ہوتی وہاں سے سمندر شروع ہو رہا تھا۔ سامنے سفید برف کی تہہ میں لپٹے اونچے پہاڑ آسمان سے ٹکرا رہے تھے یہ سب کسی خواب جیسا تھا۔

وہ دونوں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اولا پول کی سیر کو نکل گئے۔ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے وہ دونوں نیولی ویڈ کپل کی طرح سڑکوں اور بازاروں میں گھوم رہے تھے۔

دل آویز نے جینز کے اوپر ٹاپ پہن رکھا تھا جو گھٹنوں سے کچھ اوپر تھا۔ اس کے اوپر اُس نے جیکٹ اور سر پر ٹوپی بھی پہن رکھی تھی۔ جس نے اس کے کان اچھے سے ڈھانپ لئے تھے۔ دسمبر کی ٹھنڈ نے اس کے اوسان خطا کر دیئے تھے۔

وہ دونوں چلتے چلتے سمندر کنارے آ گئے تھے جہاں ایک قطار میں لکڑی کے چھوٹے چھوٹے رنگ برنگی بیچ ہٹ بنے ہوئے تھے۔

جن کی چھت مخروطی تھی۔ میر آہل نے پاکٹ سے چھوٹا سا ریموٹ نکالا اور ایک بٹن دبایا اچانک چاند کی روشنی میں چمکنے والا ساحل خوبصورت فیری لائٹس کی زد میں آ گیا۔

وہاں ساحل کے کنارے ایک ٹیبل اور دو کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ دل آویز کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

اس نے فوراً مڑ کر آہل کو دیکھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جس نے یہ سارا انتظام اس کی سالگرہ کو مزید خاص بنانے کے لئے کیا تھا۔

"Ma'am please sit" میر آہل نے کرسی کو ہلکا سا پیچھے کرتے ہوئے مسکرا کر دل آویز سے کہا تو وہ ہنسنے لگی۔

"تھینک یو"

وہ سر کو خم دیتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئی تو میر آہل بھی اپنی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں اس حد تک کھو چکے تھے کہ انہیں احساس ہی نہیں ہوا کہ ویٹر دل آویز کا برتھ ڈے کیک لے آیا ہے۔ سب کچھ کسی خواب کی مانند لگ رہا تھا۔

دل آویز نے جھک کر موم بتی بُجھانی چاہی تو آہل نے اُسے روک دیا۔

"کینڈل بجھانے سے پہلے کوئی وش مانگو"

وہ مسکرایا دل آویز بھی مسکرائی

"اوکے"

اُس نے فوراً سے آنکھیں بند کر لیں اور جب دو منٹ بعد دل آویز نے آنکھیں کھولیں تو اُس کی پتلیاں حیرت سے جم گئیں۔ اس نے دیکھا آسمان پر رنگ ہی رنگ بکھر گئے ہیں۔ جیسے کسی نے گلیٹر پانی میں گھول کر آسمان پر چھڑک دیا ہے۔

"آہل"

اس نے حیرت سے آسمان کو دیکھتے ہوئے اُسے پکارا۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا ہے"

اُس کی ششدر نگاہیں اب بھی آسمان پر چپکی ہوئی تھیں۔

"Northern lights–نار درن لائٹس"

میر آہل نے آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"اِنہیں اروہ بوریلیس بھی کہا جاتا ہے۔ سردیوں کی خاموش راتوں میں جب آسمان ایک دم سیاہ ہو جاتا ہے۔ تب یہ سبز، جامنی اور سرخ روشنیوں کی لہریں آسمان پر رقص کرتی ہیں"

اس نے رنگ بدلتے آسمان کی روشنی میں دل آویز کے نورانی چہرے کو اپنے ہاتھوں میں بھرتے ہوئے کہا۔

"میں دسمبر کی اس سیاہ اور خاموش رات میں اس رنگ بدلتے آسمان کے نیچے، چاند کو گواہ بنا کر زندگی کی آخری سانس تک تمہارا ساتھ نبھانے کی قسم کھانا چاہتا ہوں"

میر آہل کی آنکھیں دل آویز کی آنکھوں کا طواف کرنے لگیں۔

"میں تمہارے ساتھ پوری دنیا گھومنا چاہتا ہوں۔ خدا کی بنائی ہوئی ہر قدرت میں تمہاری آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں"

میر آہل نے اس کے دونوں ہاتھوں کو باری باری بوسہ دیتے ہوئے اپنے سینے سے لگایا۔

دل آویز کچھ نہیں بولی بس اُسے سُنتی گئی۔ اِن وعدوں میں صدق تھا، حقیقت تھی، محبت تھی۔ میر آہل کی پاک اور سچی محبت۔

آہل کی باتوں نے دل آویز کے دل میں اطمینان کی شمع روشن کر دی تھی۔

وہ دونوں نا جانے کتنی دیر ایک دوسرے کی بانہیں تھامے اِن خوبصورت رنگوں کا رقص دیکھتے رہے تھے۔ یہ سب کسی خواب سے کم نہیں تھا۔

زندگی کے اتنے سال تکلیف اور تنہائی میں کاٹنے کے بعد کس نے سوچا تھا کہ ایک روز وہ اپنی جاگتی آنکھوں سے اپنے سارے خوابوں کو سچ ہوتا دیکھے گی۔ اپنے زخموں کو اس طرح سے بھرتا ہوا دیکھے گی۔

اگر یہی اس کے دکھوں کا مداوا تھا تو اس کے لئے کافی تھا۔

☆...☆...☆

"بابا دل کسی اپنے سے بات کرنے کو چاہے تو دل کی خواہش رد نہیں کرنی چاہئے۔۔۔ ہر بار دل مار کر انسان سکون سے نہیں رہ پاتا"

ریما نے میر خلیل کو صحن میں رکھے لینڈ لائن کے گرد مسلسل چکر کاٹتے ہوئے دیکھا تو بولے بنا نہیں رہ سکی آج کافی دنوں بعد وہ اپنے کمرے سے نکلی تھی۔

میر خلیل نے تکان زدہ نظروں سے ریما کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھا وہاں کوئی تاثر نہیں تھا سوائے ویرانی کے۔

"میں ایک اچھا باپ نہیں بن سکا بیٹا مجھے معاف کر دو" نا جانے کیوں ان کے منہ سے یہ بات نکلی تھی۔

"کوئی بات نہیں بابا انسان اپنی زندگی میں بہت سے کردار نبھاتا ہے۔ ضروری تو نہیں وہ تمام کردار اچھے سے نبھائے" وہ تامل سے بولی

"افسوس ہی یہی ہے کہ میں نے کوئی بھی کردار اچھے سے نہیں نبھایا۔۔۔نا اچھا بیٹا بن سکا، نہ شوہر اور نہ باپ "

وہ دونوں صحن میں آمنے سامنے کھڑے تھے۔

"کوئی ایک رشتا بھی میں ڈھنگ سے نبھا پاتا تو شاید پچھتاوں کا بوجھ ہلکا ہو جاتا" انہوں نے نظریں جھکا دی۔

"اب پچھتانے سے کیا ہو گا۔۔۔جو بھی وقت باقی ہے اپنی غلطیوں کا ازالہ کرنے میں سرف کریں تا کہ مرتے وقت دل پر کوئی بوجھ نہ رہے" وہ براہِ راست میر خلیل کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

"میری بیٹی اتنی سمجھدار کب سے ہو گئی ہے؟" انہیں ریما کی باتوں پر حیرت ہو رہی تھی۔

"جب سے میں نے کسی اپنے کی جان اپنی آنکھوں کے سامنے بے رحمی سے نکلتے دیکھی ہے تب سے"

اور یہی وہ لمحہ تھا جس نے میر خلیل کو سر سے پاؤں تک ہلا کر رکھ دیا تھا۔

اس ایک لمحے نے ان کے تمام شکوک وشبہات کو حقیقت میں تبدیل کر دیا تھا۔انہوں نے خالی نگاہوں سے ریما کو سر سے پاؤں تک یوں ٹٹولا کے پھر شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

"ایک بات پوچھوں بیٹا؟" ایک عجیب سے احساس نے انہیں اپنے شکنجے میں لیا۔

"آپ کا جو سوال ہے اس کا بس ایک ہی جواب ہو گا میرے پاس بابا" وہ میر خلیل کو نہیں دیکھ رہی تھی پر میر خلیل کی نظریں اس پر مقناطیس کی طرح چپک گئی تھیں۔

"اور وہ جواب۔۔۔ہاں۔۔۔ہے" اس نے اپنے شانوں سے پھسلتے دوپٹے کو درست کرتے ہوئے کہا۔اور میر خلیل نے لڑکھڑا کر پاس رکھے صوفے کا سہارا لیا۔

آسمان پر بجلی بہت زور سے چمکی تھی اور میر خلیل کا وجود اس کڑک کی زد میں آ چُکا تھا۔

انسان کے اعمال ربڑ کی بال کی طرح ہوتے ہیں جس رفتار سے پھینکو گے اس کی دوگنی رفتار سے پلٹ کر تم تک واپس آئے گی۔

☆...☆...☆

"الہان کوئی مر گیا ہے کیا"

زندگی میں پہلی بار ہوا تھا کہ پچھلے ایک گھنٹے میں الہان نے اپنے مبارک منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا۔

اور جولیانہ اس کی مسلسل خاموشی سے اکتا چکی تھی۔ الہان نے بیزاری سے کتاب اپنے چہرے کے سامنے سے ہٹا کر اُسے گھورا۔

"میں بور ہو رہی ہوں" وہ مزید چڑ کر بولی

"ہاں تو کیا میں اب پول ڈانس کروں تمہیں انٹرٹین کرنے کے لئے" وہ سڑا ہوا منہ بنا کر بولا

"شرم آتی ہے؟"

الہان کی بیزاری اُسے مزید چڑا رہی تھی۔

"نہیں" جواب دوٹوک تھا۔

"زہر کھالو پھر"

اُس نے الہان کو تپانے کی کوشش کی

"ٹھیک ہے پہلے تم کھالو اگر بچ جائے تو میرے لئے رکھ دینا"

وہ نظریں دوبارہ کتاب پر مرکوز کرتے ہوئے بولا

"میں جا رہی ہوں" وہ صوفے سے اٹھتے ہوئے بولی

"دروازہ ٹھیک سے بند کرتی جانا" وہ مسکرا کر ہنوز کتاب پڑھتا رہا جب اُسے اپنی پشت پر دروازہ زور سے مارنے کی آواز آئی۔

"چلو بلا ٹلی" اس نے جان بوجھ کر زور سے کہا اُسے معلوم تھا وہ دروازے کے باہر ہی کھڑی ہو گی۔

دو منٹ بعد دروازہ پھر سے کھلنے کی آواز آئی تو الہان اپنے اندازے کی درستگی پر مسکرایا۔

"کیا ہوا میڈم آپ تو جانے والی تھیں نہ"

اس نے کتاب بند کر کے سینٹر ٹیبل پر رکھ دی۔

"ہاں پھر ارادہ ترک کر دیا"

وہ جولیانہ کی آواز نہیں تھی۔

الہان نے فوراً گردن موڑ کر پیچھے دیکھا وہاں اینا اور نگزیب دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کھڑی تھی۔

"تم یہاں کیوں آئی ہو"

اینا کو دیکھ کر الہان کے چہرے کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔

"آہل کہاں ہے الہان" اس نے بنا وقت ضائع کئے پوچھا۔

"جہاں اُسے ہونا چاہئے اینا" اس نے شانے اچکائے

"میں تمہاری بہن ہوں الہان بھولو مت" اس نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا

"تم مجھے بھولنے کہاں دیتی ہو اینا کہ تم میری بہن ہو" اس نے ناگواری سے کہا

"تم کس کے دم پر اتنا اُچھل رہے ہو الہان بھولو مت تمہیں دل آویز کے قریب میں نے کیا ہے" اینا نے ٹیبل پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے غصے سے کہا۔

"سیکنڈز لگیں گے مجھے "رک کر چٹکی بجائی" اور دل آویز کے سامنے الہان اور نگزیب کی ساری حقیقت کھل کر آجائے گی پھر جو یہ دوستی کا ڈھول بجاتے پھرتے ہو نہ تم یہی ڈھول میر آہل تمہارے سر پر دے مارے گا" وہ حقارت سے مسکرائی

"گیٹ آوٹ اینا" الہان نے غصے سے جبڑے بھینچ لئے

"اس سے پہلے کہ میں بھول جاؤں کہ تم میری بہن ہو بہتر ہے یہاں سے نکل جاو" اس نے دروازے کی جانب اشارہ کیا۔

اینا نے ایک آخری نگاہ غصے سے الہان پر ڈالی اور دروازے کی جانب پلٹ گئی اس نے ہینڈل پر ہاتھ رکھا ہی تھا جب کسی کہ قدموں کی چاپ بہت نزدیک سے ان دونوں کو سنائی دی۔

الہان اور اینا نے قدموں کی آہٹ کا تعاقب کرتے ہوئے بروقت ڈرائنگ روم کی جانب دیکھا۔

جولیانہ دروازے کی اوٹ سے باہر آئی۔ وہ ششدر کھڑی شکوہ کن نگاہوں سے الہان کو دیکھ رہی تھی۔

ڈرائنگ روم کی لائٹ آف تھی اس لئے الہان اُسے دیکھ نہیں سکا تھا۔

"واؤ" اینا نے ایک نظر جولیانہ پر ڈالی اور پھر مڑ کر الہان کو دیکھ کر طنزیہ انداز میں آنکھیں گھومائی۔

"ہیو فن الہان" وہ دروازہ زور سے مارتے ہوئے اپارٹمنٹ سے نکل گئی۔

"جولی آئی کین ایکسپلین" الہان نے وضاحت کرنا چاہی مگر جولیانہ نے ہاتھ جھلا کر اُسے خاموش کروا دیا۔

"تو یہ ہے تمہاری حقیقت الہان ڈی سوزا اوہ سوری "رک کر تصیح کی

"الہان اورنگزیب" اس کی آنکھوں میں پانی بھر گیا۔ اس کا دل ٹوٹا تھا اور خون دل سے رس رہا تھا۔

"تم یہاں دل آویز کو نقصان پہنچانے آئے تھے" وہ دو قدم آگے آئی۔

"جولی میری بات"

"بکواس بند کرو اپنی" جولیانہ نے چیخ کر کہا

"اگر تم نے دل آویز اور میر سر کے درمیان کسی بھی قسم کی غلط فہمی یہ دوریاں ڈالنے کی کوشش کی تو یاد رکھنا "جولیانہ نے اس کی جانب انگشت شہادت اٹھاتے ہوئے کہا

"میں تمہاری حقیقت دل آویز کو بتا دوں گی سمجھے" آنسوں اُبل اُبل کر لڑی کی مانند اس کے چہرے پر بہنے لگے۔

"آدھا سچ پورے جھوٹ سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے جولی" اس نے نم آنکھوں سے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جولیانہ" اس نے ایک بار پھر تصیح کی۔

"دل آویز سے دور رہو الہان اورنگزیب" اس نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔

الہان کو لگا اس کا دل کِرچی کِرچی ہو گیا ہے۔ ایک ہی پل میں سب کچھ ہاتھوں سے چھوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اُسے لگا وہ اب کبھی دوبارہ سانس نہیں لے پائے گا اور واقعی اس سے سانس نہیں لیا گیا۔

جولیانہ وہاں سے چلی گئی اور الہان پیچھے تنہا رہ گیا۔ اس تنہا اپارٹمنٹ میں یکدم ہی اُس کا دم گُھٹنے لگا۔ وہ بھاری قدموں کے ساتھ مشکل سے بالکونی تک گیا۔ ریلنگ پر دونوں ہاتھ جمائے۔۔۔ وہ تھوڑا سا آگے کو جُھکا نا جانے کب گرم مادہ اس کی آنکھ سے ابھر کر اس کے گال پر آ کے ٹھہر گیا۔

الہان رو رہا تھا۔۔۔اس نے حیرت سے انگلیوں کے پوروں سے چہرے پر ٹھہرے آنسوں کو چھوا۔ سورج کی الوادع کہتی کرن میں اُس کے پوروں پر ٹھہرا آنسوں کا قطرہ چمکا تھا۔

دل بہت زور سے دُکھ رہا تھا اور وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ دل دُکھانے والی کوئی اور نہیں خود اس کی سگی بہن تھی۔

☆...☆...☆

دل آویز آج بہت خوش تھی کل رات ہی وہ دونوں برمنگھم واپس آئے تھے۔ اور وہ بے صبری سے یونیورسٹی جانے کا انتظار کر رہی تھی۔ جانے سے پہلے الہان نے اس سے کہا تھا کہ اس کے پاس دل آویز کی برتھ ڈے کے لئے بہت بڑا سرپرائز ہے جسے دیکھ کر وہ خوشی سے پاگل ہو جائے گی۔

وقت دل آویز پر مہربان ہو گیا تھا۔ وہ جلدی جلدی یونیورسٹی کے لئے تیار ہوئی۔ آج خلاف توقع جولیانہ اُسے یونیورسٹی ڈراپ کرنے کے لئے نہیں آئی۔ اس نے حیرت سے وال کلاک پر نظر ڈالی اور پھر موبائل پر اس کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ آگے سے اس کا فون بند جا رہا تھا۔ دل آویز کے ماتھے پر پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے۔ پھر کسی احساس کے تحت اس نے کندھے اُچکائے۔

"شاید وہ بھی الہان کے ساتھ مل کر میرا سرپرائز ریڈی کر رہی ہو گی"

اس خیال نے اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ وہ جلدی سے یونیورسٹی کے لئے نکلی۔ میر آہل اس سے پہلے ہی آفس جا چکا تھا۔

اس کی غیر موجودگی میں بہت سا کام جمع ہو چکا تھا۔ جِسے فوراً نپٹانا لازمی تھا۔

☆...☆...☆

کیفے ٹیریا، لائبریری اور باسکٹ بال کورٹ۔۔۔ دل آویز نے پوری یونیورسٹی چھان لی مگر الہان کا کوئی نام و نشان تک نہیں تھا۔

"یہ کہاں غائب ہو گیا ہے"

یہ پانچویں کال تھی جِسے الہان نے اٹینڈ نہیں کی تھی۔

"یہ دونوں کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ نا کوئی ویلکم نہ کوئی سرپرائز پارٹی اونہوں۔۔۔ آنے دو دونوں کو پھر خبر لیتی ہوں" وہ تھک کر اوپن گارڈن میں لگی بینچ پر بیٹھ گئی اور سر ہاتھوں پر گرا لیا۔

اچانک اس کا فون وائبریٹ ہوا تاریک اسکرین پر ایک پیغام اُبھرا۔۔۔ دل آویز نے فوراً سے میسج نوٹیفکیشن پر کلک کیا۔

"میں تمہارا ایسٹن کی مرکزی عمارت کے سامنے انتظار کر رہا ہوں دل آویز وہیں جہاں ہم پہلی بار ٹکرائے تھے"

پیغام پڑھ کر ایک مسرت بخش مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رینگ گئی۔ اس نے فوراً سے قدم ایسٹن کی مرکزی بلڈنگ کی جانب بڑھا دیئے۔

جہاں الہان دونوں ہاتھ سینے پر باندھے ایسٹن کی مرکزی عمارت کو سر اٹھائے خاموشی سے کھڑا گھور رہا تھا۔ اس کی پشت دل آویز کی جانب تھی۔

پیچھے سے وہ الہان کے چہرے پر آئے تاثرات نہیں دیکھ سکتی تھی۔ جہاں ویرانی ہی ویرانی تھی۔ چلتے چلتے غیر دانستہ طور پر دل آویز کی رفتار ہلکی ہو گئی۔

یوں جیسے اس کے دل نے کچھ بھانپ لیا ہو کچھ عجیب بہت عجیب۔۔۔ دل آویز کے پکارنے سے پہلے ہی الہان پلٹ گیا۔ اس کا چہرا ستا ہوا اور آنکھیں سوجی ہوئی لگ رہی تھیں۔

دل آویز کے چہرے کی مسکراہٹ کچھ سمٹی۔۔۔ الہان بمشکل مسکرایا۔

"جانے سے پہلے میں نے تم سے کہا تھا کہ جب تم آوں گی تو ایک سرپرائز تمہارا منتظر ہو گا"

اس کا لہجہ بدلا ہوا سا تھا۔ دل آویز خوش ہونے کے بجائے اُسے چپ چاپ سنتی رہی۔

"یہ ہے تمہارا سرپرائز"

الہان نے دایاں بازو آگے کیا اس کے ہاتھ میں (دی انگلینڈ) میگزین تھا۔

"یہ کیا ہے؟"

دل آویز نے مستفسرانہ نظروں سے میگزین اور پھر الہان کو دیکھا۔

"خود دیکھ لو"

اس نے میگزین دل آویز کو پکڑایا۔ دل آویز نے نا سمجھی سے وہ میگزین پکڑ لیا اور صفحات الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی پھر یکدم ایک صفحے پر اس کی نظریں جم گئیں۔ اس کی گرفت صفحے پر مضبوط ہوئی۔

"دی انگلینڈ میگزین کے ایڈیٹر کا بیٹا میرا چائلڈ ہوڈ فرینڈ تھا تو میں نے اُسے تمہارے لکھے سارے کالمز اور آرٹیکلز بھیجے تھے۔ اور اُس نے اپنے فادر کو"

وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لئے رُکا

"دل آویز اُنہیں تمہارے کالمز اور آرٹیکلز بہت پسند آئے"

وہ رسان سے بولا

دل آویز گنگ کھڑی الہان کو ٹٹولتی نظروں سے دیکھتی رہی۔ اتنی بڑی خبر بھی اس کے چہرے پر وہ خوشی نہیں لا پائی جو اس وقت اس کے چہرے پر ہونی چاہئے تھی۔

"کیا ہوا دل آویز تم خوش نہیں ہوئی۔ تم ایک بہترین رائٹر بننا چاہتی تھی نہ دیکھو اب پورا انگلینڈ تمہیں تمہارے نام سے پہچانے گا"

وہ مصنوعی پرجوشی دکھاتے ہوئے بولا در حقیقت اس کا دل اندر سے چھلنی چھلنی ہو چکا تھا۔

دل آویز آہستگی سے مسکرائی آنکھوں میں آنسوں بھر گئے۔ بس آنکھ جھپکنے کی دیر تھی اور آنسوؤں کا ریلا اس کے پورے چہرے کو بھگو دیتا۔

"تم نے میرے لئے اتنا سب کیوں کیا الہان" یہ سوال الہان کی توقع کے برعکس تھا۔

"کیونکہ میں چاہتا ہوں دل آویز تم اپنے سارے خواب پورے کرو" وہ نم آنکھوں سے مسکرایا۔

اس کی آنکھوں کی نمی نے دل آویز کا دل مسل کر رکھ دیا تھا۔

ایک عجیب سی خاموشی نے دونوں کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

"دل آویز"

الہان نے تمہید باندھی اب جو وہ کہنے والا تھا اس کے لئے وہ خود بھی تیار نہیں تھا۔

"بولو"

دل آویز سے الہان کی خاموشی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ تو ہمیشہ ہنستا بولتا اُسے پریشان کرتا رہتا تھا مگر آج وہ بول تو رہا تھا مگر پھر بھی دل آویز بے چین تھی۔

"دل آویز میں جا رہا ہوں"

اس نے اپنی آواز کو نارمل رکھتے ہوئے سرسری سے انداز میں کہا۔ دل آویز کی گرفت میگزین پر کمزور پڑی۔

"کہاں"

وہ بمشکل بولی

"میں لندن واپس جا رہا ہوں" وہ بہت مشکل سے مسکرایا۔

"اور وا۔۔۔واپس کب آؤ گے" دل آویز کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسوں بھر گئے۔

الہان کی سانسیں تھم گئیں اس نے نظر دل آویز کے چہرے سے ہٹا دی۔

"م۔۔۔میں۔۔میں واپس نہیں آؤں گا دل آویز"

اور دل آویز کے ہاتھ سے میگزین چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔ آنسوں پلکوں سے ٹوٹ کر چہرے پر بکھر گئے۔

"دیکھو الہان میں بہت خوش ہوں تم میرے ساتھ ایسا بکو اس مزاک کر کے میرا موڈ خراب مت کرو" دل آویز نے اُسے متنبہ کیا۔

"چلو اب لیکچر شروع ہونے والا ہے اور ابھی ہمیں اپنے دوسرے پراجیکٹ پر بھی جلدی سے کام شروع کرنا ہے" اس نے اپنے ذہن میں آئے تمام خدشوں کو نظر انداز کر کے اپنے آنسوں پونچھتے ہوئے کہا۔

اس کے رد عمل نے الہان کا دل کچل کر رکھ دیا تھا۔

"دل آویز"

اس بار الہان نے اس کے دونوں ہاتھوں کو آہستگی سے اپنے ہاتھوں میں لیا۔

دل آویز نے مزاحمت نہیں کی۔ اس کے لمس میں دوستی اور فکر کا احساس تھا، اپنائیت تھی۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم خوش رہو اور اپنے سارے خواب پورے کرو"

وہ ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگا۔اس کی آواز بھیگ چکی تھی۔

دل آویز نے نظر اٹھا کر اس کے چہرے کی طرف نہیں دیکھا۔وہ بس ان ہاتھوں کو دیکھتی رہی جو اس وقت الہان نے اپنی نرم گرفت میں لے رکھے تھے۔

"میں اب واپس نہیں آؤں گا دل آویز"

اس نے دل آویز کا ہاتھ آہستگی سے دبایا۔دل آویز کے منہ سے ہچکی نکلی۔۔۔آنسوں تھے جو ٹھہرنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

"میں۔۔۔میں تمہارے بغیر اکیلی ہو جاؤں گی الہان یہاں تمہارے سوا میرا۔۔۔کو۔۔۔کوئی۔۔دو۔۔ دوست نہیں ہے" ہچکیوں کی وجہ سے دل آویز سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

"او۔۔۔اور۔۔وہ پروفیسر پیٹر سے مجھے کون بچائے گا" وہ بچوں کی طرح رو رہی تھی۔ضد کر رہی تھی۔

"تم۔۔اس چیپ انسان کی فکر مت کرو میں نے اس کا مکمل بندوبست کر دیا ہے" وہ بمشکل بولا

"اچھا وہ چیپ ہے اور تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے" دل آویز نے ہمت جمع کر کے اپنی نظریں الہان کے چہرے تک لائی۔

"For your kind information I'm not cheap, I'm expensive, that everyone cannot afford "

الہان نے ڈرامائی انداز میں نم آنکھوں کو گول گول گھماتے ہوئے کہا اور دونوں کی بروقت ہنسی چھوٹی۔

ہنسی اور آنسوؤں کے درمیان دونوں نے ایک دوسرے کو بھیگی آنکھوں سے مسکرا کر دیکھا تھا۔

اور کسے معلوم تھا یہ اِن دونوں کی آخری مُلاقات تھی۔۔۔قہقہوں کا دور تھمنے والا۔۔۔

"مت جاو الہان پلیز"

جذبات نے ایک بار پھر گھیرا تنگ کیا۔

"آئی ہیو ٹو گو دل آویز اپنا خیال رکھنا"

اس نے نظریں پھیرتے ہوئے دل آویز کا ہاتھ چھوڑنا چاہا مگر دل آویز نے اُنہیں تھامے رکھا۔

"تم کیوں جا رہے ہو یار"

"میں جانے کے لئے ہی آیا تھا دل آویز اور ویسے بھی یہ پڑھائی وغیرہ مجھ سے نہیں ہوتی"

وہ ایک بار پھر ہچکیوں سے رونے لگی تھی اور اب الہان کے لئے مشکل ہو گیا تھا اپنے آنسوؤں کو روک پانا اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ دل آویز کے ہاتھوں سے کھینچا اور بیرونی دروازے کی سمت چلنے لگا۔

دل آویز نے اُسے پیچھے سے پکارا مگر الہان نے مڑ کر نہیں دیکھا وہ اُسے اپنے آنسوں نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ اگر وہ مزید ایک پل اور رکتا تو اس کے لئے اپنے دل کو سمجھانا مشکل ہو جاتا۔

انسان کبھی بھی مشکل راستے کا انتخاب نہیں کرنا چاہتا مگر زندگی ہمیں کوئی دوسرا آپشن نہیں دیتی۔

دل آویز اُسے بھیگی پلکوں سے دور بہت دور جاتا دیکھتی رہی۔ وہ کیا چھپا رہا تھا دل آویز سے۔۔۔ اپنے آنسوں ۔۔۔ مگر وہ تو اس کی سب سے اچھی دوست تھی نہ یا پھر یہ اس کا گمان ہی تھا کہ وہ الہان کی سب سے اچھی دوست تھی۔

☆...☆...☆

دل آویز ٹیرس میں کھڑی تھی۔ بال ڈھیلے سے جوڑے میں بندھے تھے۔ دونوں شانوں پر شال لاپرواہی سے جُھول رہی تھی۔ وہ بازوں اپنے گرد لپیٹے خالی نظروں سے چاند کو گھور رہی تھی۔

ہوا میں خنکی تھی جو وجود کو ناگواری کا احساس بخش رہی تھی۔ مگر پھر بھی وہ وہاں کھڑی رہی۔

کسی نے کہا تھا محبت سے بڑا اور کوئی روگ نہیں ہوتا مگر جب دوستی اپنا ہاتھ چھڑاتی ہے تو دل پر زیادہ زخم چھوڑ جاتی ہے۔

(یہ سامنے تارے دیکھ رہی ہو یہ اگر اصلی بھی ہوتے تو میں تمہارے لئے نہیں توڑتا)

اس کی شرارت بھری آواز دل آویز کی سماعتوں میں اُبھری تھی۔۔۔۔ وہ بے ساختہ مسکرائی

(اے بلی۔۔۔ شو۔۔۔ شُو۔۔۔ اوئے سڑی ہوئی عورت)

ایک اور گونج اس کے اطراف سے سنائی دی مگر نظر گھما کر دیکھو تو دور دور تک ویرانی تھی۔

دل آویز نے دونوں ہاتھوں سے ریلنگ کو بھینچا۔۔۔ یادیں تھی یا کوئی جان لیوا وبا۔

جس نے دل آویز کو چاروں جانب سے گھیر لیا تھا۔

"وہ کیوں چلا گیا" یہ سوال تھا جو ہتھوڑے کی طرح اس کے دماغ پر ضربیں لگا رہا تھا۔

چلتے پھرتے زندگی میں کتنے لوگ آپ سے ٹکراتے ہیں۔ سب کا ٹکرانا کسی وجہ کے تحت ہوتا ہے اور یوں ہی وہ بہار بن کر آپ کی زندگی پر چھا جاتے ہیں اور آپ کے دل پر گہرے نشان چھوڑ جاتے ہیں۔

کچھ تھا جو دل آویز کو سکون سے رہنے نہیں دے رہا تھا۔ الہان کسی تکلیف سے دوچار تھا کوئی ایسی تکلیف جو وہ دل آویز کو نہیں بتا سکتا تھا۔ اس لئے اس نے خاموشی سے اچھے نوٹ پر سب کی زندگیوں سے نکل جانے کو ترجیح دی۔

وہ کیا بات تھی جو وہ اپنے دل میں ہی دبائے رہ گیا۔ اُسے اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ وہ اس کا درد بانٹ سکے۔ اُسے سن سکے اُسے دلاسہ دے سکے۔

یہ بات۔۔۔ یہ احساس اس کے سینے کو ہر سانس کے ساتھ چھلنی کر رہا تھا کہ اُسے اپنی پشت پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ کسی کا لمس اس کے شانوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔

اس نے تھک کر گہری سانس لیتے ہوئے اپنا سر پیچھے میر آہل کے کندھے پر گرا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

جب سے وہ آفس سے آیا تھا۔

میر آہل کو وہ کافی خاموش اور گم سم سی دکھائی دے رہی تھی۔ کھانے کی ٹیبل پر بھی وہ اس کی بات کا جواب محض۔۔۔ ہمم۔۔۔ ہاں میں دے رہی تھی۔

وہ خاموشی سے اُس کی خاموشی کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔

جب دل آویز نے پلٹ کر اپنا چہرہ اُس کے سینے میں چُھپا لیا۔ میر آہل نے اپنے بازوں اس کے گرد حمائل کرتے ہوئے اپنی ٹھوڑی اس کے سر پر ٹکا دی۔

آپ دشت زندگی کے اس کٹھن سفر کو تنہا طے نہیں کر سکتے۔۔۔۔

یہ بات دل آویز نے آج سیکھ لی تھی۔

موسم کافی سرد ہو چُکا تھا اور دل آویز کی پلکیں بھی بھاری ہونے لگی تھیں۔

"ٹھنڈ کافی بڑھ گئی ہے"

میر آہل نے ہلکی سی سرگوشی کی۔ اس نے اُسے اپنے مضبوط بازوؤں میں سنبھال لیا تھا۔

"پلیز مجھے کبھی مت چھوڑیئے گا" وہ بڑبڑائی

میر آہل مشکل سے مسکرایا۔ دل آویز کی اداسی اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ آہل نے اسے حصار میں لیا اور کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

پیچھے چاند تنہا ہلکی دھند میں لپٹا اُن دونوں کی پُشت کو گھورتا رہ گیا۔

یہ چاند اُن سب کی حالتوں کا محرم تھا۔ جس پر جولیانہ کی بھیگی آنکھیں ٹِکی ہوئی تھیں۔

اس بات سے انجان کے کہیں دور الہان بھی اس وقت اِس چاند کو بالکونی میں بیٹھا نم آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ وہی چاند جس پر اس لمحے اپنا اورنگزیب کی نظروں کا پہرا تھا۔ یہ چاند جس نے سب کے آنسوؤں کو پیا تھا۔

☆...☆...☆

الہان کو گئے اب ایک مہینہ بیت چُکا تھا۔ اس دوران نہ دل آویز نے جولیانہ سے کچھ پوچھا تھا اور نہ جولیانہ نے دل آویز سے الہان کے حوالے سے کوئی بات کی تھی۔

اب جب وہ خاموشی سے ان کی زندگیوں سے چلا گیا تھا تو اس کا ذکر کرنے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔

پچھلے آٹھ ماہ میں کتنا کچھ بدل گیا تھا۔

کوئی کسی کے بغیر نہیں مرتا، چاند اور سورج کا مقام نہیں بدلتا، دن اور رات ایک نہیں ہوتے سب اپنے اپنے مقرر کردہ اوقات اور جگہ پر برقرار رہتے ہیں بس دل اُداس ہو جاتا ہے۔

کچھ بھی پہلے جیسا نہیں تھا۔ نا دل آویز پہلے جیسی رہی تھی نہ میر آہل پہلے جیسا رہا تھا۔

دل بدلتے ہیں تو انسان بھی بدل جاتے ہیں۔ آس پاس موجود ہر شہ بدل جاتی ہے۔

دی انگلینڈ میگزین کے بعد۔۔۔ دی وِیک، ٹائم آؤٹ اور ہیلو۔۔۔۔ جیسی بڑی بڑی میگزینز نے دل آویز کو ان کے لئے آرٹیکلز لکھنے کی آفرز کی تھیں۔ یہ سب کسی خواب جیسا تھا۔ یونیورسٹی میں لوگ اب اُسے پہچاننے لگے تھے۔ یہ سب الہان کی وجہ سے ہوا تھا۔

اچھے دوست کی پہچان یہی ہوتی ہے وہ بن مانگے ہی آپ کو بہت کچھ دے جاتا ہے اور بدلے میں اس احسان کا بدلہ تک نہیں مانگتا۔

الہان بھی جاتے جاتے دل آویز کو بہت کچھ دے گیا تھا۔ اس کے خوابوں کی تعبیر، ڈھیر ساری یادیں اور آنکھوں کی نمی۔ وہ جب بھی اُسے یاد کرتی تو نم آنکھوں سے مسکرا دیتی۔

ایسٹن کی ہر دیوار پر اُس کا لمس تھا۔ کینٹین سے لیکر کلاس رومز تک الہان کے قہقہوں کی بازگشت تھی۔ اُسے بُھلانا آسان نہیں تھا بلکہ ناممکن تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ابھی وہ کہیں سے جِن کی طرح نکل کر سامنے آجائے گا اور عجیب عجیب ناموں سے دل آویز کو بلا کر چڑائے گا۔

پر درحقیقت دل آویز کبھی بھی اس کے دیئے گئے کسی بھی نام سے چڑتی نہیں تھی بس اُس کی انا کی تسکین کے لئے چڑنے کی اداکاری کرتی تھی۔ کوئی بھی کبھی بھی الہان کی شرارتوں سے چڑ نہیں سکتا تھا۔ وہ تھا ہی ایسا جہاں بھی ہوتا قہقہہ اپنے آپ لگنے لگتے۔

☆...☆...☆

زلیخا بے حس و حرکت اپنے بستر پر زندہ لاش کی طرح پڑی ہوئی تھیں۔ کوئی نسخہ کوئی دوا اُن کے لئے کار آمد ثابت نہیں ہو رہا تھا۔

اِن تین مہینوں میں ان کی حالت میں بلکل بھی بہتری نہیں آئی تھی۔ یہ ان کے اعمال تھے۔ جو اس طرح سے ان کے سامنے آئے تھے۔

وہ کھلی آنکھوں سے چِت لیٹی بس چھت کو گھور رہی تھی۔ جب ریما سوپ کا ٹرے لئے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے سیاہ رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ بالوں کو چُٹیا کی شکل میں گوندھ رکھا تھا۔

اس نے اپنی پشت پر دروازہ مقفل کیا اور ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر زلیخا کے پاس بیٹھ گئی۔

زلیخا نے آنکھ گھما کر پاس بیٹھی ریما کو بے بسی سے دیکھا۔

"افسوس اس حویلی میں حکم چلاتی زلیخا میر اب بے بسی اور لاچاری سے اس بستر پر پڑی ہے" الفاظ تھے یہ چابک۔۔۔ سیدھا زلیخا کے دل پر لگے تھے اور بے بسی کی انتہا یہ تھی کہ وہ جواب میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔

"کریلے کا بیج بو کر آپ یہ امید نہیں کر سکتے کہ یہ پیڑ مجھے میٹھا پھل دے گا" اس نے ہاتھ بڑھا کر گرم سُوپ کا بائول اٹھایا۔ زلیخا کی آنکھوں میں آنسوں تیرنے لگے۔

زندگی کبھی کبھی کس قدر بے بس کر دیتی ہے اتنا بے کہ آپ ہل کر پانی کا گلاس بھی خود سے پی نہیں سکتے۔

"دل تو کرتا ہے یہ گرم سُوپ تمہاری اس شکل پر انڈیل دوں" اس نے طیش سے چمچ بائول میں گھوماتے ہوئے کہا۔

"کیونکہ جب بھی میں خود کو آئینے میں دیکھتی ہوں تو مجھے تمہاری پرچھائی نظر آتی ہے۔ یہ رنگ روپ یہ شکل تمہاری تشبیہ ہے"

اس نے سوپ کا بائول دوبارہ ٹرے پر پٹختے ہوئے کہا۔

"مگر تم فکر مت کرو آج میں تمہاری اور اپنی اذیت ہمیشہ کے لئے ختم کر دوں گی" وہ بستر سے کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔

زلیخا کی آنکھیں خوف سے بڑی ہو گئیں۔ اس کی آنکھوں کی پتلیوں پر شام کا وہی منظر لہرانے لگا جب اس نے بھی اسی طرح ایک شام بی جان کے کمرے میں ان سے انکی سانسیں چھین لی تھیں۔ وہ ہڑبڑا کر سر کو ہلانے کی کوشش کرنے لگیں مگر ناکام ہو گئیں۔

"فکر مت کریں بس چند سیکنڈز کی تکلیف ہو گی اور پھر آپ کو ہمیشہ کے لئے آرام آجائے گا"

اس نے جُھک کر زلیخا کے سر کے نیچے سے تکیہ کھینچا۔ زلیخا نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں اور پھر نا جانے کتنے سیکنڈز وہ اپنے مفلوج سے جسم کو بستر پر پھڑ پھڑاتے ہوئے محسوس کرتی رہیں۔

اپنے اوپر جھکی ریما کی آنکھیں اُن کی آنکھوں میں ہمیشہ کے لئے مفقود ہو چکی تھیں۔

جب روح جسم سے پرواز ہوتی ہے تو شدید تکلیف کی ایک لہر پورے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے اور وہ تکلیف وہی سمجھ سکتا ہے جس کے بدن سے روح جُدا ہوتی ہے۔

زلیخا نے ایک آخری بار اس اذیت کو محسوس کیا تھا کیونکہ اس کے بعد دنیا کے دروازے اس پر بند کر دیئے گئے تھے۔ زلیخا میر اپنے بوئے ہوئے نفرت کے بیج کے ساتھ اس فانی دنیا کو الوداع کہہ کر ہمیشہ کے لئے جا چکی تھیں۔

آنسوں ریما کے چہرے سے بہتے ہوئے ٹھوڑی سے ٹپک کر زلیخا کی کھلی آنکھوں پر باری باری گرے تھے۔
اس نے آہستگی سے تکیہ ان کے چہرے سے ہٹایا اور جھک کر اُن کی پیشانی کو چوما۔ تکیہ رکھ کر وہ سیدھی ہوئی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

گھر پورا ویران پڑا تھا۔ گنتی کے چند نوکر حویلی کی صاف صفائی میں غلطاں تھے۔

اس نے رخ چھت کی جانب کیا۔ دور کہیں مسجد میں مؤذن عصر کی آذان دے رہا تھا۔ اس نے آنکھ موند کر کھلی فضا اپنے پھیپھڑوں میں اُتاری اس کے جسم کا انگ انگ ہلکا محسوس کر رہا تھا۔
جیسے کسی بھاری بوجھ سے بری الزمہ ہو گئی ہو۔ اس نے دونوں بانہیں پھیلا کر سر آسمان کی جانب کیا مگر اس کی آنکھیں ابھی بھی بند تھیں۔

☆...☆...☆

میر خلیل ابھی زمینوں کا چکر لگا کر حویلی پہنچے تھے۔ وہ ابھی گاڑی سے نکلے تھے اور رُخ حویلی کے اندرونی دروازے کی جانب کیا تھا کہ انہیں اپنے پیچھے ایک زور دار جھماکے کے ساتھ گاڑی کے شیشے ٹوٹنے کی آواز آئی مانو جیسے قیامت آگئی ہو۔

وہ دہل کر پیچھے پلٹے اور انہیں لگا واقعی قیامت آگئی ہے۔ ریما اوندھے منہ گاڑی کی جھت پر لہولہان پڑی تھی۔ گاڑی کے تمام شیشے ٹوٹ چکے تھے۔

خون اُبل اُبل کر اس کے سر اور منہ سے نکل رہا تھا۔

ڈرائیور اور باقی ملازم دوڑ کر گاڑی کی جانب آئے تھے۔ میر خلیل دیوانہ وار ریما کے قریب آئے اور اس کے چہرے کو چھوا۔ اس کی آنکھیں تھوڑی سی کھلی ہوئی تھیں اور چہرے پر بلا کا سکون تھا۔
میر خلیل کو اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹے تو پاس کھڑے ایک ملازم نے اُنہیں سہارا دیا۔

ان کے بوڑھے ہوتے دل کے لئے یہ صدمہ بہت بڑا تھا۔ جوان اولاد کی موت ماں باپ کے لئے تباہی ہوتی ہے۔ وہ اپنی ششدر نگاہیں ریما کے ساخت ہو چکے وجود سے چاہ کر بھی ہٹا نہیں سکے۔

کیا سوچتے ہیں وہ لوگ جو مر جانے کو جینے سے زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ کیا اذیت سے بڑھ کر اذیت تھی۔

ان کا ہاتھ پہلو میں گرتا چلا گیا۔

اس لمحے پلکیں جھپکنے کے لئے بھی انہیں بہت طاقت اور ہمت چاہئے تھی۔ جو ان میں اچانک ہی ختم ہو گئی تھی۔ میر خلیل کا جسم روئی سے بھی زیادہ ہلکا ہو چکا تھا۔ وہ ملازم کے بازوؤں کے سہارے زمین پر بیٹھتے چلے گئے۔

اُس روز دو جنازے اُٹھے تھے حویلی سے جو میر خلیل کو اندر اور باہر سے ویران کر گئے تھے۔

☆...☆...☆

دل آویز ہڑبڑا کر نیند سے بیدار ہوئی تھی۔ رات کے تقریباً تین بج رہے تھے۔ اس کے ماتھے پر ہلکا پسینا موجود تھا اور وہ خوف سے کانپ رہی تھی۔

میر آہل اس کی آواز سن کر فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا اور لیمپ روشن کیا۔

"کیا ہوا"

اس نے آنکھ مسلتے ہوئے دل آویز کا ہاتھ پکڑا

"کچھ نہیں بس بُرا خواب تھا"

اُس نے ہتھیلی سے ماتھے پر آئے پسینے کو پونچھا۔

"ہم کہیں الہان کو تو نہیں دیکھ لیا تھا خواب میں" وہ اپنی ہنسی دباتے ہوئے دوبارہ لیٹ گیا۔

" آپ کو پتا ہے آپ کا سینس آف ہیومر بہت خراب ہے۔ الہان سے بھی زیادہ خراب"

وہ چہرے پر آئی ایک لٹ کان کے پیچھے اڑستے ہوئے بولی۔

"ہاں کیونکہ میں جوکر نہیں ہوں۔"

میر آہل نے آنکھ بند کرتے ہوئے کہا

"الہان کی طرح"

وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا

اُس کی سرگوشی دل آویز نے سُن لی اور اُس کے چہرے پر بڑی سی مُسکان پھیل گئی۔

"ہمم کیا زمانہ آگیا ہے اب لوگ جو کروں سے بھی جیلس ہوتے ہیں"

دل آویز مصنوعی معصومیت سے بولی تو میر آہل نے ایک آنکھ کھول کر اُسے دیکھا۔ جو پہلے ہی اُسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

"جلتے ہوئے آپ بہت کیوٹ لگتے ہیں" وہ اس کے ہاتھ پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

"ہمم میں ڈائٹ پر ہوں مکھن سے پرہیز کر رہا ہوں" اس نے اپنا گال دل آویز کے سر پر ٹکا دیا تو وہ کھکھلا کر ہنس پڑی۔

"میری زندگی اور دل میں بس ایک ہی شخص ہے۔ کسی دوسرے کی گنجائش نہیں"

دل آویز نے اپنا ہاتھ میر آہل کے دل کے مقام پر رکھا۔

"اس بات سے میں پوری طرح متفق ہوں"

میر آہل نے ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا لیمپ بُجھا دیا۔

میاں بیوی کا رشتہ محبت، عزت اور اعتبار پر ٹکا ہوتا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک چیز بھی رخصت ہو جائے تو رشتہ دم توڑ دیتا ہے۔

☆...☆...☆

"خیر اب جب تم میری فون کالز اور میسجز اگنور کر رہے ہو تو میں نے سوچا میں خود تم سے آ کر مل لیتی ہوں"

اینا نے روم کی لائٹس آن کی تو الہان نے جھنجھلا کر ہاتھ آنکھوں پر رکھا۔

"یہ تمہارا اپارٹمنٹ نہیں ہے جہاں تم منہ اٹھا کر آجاوں گی اینا یہ میرا گھر ہے" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

لندن واپسی کے بعد یہ اینا سے اس کی پہلی ملاقات تھی۔ اور وہ اینا کو یہاں دیکھ کر خوش نہیں تھا۔

"میں بس تمہاری خیریت معلوم...."

"پلیز اینا یہ ڈرامہ بند کرو" الہان نے اُسے ٹوک دیا۔

"تمہیں میرے جذبات ڈرامہ لگتے ہیں الہان" وہ دل برداشتہ ہو کر بولی۔

"Enough of this bullshit Aina" اس نے ہاتھ مار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا فریم پھینک دیا۔ جس میں اینا اور الہان کی بچپن کی تصویر لگی ہوئی تھی۔

" اپنے جذبات کا رونا۔۔۔ رونا بند کرو تم"

وہ اب تھوڑے فاصلے پر آمنے سامنے کھڑے تھے۔

"زبردستی اپنے احساسات دوسروں پر تھوپنا بند کرو۔۔۔ تمہارے احساسات، تمہارے جذبات، تمہارا دل، تمہارا پیار۔۔۔۔ سب کچھ تمہارا۔۔۔۔ کیا ہمارے احساسات کچھ نہیں اینا"

وہ مستفسر ہوا مگر اینا خاموش رہی۔

" یہاں ہر کوئی اپنی اپنی زندگی میں بہت سی لڑائیاں لڑی رہا ہے بہت سی تکلیفوں اور بوجھ تلے دبا پڑا ہے لیکن تمہیں کیا پتا تم تو اپنی ضِد میں اس قدر اندھی ہو گئی ہو کہ صحیح اور غلط کی تمیز بھول گئی ہو"

الہان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس کمرے میں موجود ہر چیز توڑ پھوڑ دے۔

"الہان میں نے جان بوجھ کر تو وہ سب نہیں کیا مجھے کیا معلوم تھا کہ جولیانہ ہماری باتیں سُن رہی ہے" اینا نے وضاحت کرنی چاہی۔

"اینا مجھے اکیلا چھوڑ دو پلیز" اس نے ہاتھ جوڑ لئے

"میں تمہاری بہن ہوں الہان" اینا کی آنکھیں نم ہوئی۔

"اور میں تمہارا بھائی تھا"

اس نے لفظ "تھا" پر زور دیتے ہوئے کہا۔

اُس کی زندگی میں بس دو ہی مرد تھے جن کے لئے اینا اورنگزیب نے اپنے آنسوں بہائے تھے۔

پہلا میر آہل اور دوسرا الہان اورنگزیب اس کا سب سے اچھا دوست۔

"آئندہ کے بعد اینا اورنگزیب۔۔۔۔الہان اورنگزیب سے آپ کا کوئی تعلق نہیں" اس نے اینا کی کلائی پکڑی اور اُسے کھینچتے ہوئے گھر کے دروازے تک لے گیا۔

"الہان تمہارا اور میرا رشتہ خون کا ہے اور خون کے رشتے چاہ کر بھی نہیں ٹوٹ سکتے" اس کی آواز بھیگ گئی۔

"کس نے کہا میں تم سے رشتا توڑ رہا ہوں اینا" کلک کی آواز سے دروازہ کُھلا

"میں تم سے قطع تعلق کر رہا ہوں"

اور الہان نے اُسے جھٹکے سے پیچھے کیا۔وہ لڑکھڑا کر دروازے سے باہر ہوئی۔

"الہان"

"اینا"

وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے بس ایک ہاتھ کی دوری پر الہان کا ہاتھ ابھی بھی دروازے کے ہینڈل پر تھا۔

"Everything is fair in love and war ilhan" اس کی نم آنکھوں میں اچانک ہی آگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔

"And this is a war of love" اینا نے گہری سانس پھیپھڑوں میں اتاری اور الہان نے دروازہ اس کے منہ پر بند کر دیا۔

وہ چند لمحے بند دروازے کو تکلیف اور غصے کے ملے جلے تاثرات لئے دیکھتی رہی۔

اور دروازے کے پار الہان دروازے سے ٹیک لگائے خالی نظروں سے سامنے دیوار کو تکتا رہا۔

"دل آویز"

اینا نے نفرت سے اُس کا نام زیرلب لیا۔

☆...☆...☆

میر آہل اس وقت لونگ روم میں بیٹھا اپنی شام کی چائے پی رہا تھا اور دل آویز اس وقت کچن میں میر آہل کی فرمائش پر چپلی کباب بنا رہی تھی۔

وہ چینل سرفنگ کر کے بور ہوا تو ٹی وی بند کر کے سینٹر ٹیبل پر رکھا میگزین اٹھا کر صفحے الٹ پلٹ کرنے لگا۔

اور یکدم اُس کی صفحے پلٹتی اُنگلیاں ساخت ہوئیں۔ آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

آرٹیکل کے نیچے دل آویز میر لکھا تھا اور ساتھ میں دل آویز کی تصویر بھی موجود تھی۔

میر آہل کی گرفت میگزین پر سخت ہوئی۔ اس نے میگزین بند کر کے رول کیا اور سیدھا کچن کا رُخ کیا۔ جہاں دل آویز پورے انہماک سے میر آہل کے لئے کھانا بنانے میں غلطاں تھی۔

"آپ کو کچھ چاہئے تھا"

اس نے آہل کو کچن کے دروازے پر کھڑا دیکھ کر سوال کیا پھر اُس کی نظر آہل کے چہرے سے پھسل کر میگزین پر گئی اور دل آویز کا پورا وجود وہی منجمد ہو گیا۔ وہ سیکنڈز کے ہزارویں حصے میں پورا ماجرا سمجھ گئی تھی۔

"آہل۔۔۔ میں۔۔ آپ۔۔ کو بتانے والی تھی" اُسے اپنی جانب آتا دیکھ دل آویز نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"پھر بتایا کیوں نہیں دل آویز" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"م۔۔ مجھے لگا" وہ اٹکی

"تمہیں لگا میں اپنی بیوی کی کامیابی کو ہضم نہیں کر سکوں گا" اس نے میگزین کاؤنٹر پر رکھا۔

"سیریسلی؟"

میر آہل نے گردن بائیں جانب ہلکا سا جھکاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ دل آویز نے نا سمجھی سے اُسے دیکھا۔

"یُو میڈ می پراؤڈ مائے لو"

اس نے دل آویز کو دونوں شانوں سے پکڑ کر اپنے سامنے کیا۔

دل آویز کی آنکھوں میں حیرت اُبھری۔۔۔ پھر خوشی چمکی اور پھر اس کے چہرے پر بڑی سی مسکان پھیل گئی۔

"آ۔۔آپ کو برا نہیں لگا کہ میں نے آپ کی اجازت کے بغیر" میر آہل نے اس کو گلے سے لگایا۔

"اپنے خوابوں کو پورا کرنے کے لئے تمہیں کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے"

دل آویز اس کے دل کی دھڑکن سن رہی تھی۔یہ لفظ تھے یہ کوئی پین کلر دل آویز نے بھی اپنے بازوں اس کے گرد حمائل کر دیئے۔

میر آہل کی یہ مضبوط بانہیں دل آویز کی پناہ گاہ تھی۔اس کے دل کا سکون تھی،اس کی سب سے محفوظ جگہ۔

"لیٹس سیلیبریٹ"

میر آہل نے اُسے خود سے الگ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"آج ہم ڈنر باہر کرینگے"

دل آویز کی آنکھیں خوشی سے چمکی۔

☆...☆...☆

دل آویز نے سیاہ رنگ کا سلک کا گاؤن پہنا تھا اور بالوں کو میسی بن کی صورت دے رکھی تھی۔کانوں میں سفید ننھے سے ڈائمنڈز چمک رہے تھے بلکل بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنی انگھوٹھی کی طرح اس نے اپنے آپ پر پرفیوم چھڑک کر ایک آخری بار خود کو سر سے پاؤں تک لونگ مرر میں دیکھا۔

"میم سر آپ کا نیچے انتظار کر رہے ہیں" ملازم نے دروازے پر ہلکی سی دستک دیتے ہوئے اسے آگاہ کیا۔

میر آہل اس کا ہال میں کھڑا انتظار کر رہا تھا۔

اس نے ایک نظر کلائی میں بندھی گھڑی پر ڈالی اور دوسری نظر سامنے زینے اُترتی دل آویز پر۔۔۔اس نے اپنا گاؤن دونوں پہلو سے اٹھا رکھا تھا ہائی ہیلز کی وجہ سے وہ بہت احتیاط سے سیڑھی اُتر رہی تھی۔

میر آہل کی نظر اس کے نازک سے سراپے پر جم گئی وہ آخری زینے پر ہلکا سا لڑکھڑائی مگر میر آہل نے فوراً اس کا ہاتھ تھام کر اُسے سنبھال لیا۔

جیسا کہ وہ ہمیشہ سے کرتا آیا تھا۔وہ کوئی رہنما تھا جو ہر موڑ پر اُسے سنبھال لیا کرتا تھا۔

وہ دونوں کچھ لمحوں کے لئے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ دماغ سے ساری باتیں جیسے مٹ گئیں۔ کچھ کہنے کے لئے الفاظ نہیں تھے مگر پھر بھی دونوں میں بہت سی باتیں ہو گئیں۔

"چلیں"

میر آہل نے محبت سے اسے دیکھا۔

"جی"

وہ پورے دل سے مسکرائی۔

دل آویز نے آہستگی سے اس کا بازوں تھام لیا۔ باہر پورچ میں سفید رنگ کی چمچماتی لیموزین کھڑی تھی۔ دل آویز نے حیرت سے میر آہل کو دیکھا۔

"یہ چھوٹا سا تحفہ میری بیوی کے لئے"

اس نے دل آویز کے سر پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"چھوٹا تو نہیں ہے اچھا خاصا بڑا ہے"

اس نے حیرت سے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لئے۔

"ہاہاہا"

میر آہل کو اُس کی بات پر ہنسی آئی

"تھینک یو سو مچ آہل"

وہ ابھی بھی حیرت سے گاڑی کو دیکھ رہی تھی۔

"اب چلیں یہ ادھر ہی کھڑے رہنے کا ارادہ ہے"

ہنس کر چھیڑا تو دل آویز اس کا ہاتھ تھامے آگے بڑھ گئی۔

☆...☆...☆

اُن کی ٹیبل گاؤ چو ریسٹورنٹ کے ہال کے پرسکون گوشے میں واقع تھی۔

یہ ریسٹورنٹ برمنگھم کے بہترین ریسٹورنٹس میں سے ایک تھا۔ جو برمنگھم کے کاروباری ضلع کے بز میں واقع تھا۔ جو اپنے بے عیب ارجنٹائنی سٹیکس، لاطینی امریکی کھانے، بہترین شراب اور سگنیچر کاک ٹیلوں کی وجہ سے مشہور تھا۔

دل آویز اور میر آہل آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ خوبصورت انٹیریئر اور فینسی لائٹس سے آراستہ یہ جگہ ماحول کو مزید پر سکون اور پر وقار بنا رہی تھی۔ بیک گراؤنڈ میں ہلکا سا میوزک چل رہا تھا۔ جو سماعتوں کو خوشگواری کا احساس بخش رہا تھا۔

میر آہل نے اپنا ہاتھ دل آویز کے ہاتھ پر رکھ دیا تو وہ جھینپ گئی۔

"دس مہینے ہو گئے ہیں ہماری شادی کو اور تم اب بھی ایسے شرماتی ہو اپنے شوہر سے جیسے کل ہی ہماری شادی ہوئی ہو"

وہ مسکرایا تو دل آویز نے نظریں جھکا دیں۔

"ایک بات کہوں"

وہ رازدارانہ انداز میں ذرا سا آگے کو ہوا تو دل آویز نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"تمہاری اس معصومیت اور سادگی نے مجھے پاگل کر دیا ہے دل آویز"

دل آویز کا دل زور سے دھڑکا

"کیا میرا حال تم سے ڈھکا چھپا ہے؟"

وہ سراپا سوال بن گیا۔

اُس کی باتیں دل آویز کو نروس کر رہی تھیں۔ میر آہل نے اپنے جذبوں کا اظہار آج سے پہلے اتنے گھمبیر اور معنی خیز انداز میں کبھی نہیں کیا تھا۔

"تم کچھ نہیں کہو گی؟"

اس نے مستفسرانہ انداز میں اس کی جانب دیکھا اور وہ لب کاٹتے ہوئے اپنی گود میں رکھے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی۔

"آپ نے کبھی مجھے آئی لو یو نہیں کہا"

اس نے نیچے دیکھتے دیکھتے ہی سوال کیا تو میر آہل نے اپنی بھنویں سوالیہ انداز میں اُچکائی اور اس کے چہرے کی مسکان فوراً سِمٹی۔

"سیریسلی دل آویز"

وہ پیچھے کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

"جی آپ نے کبھی مجھ سے آئی لو یو نہیں کہا"

اب وہ ماتھے پر شکن لائے مصنوعی اُداسی سے میر آہل کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی اور ایسا کرتے ہوئے دل آویز کی آنکھیں سکڑ کر چھوٹی ہو گئی تھیں۔

"یہ عورتیں کتنی ناشکری ہوتی ہیں قسم سے"

میر آہل نے افسوس سے ہنستے ہوئے سر کو زنبش دی۔

دل آویز نے لاپرواہی سے کندھے اچکاتے ہوئے اپنے ناخنوں پر پھونک ماری یوں جیسے اُسے بلکل بھی گلٹ نہ ہو اپنی ناشکری کا۔

میر آہل کو وہ اس طرح اتراتے ہوئے مزید پرکشش اور خوبصورت لگی تھی۔ وہ خاموشی سے اس کی ہر ادا ملاحظہ کرتا رہ گیا۔

وہ میر آہل کی بیوی تھی اس کی حیات اس کا سب کچھ اور اُس پر جچتا تھا کہ وہ اپنی محبت کا حق مانگے بلکہ اس سے ضد کر کے اپنی ہر بات منوائے۔

وہ اس کی ہر خواہش پوری کرنا چاہتا تھا۔

اُسے اپنی محبت اور لاڈ سے بگاڑنا چاہتا تھا۔ تاکہ ہلکی سی کمی پیشی ہونے پر بھی وہ میر آہل پر غصہ ہو اس سے شکوہ کرے۔ اپنا حق مانگے نہیں بلکہ چھین لے۔ جس طرح اس نے میر آہل کا دل اُس سے چھینا تھا۔

☆...☆...☆

ایک پُر سکون ماحول میں ڈنر کر کے وہ لوگ ابھی گھر آئے ہی تھے کہ اینا اورنگزیب کو لابی سے ملحقہ زینے پر بیٹھا دیکھ کر دونوں چونکے۔

دل آویز نے پیچھے مُڑ کر میر آہل کو دیکھا جو خود اُس کی آمد پر حیران تھا۔

اینا اورنگزیب نے لال رنگ کا گھٹنوں تک آتا بیک لیس ٹاپ پہنا ہوا تھا۔ بالوں کو کرل کر کے دونوں شانوں پر پھیلا رکھے تھے۔ آئی لائنر بہنے کی وجہ سے آنکھ کے گرد سیاہی پھیل گئی تھی۔

"واؤ"

وہ لڑکھڑاتے ہوئے سیڑھی کی ریلنگ کا سہارا لیتے ہوئے کھڑی ہوئی۔ اینا کا اِس طرح سے لڑکھڑانا صاف ظاہر کر رہا تھا کہ وہ شراب کے نشے میں تھی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو اینا" میر آہل نے سوال کیا۔

"میں یہاں کیا کر رہی ہوں آہل یہ اب بھی بتانے کی ضرورت ہے تمہیں"

وہ کرب میں ڈوبے لہجے میں بولی۔

اُس کی موجودگی دل آویز کو ان کمفرٹیبل کر رہی تھی۔ کم از کم آج کے دن وہ کسی بھی قسم کے ڈرامے کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

"اینا گھر جاوا بھی تم ہوش میں نہیں ہو میں ڈرائیور سے کہتا ہوں کہ تمہیں گھر ڈراپ کر دے"

آہل نے کنسول پر رکھے انٹر کام کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

"ایسا کیا ہے آخر اس دل آویز میں"

وہ خود کو سنبھالتی دل آویز کے قریب گئی اور انگلی کے اشارے سے اُس کی جانب سر سے لیکر پاؤں تک اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"جو مجھ میں۔۔۔ اینا اورنگزیب عالمگیر میں نہیں ہے"

انگلی سے اپنے سینے پر دستک دی

"جسٹ لُک ایٹ مِی آہل"

آہل نے گہری سانس لیتے ہوئے ماتھے کو چھوا اُس کے تاثرات بیان کر رہے تھے کہ وہ اینا کو یہاں دیکھ کر بلکل بھی خوش نہیں تھا۔

"بولو آہل۔۔۔جواب دو"

اینا کا توازن بگڑا اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر گرنے لگی مگر دل آویز نے اُسے بازوؤں سے پکڑ کر سنبھالا مگر اینا نے دل آویز کا ہاتھ فوراً جھٹک دیا۔

"تم میں اپنی عزت کروانے کی صلاحیت نہیں ہے اینا"

آہل نے چونک کر دل آویز کو دیکھا جو اینا اورنگزیب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دلیری سے بول رہی تھی۔

"کسی اور کو چھوڑو تم تو خود اپنی عزت نہیں کرتی" اینا کی بھنویں تن گئیں مگر دل آویز بولتی رہی۔

"کبھی آئینے میں خود کو غور سے دیکھا ہے تم نے اینا؟" اس نے مستفسرانہ نظروں سے اینا کو دیکھا۔

"تم مجھے جانتی نہیں ہو دل۔۔۔۔"

"تم ایک امیر باپ کی بگڑی ہوئی اولاد سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو اینا اورنگزیب"

دل آویز نے اُس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اینا اورنگزیب کو ٹوک دیا۔

"اگر تم گندے پائیدان کی طرح کسی مرد کے آگے بچھتی چلی جاو گی تو پتا ہے کیا ہو گا"

دل آویز لمحے بھر کے لئے رُکی اور اُسے افسوس سے دیکھا۔۔۔۔اینا کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔

"تو وہ تمہیں اپنے پیروں تلے روند کر آگے نکل جائے گا"

"بکواس بند کرو اپنی"

اینا کا ہاتھ اُٹھا مگر میر آہل نے اُس کا ہاتھ درشتی سے پکڑ کر پرے دھکیل دیا۔

"اب شاید تمہیں پتا چل گیا ہو گا کہ مجھ میں ایسا کیا ہے جو تم میں نہیں ہے"

دل آویز نے تفاخر سے مسکراتے ہوئے اینا اورنگزیب کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

اور آج اینا اورنگزیب کو اپنے مقابل کھڑی یہ لڑکی وہ ڈری سہمی ہوئی سی لڑکی نہیں لگی تھی۔ جو چُپ چاپ بُک شاپ میں اُس کی جلی کٹی سنتی رہہ گئی تھی۔ جیسے وہ اینا کو پہلی ملاقات کے وقت لگی تھی۔ آج وہ بہت پر اعتماد نظر آرہی تھی۔

"گیٹ آؤٹ اینا"

آہل کی سخت آواز نے اینا کا سکتا توڑا۔۔۔ اور وہ دل آویز کی پُر اعتمادی کا راز جان گئی تھی۔

اس کے ساتھ میر آہل کی محبت تھی۔ اُس کا مضبوط سہارا تھا۔ وہ سہارا جس کے لئے اینا پل پل ترسی تھی۔ وہ باری باری دونوں کو دیکھتی چلی گئی۔

اس لمحے اینا کو لگا کسی نے اُسے گھسیٹ کر آئینے کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ اور آج پہلی بار اینا نے اپنے کمزور اور ٹوٹے بکھرے وجود کو بڑے غور سے دیکھا تھا۔ وہی وجود جسے وہ آج تک مختلف برینڈز کی آڑ میں چھپاتی آئی تھی۔

آج وہ اُس اینا اورنگزیب سے روبرو ہوئی تھی جو دنیا کے سامنے مضبوط ہونے کی اداکاری کرتی آئی تھی۔

وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں چلتی ہوئی میر آہل کے گھر سے باہر آگئی۔

باہر کھلی فضا میں آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے اُس نے اپنا ہاتھ دل پر رکھ کر زور سے دبایا۔۔۔۔ یوں جیسے ابھی اُس کا دل پھٹ کر باہر آجائے گا۔

"اللہ"

اُس کی سماعتیں حیران تھی اُس نام پر جو آج اس کی زبان سے نکلا تھا۔

"یہ اللہ"

اکھڑی ہوئی سانس اور ہچکی میں بندھی ہوئی اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"میں تُجھے نہیں جانتی تھی مگر توں تو مجھے جانتا تھا اللہ"

وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ آنسوؤں کی وجہ سے اس کی آنکھوں کے آگے دھند چھانے لگی۔ برمنگھم کا موسم کافی سرد تھا مگر اس کے وجود سے انگارے پھوٹ رہے تھے۔

"پھر بھی تُوں نے جو میرا تھا اُسے دے دیا"

بے بسی کا عالم کیا تھا کوئی اِس وقت اینا اورنگزیب سے پُوچھتا۔ اُس کا دل ٹوٹا تھا بہت بُری طرح ٹوٹا تھا۔ اور ایسا لگ رہا تھا کہ دنیا ہر شہہ اپنی ترتیب سے ہٹ گئی ہے۔ دل ٹوٹنے پر کتنی تکلیف ہوتی ہے اِس بات کا علم اُسے آج ہوا تھا۔

☆...☆...☆

اینا کے جانے کے بعد دونوں کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ میر آہل جب کمرے میں داخل ہوا تو دل آویز واش روم میں کپڑے تبدیل کر رہی تھی۔ وہ چُپ چاپ کمرے میں یہاں سے وہاں چکر کاٹنے لگا۔

وہ جب کپڑے تبدیل کر کے باہر آئی تو میر آہل کی جانب متوجہ ہوئے بغیر اپنے کام کرنے لگی۔ اُس نے دل آویز کے چہرے کے تاثرات کو غور سے دیکھا۔

دل آویز کا چہرہ بلکل سپاٹ تھا۔ وہاں کوئی تاثر نہیں تھا۔

"یہ اللہ خیر"

میر آہل نے دل ہی دل میں کہا۔

"ہمم"

آہل نے بلند آواز میں زور سے گلا صاف کیا مگر دل آویز نے دھیان نہیں دیا وہ خاموشی سے کاؤچ پر بیٹھی اپنے دونوں ہاتھوں پر لوشن لگا رہی تھی۔

"وہ۔۔۔ دل۔۔ آویز"

جیسے ہی اپنا نام پکارے جانے پر دل آویز نے ٹھنڈے انداز میں آہل کو دیکھا تو وہ کہتے کہتے چُپ ہو گیا۔

"شادی سے پہلے میر آہل شیر ہوا کرتا تھا اور اب دیکھو" اُس نے دل ہی دل میں کوٹ کے بٹن پر انگھوٹا پھیرتے ہوئے سوچا۔

"جان۔۔۔ میں سوچ رہا تھا کہ"

اُس نے ایک بار پھر ہمت جمع کر کے بات کا آغاز کرنا چاہا مگر دل آویز نے اُسے پہلے ہی ٹوک دیا۔

"اِدھر اُدھر کی باتیں مت بنائے اور جا کر پکڑے تبدیل کریں" دل آویز ٹینٹرم دکھاتے ہوئے کاؤچ سے اُٹھی اور لوشن کی بوتل واپس ڈریسنگ ٹیبل پر رکھنے لگی۔ جب آہل نے اُس کی کلائی سے تھام کر اپنے قریب کیا۔

"آپ تو دن بدن بد معاش ہوتی جا رہی ہیں مسز میر میں نے تو اچھی خاصی شریف لڑکی سے شادی کی تھی"

وہ دل آویز کو اپنے حصار میں لیتے ہوئے شرارت سے بولا تھا۔

"اب میرا پالا ہی بد معاشوں سے پڑا ہے تو اِس میں میرا کیا قُصور" وہ سر جُھکائے میر آہل کی شرٹ کے بٹن پر انگلی پھیرتے ہوئے بولی تو میر آہل نے قہقہہ لگایا۔

"یہ ہوئی نا بات، ویسے یہ بد معاشی کافی سوٹ کرتی ہے تمہیں، دور سے معلوم ہوتا ہے کہ میر آہل کی بیوی ہو "وہ اس کی گردن پر جھکتے ہوئے شرارت سے بولا۔

"مگر مجھے اینا کو اتنے سخت الفاظ نہیں بولنے چاہیئے تھے" وہ یکدم اداس ہوئی تو میر آہل نے گہری سانس لی۔

"تم نے جو کیا ٹھیک کیا دل آویز"

اس نے دل آویز کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

"ہر انسان کو اپنی حد معلوم ہونی چاہیئے کیونکہ اگر انسان اپنی حدوں کا خیال نہیں رکھے گا تو پھر دوسروں کو رکھنا پڑے گا۔۔۔ تم نے جو کیا بلکل درست کیا" اس نے دل آویز کو تسلی دی۔

"میں نے کبھی اُسے کسی بھی قسم کی جھوٹی امید نہیں دی۔ میر آہل کو اگر کسی سے محبت ہوئی ہے تو وہ تم ہو اور یہ حقیقت وہ جتنا جلدی قبول کر لے اس کے لئے بہتر ہے"

وہ دل آویز کی پیشانی پر مہر ثبت کرتے ہوئے مسکرا کر بولا تو دل آویز بھی تھوڑا سا مسکرائی۔

"شکر الحمدللہ آپ کے چہرے پر مسکراہٹ آئی بیگم ورنہ ساری رات میں سُولی پر لٹکا رہتا"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"اچھا۔۔۔ میرا موڈ خراب ہونے کی وجہ سے آپ کیوں سولی پر لٹکے رہتے بھول گئے آپ تو میر آہل ہیں نا، ضدی، گھمنڈی، اینگری ینگ مین۔۔۔ ہاں؟"

اس نے مستفسرانہ انداز میں بھنویں اُچکائی۔

"ہاں میں تھا کسی زمانے ضدی، گھمنڈی اور اینگری ینگ مین مگر پھر میری شادی ہو گئی۔ اب تو میں مسکین اور بے بس ہوں، صحیح کہا کرتا تھا مائیکل"

وہ مصنوعی دُکھ ظاہر کرتے ہوئے بولا۔

"اوہ۔۔۔ کیا کہا کرتا تھا مائیکل؟" وہ اُسے گھورتے ہوئے بولی۔

"ا۔۔ا۔۔امم۔۔۔ یہی کہ شادی بہت خوبصورت تجربہ ہے اور سب کو شادی کرنی چاہئے"

اس نے فوراً بات بنائی۔

"اوہ۔۔۔ اچھا اچھا تبھی ابھی تک وہ خود کنوارا بیٹھا ہے۔۔۔۔ ہے نا؟"

دل آویز نے دونوں ہاتھوں کو میر آہل کی گردن کے گرد حمائل کرتے ہوئے شرارت سے کہا تو وہ ہنسنے لگا۔

"دل آویز"

میر آہل نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اُس کا نام محبت سے پکارا تو وہ تھم گئی۔

"تم میری کونسی نیکی کا صلاح ہو"

اُس نے آنکھ موند کر دل آویز کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

زندگی ہمیں جتنے دُکھ دیتی ہے اُتنے سکھ بھی دیتی ہے۔ عمر کے کسی بھی حصے میں، زندگی کے کسی بھی مقام پر وہ اپنے دی گئی تکلیفوں کی بھرپائی کر دیتی ہے۔ انسان کو کھالی ہاتھ نہیں رکھتی۔ انسان اور زندگی کا لین دین آخری دم تک چلتا رہتا ہے۔

☆...☆...☆

"کیسی ہو جُولی"

آج پورے ڈیڑھ مہینے بعد جولیانہ اپنی ڈیوٹی پر واپس آ گئی تھی۔ بظاہر دکھنے میں وہ پہلے سے کچھ کمزور ہو گئی تھی اور آنکھوں کے نیچے ہلکے پڑھ گئے تھے۔

"میں ٹھیک ہوں میم اور آپ کیسی ہیں؟"

جولیانہ کا میم کہنا دل آویز کو برا لگا تھا۔ مگر وہ جولیانہ کی حالت کا بخوبی اندازہ لگا سکتی تھی۔ جب سے الہان گیا تھا وہ کافی چُپ چُپ سی رہنے لگی تھی۔ دل آویز جانتی تھی کہ الہان اور اُس کے درمیان کچھ تو ہوا تھا۔ جو وہ دونوں دل آویز سے چُھپا رہے تھے۔ مگر دل آویز نے اس بات کو کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ سب پہلے ہی کافی کچھ جھیل چکے تھے۔

وہ نہیں چاہتی تھی کہ جولیانہ الہان کے ذکر پر پھر سے ڈسٹرب ہو جائے۔

کچھ محبتیں بنا انجام کے ہی لکھی جاتیں ہیں۔ آپ چاہ کر بھی اُنہیں پایائے تکمیل تک نہیں پہنچا سکتے۔ یہ تو قسمتوں کے کھیل ہیں۔ یہاں دعائیں بھی اکثر کام نہیں آتیں۔

"جولیانہ شوفر سے کہو کہ گاڑی آہل کے آفس کی طرف موڑ لے۔ وہ اپنی ایک ضروری فائل گھر بھول گئے ہیں" اس نے جولیانہ کے چہرے کو پیار سے چھوتے ہوئے کہا تو اس نے مسکرا کر سر کو زنبش دی اور ڈرائیور کو میر آہل کے آفس جانے کا حکم دیا۔

"جُولی آج یونیورسٹی سے واپسی پر لنچ ساتھ کریں" وہ درمیان کی خاموشی کو ختم کرتے ہوئے بولی۔

"جیسے آپ کو ٹھیک لگے میم"

دل آویز کے اتنی محبت اور اپنائیت سے پوچھنے پر وہ منع نہیں کر سکی۔

"پلیز یہ میم میم کہنا بند کرو جولی" وہ زچ ہوئی۔

"آئی ایم سوری" اس نے فوراً معزرت کی۔

"اب اتنی سی بات پر معزرت تو مت کرو" دل آویز پھر چڑ گئی۔

"آئندہ نہیں ہو گا"

"اب خیر ایسی کوئی پابندی بھی نہیں ہے معزرت کرنے پر" دل آویز نے اپنی اُمڈتی ہوئی مسکراہٹ دبائی۔

"اچھا تو پھر کر لیا کروں گی معزرت" جولیانہ فوراً بولی۔

"نہیں مطلب تم پھر سے وہی کرو گی جس چیز سے میں نے تمہیں ٹوکا ہے" اس نے جولیانہ کو آنکھ دکھائی۔

"اُف دل آویز"

"اُف جُولی"

دل آویز نے اُسی کے انداز میں کہا تو دونوں نے بروقت ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر دونوں ہنسنے لگیں۔

دل آویز نے اُسے اپنے حصار میں لیکر اس کے سر پر بوسہ دیا تو جولیانہ نے بھی دل آویز کے گرد اپنے بازوں لپیٹ لئے۔

اس وقت جولیانہ کو سب سے زیادہ دل آویز کے سہارے کی ضرورت تھی۔ اس کے دل پر کیا بیت رہی تھی۔ یہ محض جولیانہ ہی جانتی تھی۔

☆...☆...☆

ان دس مہینوں میں پہلی دفع دل آویز۔۔۔ آہل کے آفس آئی تھی۔

"جُولی تم بھی چلو نا" وہ لب کاٹتے ہوئے بولی

"جی نہیں آپ کا کام ہے آپ خود کریں" اس نے صاف انکار کر دیا۔

"اللہ پوچھے گا تم سے جولی" اس نے جولیانہ کے بازوں پر ٹھو کا دیا۔

اس نے گاڑی سے اُتر کر سر اٹھا کر شیشے سے ڈھکی اس بلند قامت عمارت کو دیکھا اور لرزتے قدموں کے ساتھ شیشے کے آٹو میٹک دروازے سے گزرتے ہوئے اندر ریسیپشن ایریا کی جانب بڑھ گئی۔

"ہیلو میم۔۔۔ ہاؤ میں آئی ہیلپ یو؟" ریسیپشن پر موجود سنہرے بالوں والی لڑکی چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ لاتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

"مجھے آہل سے ملنا ہے۔ اُن کا آفس کس فلور پر ہے" ریسیپشن پر موجود لڑکی کے تاثرات بدلے وہ میر آہل کو اتنے سر سری انداز میں مخاطب کرنے پر چونکی۔ اور دل آویز اس کے تاثرات دیکھ کر کچھ مزید کنفیوژ ہوئی۔

"میم آپ کی تعریف؟"

سپاٹ چہرے کے ساتھ سوال کیا گیا۔

"ا۔۔ا۔۔ مسز میر آہل"

اُس نے جھجکتے ہوئے کہا اور ریسیپشنسٹ کرسی سے فوراً کھڑی ہو گئی۔ جیسے چار سو چالیس والٹ کا جھٹکا لگ گیا ہو۔

"سوری میم۔۔۔ مسٹر میر کا آفس سولہویں منزل پر ہے" اُس نے سامنے لفٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا اور اب کی بار اس کے تاثرات یکسر بدل چکے تھے۔ مصنوعی مسکراہٹ کی جگہ حیرت اور تعجب نے لے لی تھی۔

"تھینک یو"

وہ لفٹ کی جانب بڑھ گئی۔ لفٹ میں داخل ہوتے ہی اس نے سولہ ہندسے کے بٹن کو دبایا۔ جیسے جیسے لفٹ اوپر جا رہی تھی۔ ویسے ویسے دل آویز کی دھڑکن نیچے آرہی تھی۔ دو منٹ بعد لفٹ سولہویں منزل پے جاکر ٹھہر گئی اور لفٹ کا دروازہ کُھلا۔

لفٹ کے سامنے والی دیوار شیشے کی تھی۔ جس میں دل آویز اپنا عکس سر سے لیکر پاؤں تک دیکھ سکتی تھی۔ اس نے رُک کر اپنے چہرے پر نظر ڈالی جس پر بارہ بج رہے تھے اور پھر گہری سانس لی۔

"تم تو ایسے ڈر رہی دل آویز جیسے کوئی دہشت گرد ہو... یہ تمہارے شوہر کا آفس ہے۔۔۔ ڈونٹ وری"

اس نے شیشے میں خود کو دیکھتے ہوئے دلاسہ دیا اور اوپن ڈور سے اندر داخل ہو گئی۔

راہداری کے دونوں جانب چھوٹے چھوٹے کیوبیکلز بنے ہوئے تھے۔ جس میں سے تمام ایمپلائز اُچک اُچک کر دل آویز کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔

وہ کچھ دیر طائرانہ نظروں سے اطراف میں نظر دوڑاتی رہی پھر یکدم کسی کے مخاطب کرنے پر پلٹی۔

"میم آپ اِدھر" وہ مائیکل کی آواز تھی۔ اس نے فوراً شکر کا کلمہ پڑھا۔

"وہ آہل اپنی ضروری فائل گھر بھول گئے تھے تو۔۔۔ خیر آہل کہاں ہیں؟"

اس نے بات کو مختصر کیا۔

"سر سامنے میٹنگ روم میں ہیں"

وہ دل آویز کو دیکھ کر اتنا سرپرائز تھا کہ اُس کے ذہن سے نکل گیا کہ میر آہل میٹنگز کے دوران کسی بھی قسم کا خلل پسند نہیں کرتا۔

"میم۔۔۔۔"

اس سے پہلے کہ وہ دل آویز کو پکارتا دل آویز میٹنگ روم کا دروازہ دھکیل کر اندر جاچکی تھی۔

"شِٹ۔۔۔اب مجھے میر آہل نام کے جہنمی داروغہ سے کون بچائے گا" اس نے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔

"یار یہ خوبصورت لڑکی کون ہے" جیک نے اپنی کیوبیکل سے منہ باہر نکال کر مائیکل سے پوچھا۔

"یہ خوبصورت لڑکی تمہارے باس کی وائیف ہے" مائیکل گردن موڑ کر غصے سے آنکھ دکھاتے ہوئے کہا تو جیک نے بنا کچھ کہے فوراً منہ اندر کر لیا۔

☆...☆...☆

دل آویز جیسے ہی میٹنگ روم میں داخل ہوتی ہے تو وہاں موجود سبھی لوگ گردن موڑ کر دل آویز کو حیرت سے دیکھتے ہیں۔

دل آویز کی نظر سربراہی کرسی پر بیٹھے میر آہل پر ٹھہر جاتی ہے۔جو آنکھیں سکوڑے سپاٹ چہرے کے ساتھ اُسے گردن کڑا کر غور سے دیکھتا ہے۔

اس کمرے میں اس وقت اتنی خاموشی تھی کہ ایک سوئی بھی گرتی تو شور سنائی دیتا۔

"Leave"

میر آہل نے دل آویز کو دیکھتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

"س۔۔سوری"

وہ جھجکتے ہوئے واپس پلٹنے ہی لگی تھی کہ میٹنگ روم میں موجود تمام ایمپلائز اپنی اپنی کرسیوں سے کھڑے ہو گئے اور ایک ایک کر کے باہر نکلنے لگے۔ دل آویز گنگ سی سائیڈ پر خاموشی سے کھڑی یہ تمام کاروائی ہوتے دیکھ رہی تھی۔

اس ائیر کنڈیشنڈ روم میں بھی اُس کے ماتھے سے بہتا پسینا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کمرے میں اب وہ دونوں تنہا موجود تھے۔

"یہ کیا بد معاشی ہے مسز میر"

وہ کوٹ کا بٹن مقفل کرتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھا اور مسکراتے ہوئے اُس کی جانب بڑھا تو دل آویز کی جان میں جان آئی۔

"آپ کی فائیل"

اس نے گہری سانس لیتے ہوئے نیلے رنگ کی فائل ٹیبل پر رکھ دی۔

"سوری مجھے اس طرح سے بنا بتائے۔۔۔"

"ششششش"اس نے انگلی اس کے ہونٹوں پر رکھی۔

"یہ سب تمہارا ہے"

میر آہل نے اُسے دونوں بازوؤں سے پکڑا

"تمہیں یہاں آنے کے لئے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ تم کبھی بھی کسی بھی وقت مجھے بنا بتائے بھی یہاں آسکتی ہو"

اُس نے دل آویز کی پیشانی چومی۔

وہ حق جِن کا خود دل آویز کو علم نہیں تھا کہ اُس کے ہیں۔ آہل نے کتنی محبت اور عقیدت سے اُس کے حوالے کر دیئے تھے۔

"ان آنکھوں میں کیا ہے دل آویز تم نے کبھی غور سے دیکھا ہے"میر آہل نے تند مزاجی سے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔۔۔ اُسے جواب معلوم تھا مگر وہ خاموش رہی۔ اُس کی خاموشی میں تمام جواب تھے۔

"پھر بھی تمہیں گلہ ہے کہ میں نے کبھی تم سے آئی لو یو نہیں کہا"

"جی ہے" اس نے نروٹھے پن سے کہا۔

"آپ نے اب تک دل سے تصدیق کی ہے۔۔۔۔ مگر زبان سے اقرار بھی لازم ہے"

وہ بھی دل آویز میر تھی ٹس سے مس ہونے والوں میں سے نہیں تھی۔ میر آہل نے ہار مانتے ہوئے ہنس کر گردن جُھکا دی۔

محبت کا تقاضا ہے کہ کوئی بھی شہہ آدھی ادھوری قبول نہیں کرتی۔ چاہے دل ہو یہ اظہار پورا طلب کرتی ہے۔

"میں پہلے ہی آج بہت لیٹ ہو گئی ہوں"

"یس میم" میر آہل نے گلا کھنکارا اور آگے بڑھ کر دل آویز کے لئے دروازہ کھولا ایسا کرتے ہوئے کیوبیکل سے جھانکتے ایمپلائز نے آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کی جانب اِشارہ کیا۔

وہ دونوں آگے پیچھے چلتے کاریڈور سے گزرے اور لفٹ تک پہنچے۔ آہل نے لفٹ کال کی اُس کا ہاتھ دل آویز کی کمر کے گرد حمائل تھا۔

لفٹ کے دروازے کُھلے اور دل آویز لفٹ کے اندر داخل ہوئی۔ اُس نے پلٹ کر الوداعی نگاہ آہل کے مسکراتے چہرے پر ڈالی اور اپنی ہتھیلی کو چوم کر آہل کو فلائنگ کِس دی۔

آہل کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے فلائنگ کس کو ہاتھ سے پکڑنے کی اداکاری کرتے ہوئے اپنا ہاتھ دل پر رکھا تو دل آویز بلش کرنے لگی اور سیکنڈز میں لفٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔

میر آہل نے رُک کر خود کو کمپوز کیا بالوں میں ہاتھ پھیرا اور پھر اوپن ڈور سے اندر سیدھا میٹنگ روم کا رُخ کیا مگر یکدم اُسے احساس ہوا کاریڈور کے ارد گرد ہلکے ہلکے قہقہے اور سرگوشی کی آوازیں آرہی ہیں۔ اس کے چہرے کی مسکان سمٹی اس نے سپاٹ چہرہ بناتے ہوئے پلٹا اور مائیکل کی جانب مستفسرانہ نظروں سے دیکھا۔

جو خود ہاتھ آگے باندھے اپنی مسکراہٹ کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مائیکل میر آہل کی نظروں میں موجود استفسار سمجھ گیا تھا۔ اُس نے آنکھ کے اشارے سے اُسے پیچھے گھومنے کو کہا۔

مائیکل کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے آہل نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔

اور وہ یہ بات کیسے بھول گیا تھا کہ کاریڈور کی دیوار شیشے کی تھی۔ جو باہر سے سیاہ آئینہ معلوم ہوتا تھا مگر اندر سے لفٹ اور لابی کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔

"شِٹ"

میر آہل نے شرمندگی سے پیشانی کو چُھوا۔

"مائیکل آج کی میٹنگ کینسل کر دو"

بلند آواز میں حکم سادر کرتے ہوئے وہ سیدھا اپنے آفس میں گُھس گیا۔

آفس کا دروازہ مقفل کرتے ہی اس کے منہ سے ہلکا سا قہقہہ نکلا اُسے خود اپنی غفلت پر ہنسی آئی تھی۔

☆...☆...☆

ہنس ہنس کر میر آہل کے جبڑے درد کر گئے تھے اور آفس سے نکلنے کی ہمت فلحال اُس میں ہمت نہیں تھی۔ کیونکہ پورا آفس سرگوشیوں میں اُسی کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔

اُس نے ٹیبل پر رکھا پانی کا گلاس اپنے حلق میں اُنڈیلا اور دائیں ہاتھ کی جانب رکھا انٹر کام اٹھایا اور مائیکل کو کنیکٹ کیا۔

"جی باس؟" وہ محتاط انداز میں بولا

آہل نے ٹشو باکس سے ایک لیف کھینچ کر اپنے ہونٹوں کے کنارے خشک کئے۔

"باہر کے کیا صورتحال ہیں؟" اس نے ریسیور کان اور کندھے کے درمیان دباتے ہوئے سرگوشی کرنے والے انداز میں سوال کیا۔

"آپ کو مجنوُں موڈ میں پہلی بار دیکھا ہے نا سر اس لئے کچھ حیران و پریشان ہیں سب" اُس نے بمشکل اپنی ہنسی روکی۔

"ایک کام کرو آج سب کو جلدی روانہ کر دو"

"سر اس طرح تو ہم سڑک پر آجائے گے" اس نے فوراً اعتراض کیا۔

"تو پھر کیا کروں میں" آہل زِچ ہوا

"سر اٹس او کے آپ کو فلائنگ کِس اپنی ذاتی بیگم نے دی ہے کسی پرائی عورت نے نہیں دی جو آپ اتنا شرمندہ ہو رہے ہیں۔ اور ویسے بھی انسان پیار میں اندھا ہو جاتا ہے۔ اب اندھے انسان کو کیا معلوم آگے شیشہ ہے یا دیوار"

اُس نے آہل کو حوصلہ دیا۔

"اور میری سخت لونڈے والی امیج کا کیا؟"

میر آہل پُر سوچ انداز میں بولا تو مائیکل کے منہ سے ہنسی کا فوارہ چھُوٹا۔

"خدا کا خوف کریں سر میم کو پتا چلا تو آپ کی بچی کُچی امیج کا گولا کباب بنا دیں گیں"

اس نے اپنی ہنسی روکی۔

" صحیح کہہ رہے ہو یار تم"

آہل نے مسکینیت سے کہا

"کیا واقعی؟"

مائیکل نے محلے کی عورتوں کی طرح دلچسپی ظاہر کی۔

"ہاں مائیک واقعی۔۔۔میر آہل اب شیر نہیں رہا تمہاری میڈم نے چوہا بنا دیا ہے" اُس نے ٹائی ڈھیلی کی۔

"جی مجھے بھی اندازہ ہو ہی رہا تھا ویسے"

وہ بڑے مزے سے اپنی کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا تو آہل کی بھنویں تن گئیں۔

"اوہ اچھا اچھا کس بات کا اندازہ" آہل نے اُسے چیک کرنے کے لئے مزید کریدا۔

"یہی کہ اب باس سنگھم سے چیونگم بن گئے ہیں"

وہ مزے سے بولا۔ گاسپس کے چسکے لینے میں وہ اتنا مگن تھا کہ میر آہل کی بدلتی ٹون کو نظر انداز کر گیا۔

"اوہ سنگھم سے چیونگم سہی سہی اور کیا اندازہ ہوا" اس نے سنجیدگی سے پوچھا تو مائیکل اُچھل کر فوراً سیدھا ہوا۔

"اور یہ کہ سر چاہے کچھ بھی ہو جائے ہمارے لئے تو آپ پہلے والے میر آہل رہے گے نا گھر اور آفس میں تو فرق ہوتا ہے نہ سر"

اس نے اپنا پھیلایا ہوا رائیتا سمیٹنا چاہا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

"بلکل ایسا ہی ہے مائیک۔۔۔۔" اس نے ہاتھ کا مُکا بناتے ہوئے منہ پر رکھا۔

"اور اب تم گھر میں تو ہو نہیں جو گلی محلے کی عورتوں کی طرح بیٹھ کر گاسپس کرو"

"جی سر"

مائیکل نے اُس کی بات سے نہ چاہتے ہوئے بھی اتفاق کیا۔

"اس لئے جس فائل پر جیک کام کر رہا تھا اس فائل پر اب تم کام کرو گے اور اتنا ہی نہیں تبسم کی پریزنٹیشن پر بھی کام تم ہی کرو گے"

وہ ہنسی روکتے ہوئے بولا اور وہاں مائیکل نے ریسیور کو کان سے ہٹا کر مظلومیت سے گھورا جس میں سے اُس درندہ صفت انسان کی آواز گونج رہی تھی۔

"مائیکل حیات ہو یا صدمے سے آسمان کی سیر کو نکل گئے؟" وہ مائیکل کی خاموشی پر بولا

"نہیں سر میں بہت ڈھیٹ ہوں ایسے نہیں مرنے والا" اس نے دوبارہ ریسیور کان سے لگاتے ہوئے کہا اور اندر ہی اندر خود کو گالیاں دیں۔

"چلو گُڈ۔۔۔ اب تم تحمل سے کام کرو میں چلتا ہوں۔ آج دل آویز نے ڈنر میں میرے لئے بریانی بنائی ہے" وہ جان بوجھ کر اُسے چڑانے کی غرض سے بولا۔

"ویسے یہ بہت غلط بات ہے سر"

"ہمم جینیفر کی فائل پر بھی اب تم ہی کام کرو گے" مائیک کو اپنی زبان کھولنے پر مزید پچھتاوا ہوا۔

"جی سر بہت بہتر۔۔۔ اوپر والا آپ کے معدے کو بریانی ہضم کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین"

"آمین مائیک آمین"

وہ سڑ کر بولا تو میر آہل نے اپنا قہقہہ بلند ہونے سے روکا اور فوراً ریسیور رکھ دیا۔

"میری زندگی میں آدھے مسئلے تو میری اس زبان کی وجہ سے ہے۔ اب میں نے یہ زبان ہی کاٹ کر پھینک دینی ہے "مائیکل اپنے سامنے پڑی فائلز کو اِدھر سے اُدھر پٹختے ہوئے آہستگی سے بڑبڑایا کہ اگر یہ بھی میر آہل نے سُن لیا تو کہیں آفس میں موجود باقی تمام ایمپلائز کا کام بھی اُس غریب کے متھے نہ مار دیا جائے۔

☆...☆...☆

میر آہل بڑے خوشگوار مزاج میں گھر کے اندر داخل ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیلے رنگ کا ڈیزی تھا۔

روز آفس سے واپسی پر دل آویز کے لئے اس کا پسندیدہ پھول لانا اب معمول کا حصہ بن گیا تھا۔

عام طور پر اس وقت دل آویز کچن میں اُس کے لئے شام کی چائے اور خشک میوہ جات کے ساتھ ساتھ کچھ اسنیکس بھی تیار کر رہی ہوتی تھی۔

اور پھر وہ دونوں خوشگوار ماحول میں ساتھ چائے پیتے اور اپنے دن بھر کی مصروفیات پر چرچہ کرتے تھے۔

مگر آج خلاف توقع وہ نہ کچن میں موجود تھی اور نہ اپنے کمرے میں میر آہل کو لگا شاید وہ کہیں باہر گئی ہوئی ہے۔ مگر ملازم سے پوچھنے پر اُسے معلوم ہوا کہ وہ تو گھر پر ہی ہے۔ مگر حیرت کی بات تھی کہ وہ اُسے اسٹڈی روم میں بھی نہیں ملی۔

پورا گھر چھان لینے کے بعد وہ چلتا چلتا لونگ روم کے درمیان میں آیا اور ایڑیوں کے بل گھوم کر چاروں جانب دیکھا۔

حیرت کی بات تھی اگر دل آویز گھر میں ہی موجود تھی تو کہاں تھی اور اس سے بھی عجیب بات یہ تھی کہ کسی بھی ملازم کو اُس کی عدم موجودگی کا احساس تک نہیں ہوا تھا۔

وہ اکثر ہی دن میں تین چار دفع کچھ وقفے کے لئے غائب ہو جایا کرتی تھی۔ مگر حیرت کے آج تک خود اُس نے بھی اِس بات پر کبھی دھیان نہیں دیا تھا۔

وہ تھک ہار کر لونگ روم کے صوفے پر بیٹھ گیا اور ہاتھ میں پکڑے پھول کو انگھوٹے اور انگلی کے درمیان گھماتے ہوئے خاموش نگاہوں سے پھول کو گھورنے لگا۔ اتنے میں اُس کی نظر لابی میں موجود سفید رنگ کے دروازے کی جانب اُٹھی۔ جس کا دروازہ نیچے بیسمنٹ میں کُھلتا تھا۔

یکدم اس کے ماتھے کی سلوٹیں گہری ہوئیں۔ وہ فوراً صوفے سے اُٹھا اور بے اختیار میر آہل کے قدم اُس دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور دروازہ بنا کوئی آہٹ پیدا کئے کُھلتا چلا گیا۔

میر آہل کی پُشت سے نکلتی روشنی بیسمنٹ کی سیڑھیوں کو منور کر رہی تھی۔ وہ آرام آرام سے سیڑھیاں اُترنے لگا۔ میر آہل نیکٹوفوبیا اور کلاسٹروفوبیا کا شکار تھا۔ اُسے اندھیرے اور بند جگاہوں سے خوف آتا تھا۔

مگر آج اس تاریک بیسمنٹ میں اترتے ہوئے۔ اُسے بلکل بھی ڈر نہیں لگا نہ ہی اُس کو پسینے آئے اور نا ہی اُس کا دل گھبرایا۔

آخری سیڑھی پر آکر اس کے قدم لمحے بھر کو ساکت ہوئے۔ اس نے بیسمنٹ کے بلکل آخر میں ہلکی سی روشنی دیکھی اور کسی کا سایہ دیکھا مگر درمیان میں کتابوں کے ریکس موجود تھے۔

جس کی وجہ سے وہ ٹھیک سے دیکھ نہیں سکا کہ وہاں کون ہے۔ دراصل یہ بیسمنٹ لائبریری کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔

میر آہل کو کتابیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ انہیں جمع کرنے کا بھی کافی شوق تھا۔ جس کی وجہ سے اُس نے یہ لائبریری بنائی تھی۔

مگر خود کبھی اس لائبریری میں قدم رکھنے کی ہمت وہ نہیں جُٹا سکا تھا۔ جب بھی اُسے کوئی کتاب بیسمنٹ سے منگوانی ہوتی تھی۔ وہ کسی ملازم کے ہاتھوں منگوا لیا کرتا تھا۔

اس کی زندگی میں بہت سی جنگیں تھیں۔ جنہیں وہ لڑ رہا تھا مگر کچھ مقام و حالات ایسے بھی تھے۔ جہاں اس کی ہمت نے گھٹنے ٹیک دیئے تھے۔

میر آہل چھوٹے چھوٹے دگ بھرتا اُس روشنی کی جانب بڑھنے لگا۔ کتابوں کی ریکس کے درمیان سے گزرتے ہوئے۔ اُس نیم روشنی کی جانب بڑھتے ہوئے۔ اُس نے ایک پل کے لئے بھی اپنی نظر اُس گوشے سے نہیں ہٹائی تھی۔

درمیان سے فاصلہ مِٹااور آخری ریک کو کراس کرتے ہی میر آہل نے دیکھا کہ دل آویز زمین پر سجدے کی حالت میں ہے۔

اُسے ایک پل کے لئے کچھ بھی سمجھ نہیں آیا وہ اپنے خطا او سانوں کے ساتھ اُسے دیکھتا رہا۔

اس نے سر گوشی میں "اللہ ہُو اکبر" کہتے ہوئے سر اٹھایا اور پھر "اللہ ہو اکبر" کہہ کر سجدے میں چلی گئی۔ وہ گنگ سا اس کی پُشت پر کھڑا یہ منظر دیکھتا گیا۔ اس کے دماغ کے تینوں خانے سُن ہو گئے تھے۔

ہاتھ اور پیر ٹھنڈے ہو چُکے تھے۔ میر آہل کی سانسیں اور دل دونوں بھاری ہو گئے۔

دل آویز نے "اسلام و علیکم ورحمتہ اللہ" پڑھ کر پہلے بائیں اور پھر دائیں شانے کی جانب چہرے کا رُخ کیا اور پھر دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے اور پیچھے کھڑا میر آہل اُس کے پیچھے ذرا سے فاصلے پر بنا کوئی آواز پیدا کئے گھٹنوں کے بل بیٹھتا چلا گیا۔

وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا مگر اس کے بالوں کی مہک سونگھ سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے پیالے ہلکی سی نمی کی زد میں آ گئے۔

اتنے تحمل اور صبر سے اس نے اپنی بیوی کو پہلی بار نماز پڑھتے دیکھا تھا اور اس منظر کو دیکھنے کے بعد اس نے یہ اعتراف کیا تھا کہ وہ میر آہل کو آج سے پہلے شاید اتنی خوبصورت نہیں لگی تھی۔ جتنی آج اس ایک لمحے میں لگی تھی۔

اس لمحے کی حیرت اس کا دل بیان کرنے سے قاصر تھا کیونکہ اس نے اتنا حسین منظر پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ یہ خوبصورتی کی کونسی تعریف تھی کونسا تقاضا تھا۔ جس سے میر آہل اپنی زندگی کے اٹھائیس سال لاعلم رہا تھا۔

دل آویز نے دعا ختم کر کے گردن موڑ کر میر آہل کو دیکھا۔ اُس کے آنکھوں کی نمی اور چہرے پر آئے تاثر کو دیکھ کر وہ نرمی سے مسکرائی۔

نیم اندھیرے میں بھی دل آویز کی لونگ پر جڑا ننھا سا ہیرا واضح طور پر چمکتا نظر آرہا تھا۔ میر آہل اس کے برابر میں رُخ اس کی جانب کر کے بیٹھ گیا۔

دل آویز نے چہرے کا رُخ میر آہل کے چہرے کی جانب کیا مگر وہ اب بھی نماز پڑھنے والے انداز میں ہی بیٹھی تھی۔

"تمہیں پتا ہے دل آویز میں نے اِن دس سالوں میں ایک بار بھی نماز نہیں پڑھی ایک دفع بھی رب کی بارگاہ میں سجدہ نہیں کیا۔"

چہرے پر بہتے آنسو اور آنکھوں میں کرب لئے وہ اس کی جانب دیکھتے ہوئے کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔

دل آویز نے اُسے محض مسکرا کر دیکھا۔

"کامیابیاں میرے حصے میں آتی گئیں۔ میں اپنے خوابوں کی سیڑھی چڑھتا گیا۔ میرے پاس دنیا کی تمام آسائشیں تھیں مگر میرا دل۔۔۔ دل آویز"

اس نے اپنا ہاتھ دل کے مقام پر رکھا

"میرا دل ہمیشہ بے چین اور گھبراہٹ کا شکار رہتا تھا"

اس نے رک کر ہچکی زدہ سانس اپنے اندر کھینچی۔

"میں نے اپنے اردگرد آسائشیوں کے ڈھیر لگا دیئے مجھے پھر بھی سکون نہیں مِلا"

وہ نا جانے کیوں اس سے یہ باتیں کر رہا تھا۔ جن باتوں سے وہ آج تک خود پردہ کرتا آیا تھا۔

وہ باتیں وہ بنا کسی شرم اور حجاب کے دل آویز کے سامنے بول رہا تھا۔

"مجھے اندھیرے سے ڈر لگتا تھا تو میں ڈاکٹر کے پاس بھاگتا تھا۔ مجھے بند جگاہوں سے گھٹن ہوتی تو میں ڈاکٹرز کی مدد پکارتا تھا۔ ڈپریشن، انزائٹی، پینک اٹیکس ان سب سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے میں دوائیوں پر منحصر تھا"

اس نے روتے روتے سر جھکا دیا۔

"مگر اپنی انا میں۔۔۔ میں نے کبھی اس ذات کی جانب قدم نہیں بڑھائے۔ جس نے مجھے دنیا کا سب سے خوبصورت تحفہ میری شریک حیات کی صورت عطا کیا۔"

ہر شخص خدا کے بعد کسی دوسرے انسان پر منحصر ہوتا ہے۔ اور اس کی زندگی میں وہ انسان دل آویز تھی۔

اس نے اپنا بازو دل آویز کے گرد حمائل کرتے ہوئے اپنی پیشانی دل آویز کے کندھے پر ٹکا دی اور سسکیاں لے کر کسی چھوٹے سے بچے کی طرح رونے لگا۔

دل آویز نے مسکرا کر اپنی نرم ہتھیلی اس کے گیلے چہرے پر رکھی۔

"مجھے معلوم ہے آپ کو اندھیرے سے ڈر لگتا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ بند جگہوں سے گھبراتے ہیں۔ آپ کو ڈپریشن، انزائٹی اور پینک اٹیکس کے مسائل بھی ہیں۔ مجھے سب معلوم ہے آہل"

وہ اس کے گال کو نرمی سے سہلاتے ہوئے بولی۔

"آپ کو معلوم ہے میں آپ کی نظر سے دور بیسمنٹ کے اس کونے میں نماز کیوں پڑھتی تھی"

اُس کے ہونٹوں پر مسرت بخش مسکراہٹ تھی اور اس کی نظر جائے نماز پر ٹکی تھی۔

"نہیں" میر آہل نے بنا سر اٹھائے ہی کہا۔

"کیونکہ میں چاہتی تھی کہ آپ خود میری اچانک عدم موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے یہاں تک آئے" دل آویز کی بات سن کر اس نے چونک کر ہلکا سا سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔

"اور اپنے سارے ڈر اور خوفوں کو خود شکست دیں"

وہ تامل سے بولی

"آپ خدا سے بھاگ نہیں سکتے اپنے اور اللہ کے درمیان دیوار نہیں کھینچ سکتے۔ یہ وہ خلا ہے جسے ہر حال، ہر صورت میں پورا ہونا ہے"

دل آویز نے اپنا رخ مکمل میر آہل کی جانب موڑ لیا۔

"آپ نے کہا اندھیرے سے آپ کو ڈر لگتا ہے پھر کیوں آپ اس تاریک بیسمنٹ میں چلے آئے۔ آپ نے کہا بند جگہوں سے آپ کو گھٹن ہوتی ہے پھر کیا چیز تھی آہل جو آپ کو یہاں تک کھینچ لائی"

وہ سوال پر سوال کر رہی تھی اور وہ لاجواب سا بیٹھا اُسے سُن رہا تھا۔

"آپ نے کہا کہ آپ نے پچھلے دس سال میں ایک دفع بھی سجدہ نہیں کیا پھر مجھے سجدے میں دیکھ کر آپ کی آنکھیں کیوں نم ہو گئیں؟۔۔۔ وہ کونسا احساس تھا جو آپ کو اپنے گھٹنوں پر لے آیا؟"

میر آہل کی ہتھیلیاں پسینے سے بھر گئیں۔ دل آویز کی باتیں اُس کی روح جھنجھوڑ رہی تھیں۔

"نماز آپ کی زندگی کا وہ ضروری عمل ہے جسے آپ نظر انداز کر دو تو آپ کی زندگی میں ایک خلا سا آجاتا ہے۔ ایک کمی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ وہ خلا، وہ کمی بعد میں ڈپریشن اور انزائٹی کی شکل اختیار کر کے تاعمر انسان کو ذہنی طور پر پریشان کرتی رہتی ہیں" اس نے میر آہل کی گم سم سی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"یہ وہ مسائل ہیں جو انسان نے خود کھڑے کئے ہیں۔ ڈاکٹر بھی اِسے مکمل طور پر حل نہیں کر سکتا۔ دوائیاں بھی مخصوص مُدت کے بعد آپ پر اثر کرنا چھوڑ دیں گی۔ یہ وہ مسائل ہیں جنہیں آپ کو خود حل کرنا پڑے گا اور اب آپ جانتے ہیں کہ یہ مسئلے کیسے حل ہونگے" اُس نے میر آہل کا چہرہ اپنی ہتھیلیوں میں بھرتے ہوئے محبت و اپنائیت سے کہا۔

"میں بہت کمزور ہوں۔۔۔ میرے کمزور کندھے اتنا وزن برداشت نہیں کر سکتے" اس نے تھک کر ایک بار پھر سر جھکا دیا تھا۔

"تو اپنا سارا بوجھ آپ اللہ کے قدموں میں ڈال کر خود سجدے میں کیوں نہیں گر جاتے۔۔۔ آپ کے کندھے خود بخود ہلکے ہو جائے گے آہل"

اس نے امید بھری نظروں سے میر آہل کو دیکھا

"مگر میں نے دس سال سے۔۔۔۔"

"شش۔۔۔"

دل آویز نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"اُسے اُن دس سالوں سے کوئی غرض نہیں آہل اُس کے لئے وہ ایک پہر اہم ہوتا ہے۔ جب اس کا بندہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اُس کے آگے سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔ اپنی ہار مان کر اُس کی بارگاہ میں سرخرو ہو جاتا ہے"

وہ بھیگی پلکوں کو بنا جھپکائے اُس کے ردعمل کا انتظار کرتی رہی اور وہ بنا کچھ کہے چُپ چاپ خاموشی سے اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔

میر آہل کا اس طرح سے اٹھ کر جانا اسے اندر تک توڑ گیا۔ دل آویز نے دل برداشتہ ہو کر آنکھیں بند کر لیں اس کی آنکھوں سے آنسوں زار و قطار بہنے لگے تھے۔

اُس کا دل بُری طرح مجروح ہوا تھا۔ اس کی کوئی بات کوئی الفاظ میر آہل کو قائل نہ کر سکے تھے۔

اس کے برسوں سے جلتے زخموں پر مرہم نا بن سکے تھے۔ اس نے روتے روتے اپنا چہرہ دونوں ہتھیلیوں میں چُھپا لیا۔ ابھی چند لمحے اور سر کے تھے کہ

اچانک اُسے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا وہ میر آہل تھا۔ جو اس کے برابر میں زمین پر جائے نماز بچھا رہا تھا۔ اس کی شرٹ کے دونوں آستین اور پائینچے ملکے سے بھیگے ہوئے تھے۔

"میں نماز بھول چکا ہوں دل آویز"

اس نے جائے نماز پر کھڑے ہوتے ہوئے دل آویز کو مدد بھری نظروں سے دیکھا تو دل آویز کے آنسوؤں میں روانی آگئی۔

شادی زندگی کی سب سے بڑی نعمتوں میں سے ایک ہے۔ آپ کی زندگی میں ہر چیز کسی نہ کسی قیمت پر آتی ہے۔ جو آپ کے ایمان کو برقرار رکھنے میں مدد دیتی ہے اور اس کی پرورش کرتی ہے۔

اور جو بہت زیادہ قیمتی چیز ہوتی ہے، آپ کو اس کے لئے بہت زیادہ ایمان اور کوشش کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور اگر آپ کا ہمسفر صالح ہو تو اللہ آسانیوں اور رحمتوں کے در آپ پر کھول دیتا ہے۔

دل آویز کے پہلو میں ملنے والا سکون اس سے محض محبت نہیں تھی در حقیقت اس کے ساتھ جُڑی وہ رحمتیں تھیں۔ جس نے میر آہل کے تپتے وجود پر پانی ڈالا تھا۔

میر آہل کو اب دوائیوں کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اب وہ کسی ملازم کو بھیج کر کتابیں نہیں منگواتا تھا بلکہ بے دھڑک بیسمنٹ میں چلا جاتا تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ میر آہل کی شخصیت میں مزید تبدیلیاں آنے لگی تھیں۔ نہ اب اُسے ڈپریشن ہوتا تھا اور نہ انزائٹی میں پینک اٹیکس آتے تھے۔

اس کی دوائیوں کو دل آویز نے ڈسٹ بن کی نظر کر دیا تھا۔ کیونکہ اب میر آہل کو اِن دوائیوں کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔

اس کے اندر یہ تبدیلی مائیکل نے واضح طور پر نوٹ کی تھی۔ مگر اُس نے آہل سے ان تبدیلیوں کی وجہ نہیں پوچھی تھی۔ وہ پہلے سے ہی جانتا تھا کہ یہ سب کس کی وجہ سے ہو رہا تھا۔

آخر کار میر آہل اپنی خامیوں سے لڑنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اپنے مسئلوں کو مات دیکر اُس نے اپنی زندگی کو جیت لیا تھا۔

ایک ایسی زندگی جہاں ماضی کے ہولا دینے والی یادیں نہیں تھی۔ آنسوں نہیں تھے۔ کوئی خوف کوئی ڈر نہیں تھا۔

میر آہل اور دل آویز رات کا ڈنر کر کے باہر واک کے لئے نکلے تھے۔ ٹھنڈ کی سختی اب آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔ اور موسم خوش گوار ہو گیا تھا۔

ایجبسٹن کی سڑکیں رات کے اس پہر خاموش ہو جاتی تھیں۔ اور گرمیوں میں اس کی خوبصورتی میں مزید چار چاند لگ جاتے تھے۔

چاند کی روشنی میں وہ دونوں سڑک کے کنارے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے واک کر رہے تھے۔ اس سڑک پر اس وقت اِکا دُکا لوگ ہی نظر آ رہے تھے۔

سڑک کے دونوں جانب کی اسٹریٹ لائٹس روشن تھیں۔ اور سڑک کے دوسری جانب ایک چھوٹا سا پارک بھی تھا۔ جہاں جُھولے لگے ہوئے تھے۔ وہاں کچھ بچے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے دوڑتے نظر آ رہے تھے۔ پاس لگیں بینچوں پر اُن کے ماں باپ بیٹھے مسکرا کر انہیں ہنستا کھیلتا دیکھ رہے تھے۔

میر آہل کو دور سے یہ منظر بہت خوبصورت لگا تھا۔ دل میں ایک نئے ارمان نے سانس لی تھی۔ اُس نے بنا کچھ کہے ہی دل آویز کے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کی تو دل آویز نے مسکرا نظریں نیچے کر لیں۔ وہ اس کی آنکھیں پڑھ چکی تھی۔

زندگی میں سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا بس ایک ننھے مہمان کی کمی تھی۔ میر آہل کو حیرت ہوئی کہ آج سے پہلے اُس کے دل میں یہ خیال کیوں نہیں آیا۔

خیر بچوں کی ماں سے عشق فرمانے سے فرصت ملتی تو بچوں پر بھی دھیان جاتا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے سڑک کراس کرنے لگے۔ جب تین چار بائیکس زن سے ایک کے بعد ایک تھوڑے تھوڑے فاصلے سے گزریں۔

اُس نے ہلکی سی چیخ مار کر میر آہل کا بازوں کس کے پکڑ لیا۔

"یہ اللہ انگلینڈ میں بھی شپاٹر لونڈے"

اُس نے حیرت سے دل پکڑتے ہوئے کہا۔

"ش۔۔شپاٹر"

میر آہل نے چونک کر گردن ترچھی کر کے دل آویز کو دیکھا جو ابھی بھی سڑک کے اُسی سمت دیکھ رہی تھی۔ جہاں وہ بائیکس غائب ہوئیں۔ اس نے لفظ شپاٹر اپنی تا حیات میں پہلی دفع سُنا تھا۔

"آپ کو نہیں معلوم یہ شپاٹر کون ہوتے ہیں؟"

اس نے حیرت سے آہل کو یوں دیکھا جیسے اردو کی کتاب میں شپاٹر نام کا کوئی نصاب موجود تھا۔

"نہیں۔۔۔دل آویز"

وہ اب بھی جیسے شاکڈ میں تھا۔

"ہم آپ کو کیسے معلوم ہو گا۔۔ میں بتاتی ہوں یہ شپاٹر کون ہوتے ہیں"

وہ دونوں اب سڑک پار کر کے پارک کی حدود میں داخل ہو گئے تھے۔

"شپاٹر لڑکوں کی سب سے بڑی پہچان ہی یہ ہوتی ہے کہ یہ لوگ کبھی بھی تنہا نہیں نکلتے۔ ہمیشہ چار پانچ کی ٹولیوں میں نکلتے ہیں۔ جیسے سڑک ان کے باپ کی ہو"

اس نے شانے اُچکائے۔ آہل کو دل آویز کی بات سُن کر حیرت کا جھٹکا لگا۔ یہ اُس کی بیوی کس زون میں چلی گئی تھی۔

"اگر کسی کا سکون برباد کرنا ہو، کسی کو دل کا دورا پڑوانا ہو یہ پھر کسی کی روح قبض کرنی ہو تو پھر ان پر شپاڑوں کی فوج نازل کر دو۔۔۔بس قصہ تمام"

وہ دونوں ہاتھ آپس میں جھاڑتے ہوئے بولی

"یکدم آگے سے شووو سے بائیک پر نکلتے ہیں اور سامنے والے کا دل چھاتی پھاڑ کر باہر۔۔اُففف"

وہ جذباتی انداز میں منہ بنا بنا کر آہل کو ایکسپلین کر رہی تھی۔

"اور آپ کبھی ان کی بائیک کا کلر نوٹ کیجیئے گا۔نہیں مطلب آنکھوں کی بینائی چلی جائے اگر جو ان کی بائیک کو کھلی آنکھوں سے دیکھ لے کوئی۔۔۔لال، ہرے، اورنج۔۔۔یکلک "

میر آہل نے جُھرجُھری لی۔

"اور جتنا بیکار ان کی بائیک کا رنگ ہو گا اُتنی ہی خراب ان بائیکس پر بیٹھے لڑکوں کی شکلیں۔۔۔بلکل کیکڑا نما"

ان کی شکلیں دل آویز کے ذہن میں اُبھری تو اُسے اُبکائی آنے لگی۔

"اور نا جانے ان کی بائیک کے انجن میں کونسا جانور پھنسا ہوتا ہے۔انسان کو بہرا کرنا ہو تو اِن کی بائیک آگے سے گزار دو۔۔۔انسان زندگی بھر کے لئے بہرا ہو جائے گا"

میر آہل نے اپنا سر پکڑ لیا۔کہاں وہ بچوں کے بارے میں سوچ رہا تھا اور کہاں یہ دل آویز فضول سے ٹاپک پر گفتگو کر رہی تھی۔

"اور اِن کے بال۔۔۔اُففف۔۔۔آپ کو کبھی بھی نارمل لوگوں جیسے نہیں دِکھے گے۔اُن کے بال بھی اُن کی بائیکس کے رنگ جیسے ہوتے ہیں۔لال، پیلے، نیلے۔۔۔چِھییییی میں تو اپنے بیٹے کو کبھی بھی ایسے بال نہ رکھنے دوں اونہوں"

روانی میں منہ سے نکلی بات پر وہ لمحے بھر کے لئے ٹھٹک گئی۔وہ دونوں واکنگ ٹریک پر چلتے چلتے یکدم رُک گئے۔

میر آہل نے ایک بار پھر اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالا تو دل آویز جھینپ گئی۔وہ دونوں پلیئنگ ایریا سے کچھ فاصلے پر تھے۔یہاں سے بچوں کے شور کی آہستہ آہستہ آوازیں آ رہی تھیں۔

"اور میں اپنی بیٹی کو ایسے لڑکوں سے ہمیشہ دور رکھوں گا۔ جن کے بال نیلے، پیلے رنگ کے ہونگے"

اُس نے معنی خیز انداز میں دل آویز کے جُھکے چہرے کو گردن جھکا کر دیکھا تو وہ مزید شرما گئی۔

"ٹھیک ہے؟"

آہل نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے رضامندی چاہی تو دل آویز نے جواباً مسکرا کر میر آہل کی آنکھوں میں دیکھا اور اثبات میں اپنا سر ہلایا۔

"ہاں ویسے بھی یہ شپاٹر لڑکے بہت چلاک ہوتے ہیں۔۔۔۔"

بات گھوم پھیر کر وہیں آگئی تھی۔ دل آویز کی شپاٹر لڑکوں پر تنقید ایک بار پھر جاری ہو چکی تھی۔

جس کو سُننے کے سِوا میر آہل کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ دونوں ایک بار پھر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چاند کی روشنی تلے ٹریک پر واک کرتے کرتے آگے نکل گئے۔

آج اتوار کا دن تھا اور میر آہل ایک شریف فیملی مین کی طرح اپنی چھٹی کا دن گھر پر اپنی بیگم کے پکے پکوان کو انجوائے کرتے ہوئے گزارتا تھا۔

آج برمنگھم کا موسم میر آہل کے مزاج کی طرح خوشگوار تھا۔

وہ ٹیرس گارڈن پر موجود کرسی پر ٹانگ پر ناٹک چڑھائے بیٹھا اخبار پڑھتے ہوئے اپنی کافی انجوائے کر رہا تھا۔ جو ابھی پانچ منٹ پہلے دل آویز اُسے تھما کر گئی تھی۔

پھولوں سے اُٹھتی بھینی بھینی خوشبو اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اس کے وجود کو تازگی کا احساس بخش رہی تھی۔ اس نے ایک نظر سر اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا۔ آج آسمان بھی کافی صاف دِکھائی دے رہا تھا۔ شاید بارش ہونے والی تھی۔ اُس نے تازہ دم ہوا اپنے پھیپھڑوں میں اُتاری۔

اللہ اپنے بندوں کے اچھے اعمال کا صِلاح دُگنا کر کے لوٹاتا ہے۔ وہ ایسے ایسے وسائل پیدا کرتا ہے کہ انسان حیران ہو جاتا ہے۔ ضرورت پڑے تو سمندر کا سینہ تک چاک کر دیتا ہے۔

یہاں ساری بات گھوم پھیر کر نصیب پر آ کے ٹھہر جاتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کوئی کبھی کسی کے نصیب کا چُرا نہیں سکا اور جس نے ایسا کرنے کی کوشش کی وہ نست و نابود ہوا ہے۔ اللہ سے بہتر نصیبوں کے یہ کھیل کون کھیل سکتا ہے۔

اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے نصیب میں دل آویز جیسی نیک عورت لکھی جائے گی۔ جو اُس کی زندگی کو خوشحالی اور سکون سے بھر دے گی۔ میر آہل کبھی اپنی کھلی ہتھیلیوں کو گھورتا تو لاجواب ہو جاتا۔ وہ اُسے کس نیکی کے بدلے میں دی گئی تھی۔

وہ کوئی نمازی یہ بہت بڑا پارسا تو نہیں تھا۔ اُس نے حج اور عُمرے نہیں کئے تھے۔ اس نے اتنی شدت سے نمازیں نہیں پڑھیں تھیں۔ جس سے خوش ہو کر اللہ نے اُسے اتنا سب عطا کر دیا تھا۔ وہ تو بہت خالی سا انسان تھا۔ جس کے سینے میں ہر دم تکلیفوں کا بازار گرم رہتا تھا۔ مگر اب اُن تکلیفوں کی جگہ سکون نے لے لی تھی۔

کچھ لوگوں کے پاس دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے۔ ان کی زندگی میں ہنسنے کے بہت سے مواقع موجود ہوتے ہیں۔ اُنہیں دنیا میں ہی سارے سُکھ، عیش و آرام عطا ہوتا ہے۔ ان کی زندگیوں میں مسائل نہیں آتے، انہیں غربت نہیں مارتی۔

وہ ایک آئیڈیل زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ ان کا خدا ان سے بہت خوش ہے۔ اس لئے اپنی نعمتیں ان پر نچھاور کر رہا ہے۔ مگر ایسے لوگوں کے دل ہمیشہ خالی اور دُکھی رہتے ہیں۔ ان کے پاس دنیا کی ہر آسائش ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی وہ بے چین رہتے ہیں۔ ان کا دل بے آرام رہتا ہے۔ یہ وہی لوگ ہوتے ہیں۔ جن سے در حقیقت اللہ اپنا منہ موڑ لیتا ہے۔

یقین مانیں اگر مشکل اور تکلیف میں بھی آپ کا دل مطمئن اور سکون میں ہے تو آپ کا رب آپ سے راضی ہے۔ میر آہل کا دل اب ہر حال میں مطمئن رہتا تھا۔

اب بزنس کے اُتار چڑھاؤ یہ ماضی کی تلخ یادیں اس کے دل کے سکون کو برباد نہیں کرتی تھیں۔ شاید اُس کا رب اس سے راضی ہو گیا تھا۔

یکدم آسمان نے اپنا رنگ بدلا اور ہلکی ہلکی گھٹا کے ساتھ آسمان سے ابر رحمت برسنا شروع ہو گئی۔ اس نے مسکرا کر ارد گرد دیکھا۔۔۔ پھول پتے دُھل کر چمکنے لگے تھے۔ اخبار اور اس کے کپڑے پوری طرح سے گیلے ہو گئے تھے۔

کافی کا مگ جس میں آدھی کافی اب بھی موجود تھی۔ پانی سے بھر چُکا تھا۔ وہ چلتا چلتا ریلنگ تک آیا اور آنکھ بند کر کے اپنے وجود پر گرتی پانی کی بوندوں کو محسوس کرنے لگا۔

میر آہل ٹیرس کے بائیں جانب کھڑا تھا۔ جہاں سے سوئمنگ پول اور باقی کا آدھا گارڈن دکھائی دیتا تھا۔ وہاں بڑے درخت کے سائے تلے ایک لکڑی کا ڈائننگ ٹیبل رکھا ہوا تھا۔ کیونکہ کچن کا ایک دروازہ سوئمنگ ایریا کی جانب کُھلتا تھا۔

اُس کے لبوں پر مسرت بخش مسکراہٹ تھی۔ اس نے آہستگی سے آنکھیں کھول کر نیچے دیکھا اور اس کی آنکھوں کی پتلیاں وہی ساکت ہو گئیں۔

وہ اپسرا تھی، پری تھی، یہ کوئی حور تھی۔ جو اُسے زمین پر ہی مل گئی تھی۔

میر آہل نے اُسے سفید شیفون کی سادھی سی فراک میں آسمان کی جانب آنکھ بند کئے۔ دونوں بانہیں ہوا میں بچوں کی طرح پھیلائے۔ بارش میں ایڑیوں کے بل گول گول گھومتے ہوئے دیکھا۔

"Why so beautiful?" وہ زیر لب بڑبڑایا۔ میر آہل اپنی نگاہیں بارش میں بھیگتی اس خوبصورت لڑکی کے سراپے سے ہٹا نہیں پایا تھا۔

"میں اس لڑکی سے بہت۔۔۔۔ موحب۔۔۔۔"

اس نے اپنے دل کو خاموش کروا دیا۔ اس وقت میر آہل کا دل کچھ بھی کہنے یہ سننے کی کیفیت میں نہیں تھا۔ وہ اس کے لئے اپنی جان دے سکتا تھا۔ مگر پھر بھی اُس کا دل اظہار کے دو بول بولنے سے کترا رہا تھا۔ یوں جیسے وہ اُس کے دل کے حال سے ناواقف تھی۔ یوں جیسے یہ بات جان لینے کے بعد وہ اس کی محبت کو ٹُھکرا دیتی۔

اُس نے اپنا ہاتھ اپنے دل کے مقام پر رکھ کر اپنی دھڑکن محسوس کی۔ وہ جب بھی اُسے دیکھتا تھا۔ میر آہل کا دل اِسی طرح دھڑکتا تھا۔

اور اس نے ایک ایسی ہی زندگی کا تو تصور کیا تھا۔ جہاں نفرت اور بے سکونی کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہیں تھا۔

دل آویز کی آنکھیں بند تھیں مگر اُس نے میر آہل کی نظروں کی تپش اپنے بھیگے وجود پر محسوس کر لی تھی۔ اس نے رُک کر ایک ہاتھ سے آنکھ پر بارش کے قطروں سے بچنے کے لئے چھجا بنا کر اوپر میر آہل کو دیکھا۔ جو تند مزاجی سے اپنا ہاتھ اپنے دل پر رکھے اُسے پوری توجہ سے دیکھ رہا تھا۔

وہ جھینپ گئی۔ میر آہل کی نظریں اُسے ہمیشہ بے قرار کر دیا کرتی تھیں۔ وہ بھاگ کر فوراً کچن میں گُھس گئی۔ اس کے بال اور کپڑوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ جس کی وجہ سے فلور بھیگ رہا تھا۔

وہ کاؤنٹر کے نزدیک آئی اور باؤل اپنی جانب کھسکایا جس میں اس نے سوکھا بیسن نکال کر رکھا تھا۔ اُسے اندازہ تھا کہ بارش ہو سکتی ہے۔ اس لئے وہ کچن میں پکوڑے بنانے کی تیاری پہلے سے کر رہی تھی۔

اس نے پانی کا جگ اٹھایا اور بیسن میں پانی ڈالنے لگی۔ جب میر آہل کچن میں داخل ہوا۔

اس نے گرے کلر کا ٹراؤزر اور سیاہ رنگ کی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ جس کے اوپر کے دو بٹن کھلے ہوئے تھے۔ بال بکھرے ہوئے سے ماتھے پر گرے تھے۔ وہ کچن کاؤنٹر کی دوسری جانب کھڑا تھا۔

دل آویز اُس کی نظروں کا ارتکاز سمجھتے ہوئے ایک قدم پیچھے ہوئی مگر میر آہل کی جذبات سے لبریز آنکھوں نے اُس کے قدم زنجیر کئے۔

باہر بارش زور و شور سے برس رہی تھی۔ اور اس بارش میں دل آویز کا وجود پانی پانی ہو گیا تھا۔ میر آہل نے جگ سے پانی اُنڈیل کر بیسن میں ڈالا اور ایک نظر دل آویز کے جُھکے چہرے کو دیکھا۔۔۔

"آئی نِیڈ ہیلپ۔۔۔"

میر آہل نے دوسرا ہاتھ دل آویز کی جانب بڑھایا اور دل آویز نے بلا توقف اس کے مضبوط ہاتھ میں اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ دنیا میں سب سے محفوظ کوئی جگہ تھی تو وہ میر آہل کا دل تھا۔

ہوا میں گیلی مٹی کی خوشبو چار سُو پھیل چکی تھی۔ گلاس ڈور سے باہر نظر ڈالو تو بارش کی تیزی میں کمی آچکی تھی۔

نرم اور آرام دہ ایڈ جسٹبل کاؤچ پر وہ دونوں سکون سے ایک دوسرے کے پہلو میں نیم دراز تھے۔ دل آویز نے اپنا سر میر آہل کے کسرتی بازوں پر ٹکا رکھا تھا۔

وہ دونوں مووی دیکھ رہے تھے اور ساتھ ساتھ چائے اور مکس پکوڑوں اور سموسوں پر بھی ہاتھ صاف کر رہے تھے۔

بظاہر دل آویز کی نظریں سامنے اسکرین پر جمی تھیں۔ مگر ذہن نجانے کن سوچوں میں غلطاں تھا۔ میر آہل نے اس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے نظر ترچھی کر کے اس کے صبیح چہرے کو دیکھا تو اس نے نظر اٹھا کر آہل کی جانب دیکھا اور ہلکا سا مُسکرائی۔

"آپ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے تھے نہ"

اس نے بے مقصد ہی پوچھ لیا۔

"ہاں تب میرا دماغ خراب تھا جو میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بٹ تھینکس ٹُو بی جان "اُس نے جُھک کر دل آویز کی ٹھوڑی کو چُوما۔

"اُس رات آپ کے اور بی جان کے درمیان کیا گفتگو ہوئی تھی آہل" وہ پاؤں زمین پر رکھ کر سیدھی ہوئی۔

"کس رات؟"

وہ اب بھی نیم دراز اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔

"بی جان کے انتقال کے ایک رات پہلے"

اور میر آہل کو لگا اس کی سانسوں کے ساتھ دنیا بھی ساکت ہو گئی ہے۔ وہ ہنوز اسکرین کو گھورتا رہا اور دل آویز۔۔۔ میر آہل کو۔

وہ بظاہر پر سکون نظر آرہا تھا۔ مگر آہل کے سپاٹ چہرے پر لاکھوں ان کہی داستانیں رقم ہو گئی تھیں۔

"بی جان کو آپ سے کیا بات کرنی تھی آہل"

وہ گردن موڑے اُس سے سوال کر رہی تھی مگر مقابل اُسے نہیں بلکہ کچھ اور ہی دیکھ رہا تھا۔

شاید اندھیرے میں گُم ہوتے کسی کے سائے کو یہ پھر خون میں رنگی ان لاشوں کو جنہیں اُس نے خود دفنایا تھا۔

"میں آپ سے کچھ پوچھ رہی ہوں اور آپ کو مووی دیکھنے سے فرصت نہیں ہے"

اس کی خاموشی اور لاعلمی اُسے زچ کر رہی تھی۔

میر آہل نے پاس رکھی اسنیکس کی ٹرے کو دور کھسکایا اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے دل آویز کے قریب آیا وہ کاؤچ کے کنارے پر ٹک کے بیٹھی ہوئی تھی۔

"آہل۔۔۔"

وہ مزید کچھ بولنے لگی تھی مگر میر آہل نے خاموشی سے اپنا سر اس کی گود میں رکھا اور کی ہتھیلی میں منہ چھپا لیا۔ دل آویز اُسے سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اُسے اپنی ہتھیلی پر گرم پانی کی بوندیں پھسلتی محسوس ہوئیں۔

وہ یکدم حیران ہوئی اور مزید کچھ کہے بغیر دل آویز نے اُسے اپنے حصار میں قید کیا۔ میر آہل کو اضطراب میں دیکھ کر اس کا دل و دماغ سُن ہو گیا تھا۔ آہل کی بے چینی کے آگے دل آویز نے ہتھیار ڈال دیئے۔

بارش ایک بار پھر جم کر برسنے لگی۔ ہوا میں ہچکولے کھاتی، پھول اور پودوں سے ٹکرا کر زمین پر گرتی بوندوں کا شور۔۔۔ شیشے کی مضبوط دروازے کے باہر ہی دم توڑ رہی تھیں۔

ایسے ہی بہت سے شور انسان کے اندر ہی دم توڑ دیتے ہیں۔ اِنہیں باہر آنے کا راستہ دینا چاہئے ورنہ سماعتیں بیکار ہو جاتی ہیں۔ پھر ہم وہ آوازیں بھی سننے سے قاصر ہو جاتے ہیں۔ جو دل ہمیں دیتا ہے۔

☆...☆...☆

میر خلیل اب پہلے سے بھی زیادہ بیمار اور بوڑھے نظر آنے لگے تھے۔ خالی حویلی کی دیواریں اُنہیں کاٹنے لگی تھیں۔ گھر والوں کے نام پر محض ان کے ملازم ہی تھے۔ جو ان کا خیال رکھتے تھے۔ ان کا دل بہلانے کے لئے انہیں باتوں میں مصروف رکھتے تھے۔

کریم ویسا ہی تھا جیسے پہلے تھا۔ اپنی ماں کی موت بھی اس کے لئے صدمے کا باعث نہ بن سکی۔ اس کی سرگرمیوں میں سر منہ فرق نہیں آیا۔

وہ ہال میں اپنی مخصوص لکڑی کی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور فیملی ایلبم اپنی گود میں کھول رکھا تھا۔ گھر چیزوں یہ آسائشوں سے نہیں گھر والوں سے بنتا ہے۔ اس بات کا احساس انہیں اب ہو رہا تھا۔

زندگی کے بھی سبق سکھانے کے اپنے اپنے تریقے ہوتے ہیں۔

"میر سرکار آپ چھوٹے میر کو اس صورتحال سے آگاہ کیوں نہیں کرتے"

جلالی زمین کے کچھ کاغذات پر دستخط لینے حویلی آیا تھا اور میر خلیل کو اس طرح اداس اور تنہا دیکھ کر اس کے ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔

"میں نے اس کے ساتھ پہلے ہی بہت غلط کیا ہے جلالی اب کس منہ سے اُس سے بات کروں"

انہوں نے بی جان کے بغل میں کھڑے آہل کی تصویر پر انگلی پھیرتے ہوئے اداسی سے کہا۔

"وہ آپ کا اپنا خون ہے میر سرکار"

"مگر جلالی"

میر خلیل کی آنکھوں میں خدشہ تھا۔ ان کی گردن میں گلٹی اُبھر کر معدوم ہوئی۔۔

انہوں نے ٹیبل پر رکھے لینڈ لائن کی جانب نظریں پھیریں۔

"بات کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے سرکار اور اس وقت آپ کو کسی اپنے کی ضرورت ہے۔ کم از کم آپ کا دل ہلکا ہو جائے گا"

جلالی کی بات نے میر خلیل کو کافی حوصلہ دیا تھا۔

دل آویز بے نیاز کاؤچ پر اُس کے پہلو میں لیٹی سو رہی تھی۔ اور میر آہل اُس کے چہرے کو خالی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ اُن حقیقتوں سے پردہ اٹھائے۔ جن کا ڈھکے رہنا ہی دل آویز کے لئے اچھا تھا۔

اگر اللہ کو اس راز سے پردہ اُٹھانا ہوتا تو دس سال پہلے ہی اُٹھا چُکا ہوتا۔ مگر جن رازوں کا پردہ اللہ رکھ لیتا ہے۔ پھر وہ راز قبر تک حجاب میں جاتے ہیں۔

روز محشر بھی خدا اُن رازوں کی گفتگو اپنے بندے سے حجاب میں کرتا ہے۔

وہ اللہ اور اس کے بندے کا معاملہ ہے۔ ان معاملات میں کسی دوسرے کا کوئی عمل دخل نہیں۔

وہ اُٹھ کر سلائیڈ ڈور کے سامنے ٹراوز کی جیب میں دونوں ہاتھ مُقید کئے باہر پھولوں پر ٹھہرے شبنم کے قطروں کو خوشمگین نظروں سے گھورنے لگا۔

اُسی وقت اس کی جیب میں موجود سیل فون جو وائبریشن موڈ پر تھا۔ وائبریٹ کرنے لگتا ہے۔

اس نے سر جھٹکتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل فون نکالا اور اسکرین پر چمکتا نمبر دیکھ کر حیران ہو گیا۔ کیونکہ جب سے دل آویز یہاں آئی تھی۔ یہ میر خلیل کی پہلی کال تھی جو آہل کے نمبر پر آئی تھی۔۔۔ ورنہ دل آویز سے تو اُنکی پہلے بھی چار سے پانچ دفع بات ہو چکی تھی۔ مگر میر آہل سے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

اُس نے بھاری دل کے ساتھ تھوک نگلتے ہوئے یس کا بٹن دبایا اور فون کو کان پر لگایا مگر کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔

دوسری جانب سے بھی مکمل سناٹا تھا۔ اگر کوئی محو گفتگو تھی تو وہ اُن دونوں کی خاموشی تھی۔ چند لمحے ہوا کی نظر ہو گئے۔

آہل۔۔۔ میر خلیل کی بوجھل سانسیں سُن سکتا تھا۔ یکدم ہی اس کا دل عجیب ہو گیا۔

"آہل"

اتنی بے بسی سے آج تک اُسے کسی نے نہیں پُکارا تھا۔

"جی"

اس کے منہ سے لفظ چاچو نہیں نکلا تھا۔ میر خلیل نے گہری سانس حلق سے خارج کی۔

"بیٹے۔۔۔ تیری چاچی اور ریما"

وہ اپنی روداد سناتے رہے اور میر آہل وہاں برف کا مجسمہ بنے سُنتا رہا۔ اِس دوران میر خلیل بہت بار ٹوٹے، ان کے الفاظ ڈگمگائے۔ لفظوں نے ساتھ چھوڑا مگر وہ خاموش نہیں ہوئے۔۔۔ دل کے تمام چھالے پھاڑتے گئے اور میر آہل نے ایک بار بھی اُنہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔

ایک وقت تھا جب وہ تنہا تھا اور میر خلیل نے اُسے مزید تنہا کر دیا تھا۔ اور ایک آج کا وقت تھا جب وہ تنہا تھے۔ مگر میر آہل نے اُنہیں تنہا نہیں کیا تھا۔

کچھ دیر بعد کال منقطع ہوئی تو وہ خالی نظروں سے ناجانے کتنی دیر تک موبائل اسکرین کو گھورتا رہا تھا۔

دل آویز کی پکار نے اسے دوبارہ زندگی کی جانب متوجہ کیا۔

اس نے پلٹ کر دل آویز کی جانب دیکھا وہ نیم غنودگی میں اُسے پکار رہی تھی۔ اس نے موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور اس کے پاس کاؤچ پر جا کر بیٹھ گیا۔

دل آویز کی پشت میر آہل کی جانب تھی۔ آہل نے محبت سے اس کے سلکی بالوں میں اپنی انگلیاں پھیریں تو دل آویز نے کروٹ بدلی۔

"کیا ہوا آہل آپ ڈسٹرب نظر آرہے ہیں؟"

اس نے ہلکی سی آنکھیں وا کر کے اُسے دیکھا۔

"اونہوں"

اس نے نفی میں سر ہلایا

"مجھے آج تم پر بہت پیار آرہا ہے"

وہ خوشمگین انداز میں مسکرایا تو وہ بھی مسکرائی

"لگتا ہے ٹھنڈ آپ کے دماغ کو لگ گئی ہے"

وہ ذرا سا سمٹی

"ہمم۔۔۔ ٹھنڈ تو لگ رہی ہے"

مسکراتے ہوئے اپنی پیشانی دل آویز کی پیشانی سے لگائی۔

"سب کہتے ہیں اب میں پہلے جیسا نہیں رہا"

وہ دوبارہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا

"دُرست کہتے ہیں"

وہ اس کی بات سمجھ گئی تھی۔

"ویسے کیا کہتے ہیں آپ کو سب"

دل آویز نے محض اُسے چھیڑنے کی غرض سے پوچھا۔

"یہی کہ میر آہل رن مُرید ہو گیا ہے"

وہ ہنس پڑی

☆...☆...☆

اینا اورنگزیب نے اپنا حال پاگلوں سے بھی زیادہ بدتر کر لیا تھا۔ کوئی بھی اُسے دیکھتا تو دیوانہ سمجھتا۔ پتا نہیں یہ کونسی محبت تھی۔ جس نے اس کا اور اس کے ارد گرد کے تمام لوگوں کا جینا مُحال کر دیا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں زمین پر چِت لیٹی ہوئی تھی۔

دونوں ٹانگوں کو کینچی کی صورت بیڈ پر ٹکا رکھا تھا۔ وہ خاموشی سے بس چھت کو گھورتی جا رہی تھی۔ جب اورنگزیب عالمگیر کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آئے۔ ان سے اپنی بیٹی کی یہ حالت دیکھی نہیں گئی۔

"یہ کیا حال بنالیا ہے تم نے اپنا"

وہ گھٹنوں کے بل اینا کے سر کے پاس بیٹھتے ہوئے بولے۔ مگر آگے سے کوئی جواب نہیں آیا۔

"اینا"

انہوں نے اس کے بکھرے بالوں میں شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اُسے پُچکارا۔

"آہل"

اس نے سِسک کر کہا

"مجھے آہل چاہئے ڈیڈ"

آنسوں کا قطرہ اینا کی آنکھ کے کنارے سے بہہ رہا تھا اورنگزیب عالمگیر کے حلق سے دل برداشتہ سی سانس خارج ہوئی۔

"وہ شادی شُدہ ہے اینا"

وہ فوراً سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"پلیز ڈیڈ آپ اس سے بات کریں وہ مان جائے گا"

اس نے بے بسی سے اپنے باپ کے دونوں ہاتھوں کو تھام کر کہا۔

"وہ نہیں مانے گا اینا پلیز"

انہوں نے مزاحمت کی

"آ۔۔ آپ۔۔ اپنی بیٹی کے لئے میر آہل سے بات نہیں کر سکتے ڈیڈ۔۔ پ۔۔ پلیز ڈیڈ میں آپ کے پاؤں پکڑتی ہوں"

اینا نے دیوانہ وار اُن کے پاؤں کو چُھوا تو وہ پیچھے کو کھسکے۔

"بیٹا ضد مت کرو وہ تمہارا نہیں ہو سکتا"

انہوں نے اُسے آج سے پہلے ایسی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ کسی بھی باپ کے لئے اپنی اولاد کو ایسی حالت میں دیکھنا اذیت ناک تھا۔

"ہو سکتا ہے ڈیڈ آپ ایک بار کوشش تو کریں۔۔۔ م۔۔ میں۔۔ آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں پلیز مجھے آہل لا دیں۔۔۔ پلیز ورنہ میں مر جاؤں گی ڈیڈ"

وہ اپنا سر اورنگزیب کے ہاتھوں پر ٹکا کے چیخ چیخ کر رونے لگی۔

"اگر وہ مجھے نہیں مِلا تو میں مر جاؤں گی۔۔۔ کیا آپ اپنی بیٹی کو مرتا ہوا دیکھ سکے گے"

وہ روتے روتے سوال کر رہی تھی۔ اور وہ بے بسی سے اینا کو دیکھ رہے تھے۔

وہ اُسے کیسے سمجھاتے کہ اس بار وہ ضِد کسی چیز کی نہیں ایک انسان کی کر رہی تھی۔

"اگر آہل مجھے مل گیا نہ ڈیڈ تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ پھر میں کبھی آپ کو کسی بھی چیز کے لئے پریشان نہیں کروں گی۔۔۔پرامس"

وہ چھوٹے بچوں کی طرح اپنے باپ کو آہل سے بات کرنے کے لئے منا رہی تھی۔

"میں اپنا لائف سٹائل بلکل بدل دوں گی پلز ڈیڈ پلیز"

وہ اپنا آپا کھونے لگی تو اورنگزیب نے گھبرا کر ہتھیار ڈال دیئے۔

"ٹھیک ہے۔۔۔میں اُس سے بات کروں گا"

اینا کا وجود ساکت ہوا۔

"آپ بات کریں گے آہل سے؟"

اُس نے نقاہت سے اورنگزیب کی آنکھوں میں دیکھا۔

"ہاں میری جان میں بات کروں گا آہل سے"

وہ بے بسی سے بولے۔

"پرامس"

اینا یقین دہانی چاہتی تھی اور ایسا کرتے ہوئے اُس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔

"پرامس ہنی پرامس"

یہ سن کر اینا کی تڑپ کو قرار سا آیا وہ نڈھال سی باپ کے بازوؤں میں گری تھی۔

"میں وعدہ کرتا ہوں اپنی بیٹی سے میں میر آہل سے بات کروں گا۔اُسے منانے کی پوری کوشش کروں گا۔ اپنی بیٹی کے لئے مجھے اپنا جو کچھ بھی داؤ پر لگانا پڑے۔۔۔میں لگاؤں گا"

وہ اینا کا چہرہ اپنے سینے سے لگائے۔اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے قرب سے بول رہے تھے۔اور اینا کی بوجھل پلکیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگی تھیں۔

میر آہل اورنگزیب عالمگیر کو اپنے آفس میں دیکھ کر چونکا تھا۔

"خیریت مسٹر عالمگیر کونسی ضرورت آپ کو یہاں کھینچ لائی" وہ سیدھا ہوتے ہوئے بولا جبکہ اورنگزیب عالمگیر اب بھی ٹیبل سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔ وہ ایک مضبوط شخصیت کے مالک تھے۔ مگر اس وقت وہ کافی پریشان اور بوجھل سے دکھائی دے رہے تھے۔

"میں اس بات سے انکار نہیں کروں گا کہ مجھے یہاں میری ضرورت ہی کھینچ لائی ہے یہ پھر شاید مجبوری"

وہ اپنے کوٹ کا بٹن کھولتے ہوئے آہل کے بلمقابل کرسی پر بیٹھے۔ اور آہل کی بھنویں تن گئیں۔

"میں سُن رہا ہوں"

وہ دونوں کہنیاں کرسی کے بازوؤں پر ٹکا کر پیچھے ٹیک لگاتے ہوئے بولا تو اورنگزیب نے آہستگی سے گلا کھنکارا

"میں یہاں تم سے اینا کے حوالے سے بات کرنے آیا ہوں"

اینا کا نام سنتے ہی آہل کے ماتھے پر شکن پڑ گئے۔

"میں جانتا ہوں میرا اس طرح سے تمہارے آفس میں آکر اپنی بیٹی کے حوالے سے بات کرنا غلط ہے ۔۔۔۔ سراسر ان پروفیشنل ہے مگر میری بیٹی نے مجھے مجبور کر دیا ہے"

انہوں نے گہری سانس لی اور آہل نے پہلو بدلا۔ اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اورنگزیب کیا بات کرنے آئے تھے۔

"آپ اچھے سے جانتے ہیں کہ میں ایک شادی شدہ مرد ہوں پھر بھی آپ مجھ سے اپنی بیٹی کی بات کر رہے ہیں" اُسے اورنگزیب عالمگیر کی جرأت پر حیرت ہو رہی تھی۔

"میں سب جانتا ہوں آہل۔۔۔ دیکھو اگر تم چاہو تو یہ سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہاری شادی کن حالات میں ہوئی تھی۔ یہ تو تمہارا بڑا پن ہے کہ تم نے ایک ایسی عورت کو اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے جو تمہاری پسند نہیں ہے بلکہ زبردستی تم پر تھوپی گئی ہے"

اورنگزیب کی بات پر میر آہل کے جبڑے بھینچ گئے مگر وہ چُپ چاپ خاموشی سے ان کی بات سُنتا رہا۔

"تمہیں جو چاہئے میں تمہیں دوں گا۔ یہ سب اینا کا ہی تو ہے۔ تم بھلے اپنی بیوی کو مت چھوڑنا بلکہ میں اپنی کچھ پراپرٹیز تمہاری بیوی کے نام بھی کر دوں گا۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہئے ہو گا۔ اُس معمولی سی لڑکی کو۔۔۔۔"

میر آہل نے ضبط سے مُٹھیاں بھینچی۔

"تو آپ مجھ سے اپنی بیٹی کی زندگی میں شامل ہونے کے لئے ڈیل کرنے آئے ہیں"

اس نے اپنا لہجہ سرسری بناتے ہوئے کہا۔

اورنگزیب۔۔۔میر آہل کے تاثرات پر دھیان دیئے بغیر اپنی گفتگو جاری رکھے ہوئے تھے۔

"تمہیں کہاں ملے گی ایسی عورت جو تم پر اپنا سب کچھ قربان کرنے پر راضی ہے۔اینا اورنگزیب۔۔۔۔"

وہ ٹیبل پر دونوں ہاتھ باہم ملاتے ہوئے ذراسا آگے کو جُھکے

"برمنگھم کے دس ملینیئر میں سے ایک کی بیٹی ہے۔وہ جس پر بھی انگلی رکھے گی۔وہ اس کے قدموں پر نثار ہونے کے لئے تیار ہو جائے گا۔

مگر پھر بھی اس نے تمہیں پسند کیا۔اس کے جذبات کی قدر کرو میر آہل"

اُنہوں نے اُمید بھری نظروں سے آہل کے سپاٹ چہرے کو دیکھا۔جو آنکھوں کی پتلیاں سکوڑے اورنگزیب کو خاموش نظروں سے دیکھ رہا تھا۔اس خاموشی میں بلا کی سختی تھی۔۔۔خوف تھا۔

"آئی ہوپ میری بات تمہیں بری نہیں لگی ہو گی"

اورنگزیب عالمگیر نے اس کی خاموشی کو محسوس کر کے تُھوک نگلتے ہوئے فوراً اپنے لہجے کی تصیح کی۔

آہل خاموشی سے مُسکرایا مگر یہ بات محض آہل ہی جانتا تھا کہ اس مسکراہٹ میں سامنے بیٹھے شخص کے لئے کتنی نفرت تھی۔

یہ موقع محل نہیں تھا ورنہ میر آہل، اورنگزیب عالمگیر کے ایک ایک لفظ کا حساب سود سمیت واپس دیتا جو بھی انہوں نے میر آہل کی بیوی کے لئے کہے تھے۔

"اِس ویکنڈ اینا کی برتھ ڈے ہے۔جس کی خوشی میں۔۔۔میں بہت بڑی پارٹی دے رہا ہوں۔تم اگر پارٹی میں آئے تو میں سمجھ جاؤں گا کہ تم نے میری بات مان لی ہے" وہ مسکرائے مگر آہل نہیں مُسکرایا۔

"اور مجھے پورا یقین ہے کہ تم اس پارٹی میں ضرور شرکت کرو گے" وہ کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔

میر آہل بھی اپنی پاور سیٹ سے کھڑا ہو گیا۔

انہوں نے اپنی کوٹ کا بٹن مقفل کرتے ہوئے۔ مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا جسے کچھ لمحے میر آہل خاموشی سے دیکھتا رہا۔

اورنگزیب کشمکش کی کیفیت میں اُسے دیکھتے رہے۔ اُنہیں یہ رد عمل عجیب لگا تھا۔ پھر آہل نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے۔ ان کے انتظار کرتے ہاتھ کو تھاما تو ان کی جان میں جان آئی۔

اورنگزیب عالمگیر متاثر کن انداز میں مسکرائے۔ ان کے آفس سے نکلتے ہی میر آہل کے چہرے پر نمودار تاثرات سخت ہو گئے تھے۔

"ڈیڈ آپ کی آہل سے کیا بات ہوئی"

ابھی وہ گھر میں ٹھیک سے داخل بھی نہیں ہوئے تھے اور اینا دیوانوں کی طرح ان پر لپکی تھی۔

"ہنی۔۔۔ اندر تو آنے دو اپنے ڈیڈ کو"

وہ ٹائی ڈھیلی کرتے ہوئے مسکرائے۔

"پلیز ڈیڈ اور سسپینس مت بڑھائیں"

وہ مصنوعی ناراضگی سے بولی تو انہوں نے معنی خیز نظروں سے اینا کے چہرے کو دیکھا۔ اور اینا نے غور سے ان کے چہرے پر رقم تاثرات کو سمجھنے کی کوشش کی۔

"ڈیڈ کیا آہل نے منع کر دیا؟"

اس نے اپنے دل میں ابھرتے خدشے کو ظاہر کیا۔

"نہیں"

وہ مسکرائے اور اینا کے چہرے کے تاثرات یکسر بدلے

"لیکن"

انہوں نے سانس لینے کا وقفہ لیا

"آہل ایک کامیاب اور سمجھدار بزنس مین ہے۔ وہ اتنی بہترین آفر ٹھکرائے گا بھی نہیں"

انہوں نے نظریں اینا کے چہرے پر جمائیں۔ اس کی شکل پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔

"اس کا مطلب"

اینا کی آواز میں حیرت اور خوشی دونوں شامل تھی۔

"یس سویٹ ہارٹ۔۔۔۔"

انہوں نے اس کا سرخ چہرہ اپنی ہتھیلیوں میں لیتے ہوئے اس کے گمان کو حقیقت کے پیکر میں بدلا۔

"ڈیڈ"

جن آنکھوں میں کچھ لمحے پہلے حیرت تھی۔ اب وہ جگہ خوشی نے لے لی تھی۔ اس کی آنکھیں چمکی اور وہ پرجوشی سے باپ کے سینے سے لگ گئی۔

"آئی لو یو ڈیڈ"

وہ ان کے گال چومتے ہوئے خوشی سے چیخی تو وہ ہنسنے لگے۔

"لو یو ٹو مائے ہارٹ۔۔۔ میری بیٹی کا برتھ ڈے ہے اور یہ تحفہ میری طرف سے "انہوں نے اس کی پیشانی چُومی۔

"یہ میری زندگی کا بیسٹ برتھ ڈے گفٹ ہے ڈیڈ۔۔۔۔۔۔ تھیک یو سو سووووو مچ"

وہ ایڑیوں کے بل بچوں کی طرح گھومتے ہوئے خوشی سے بولی۔

"اب جاو اور اپنے برتھ ڈے کی تیاری کرو"

وہ اس کے گال کو نرمی سے چھوتے ہوئے بولے۔

"یس یس۔۔۔ میں اپنے اسپیشل ڈے پر سب سے زیادہ اسپیشل دِکھنا چاہتی ہوں" وہ چہکتے ہوئے بولی۔

اینا اورنگزیب کی پچیسویں سالگرہ واقعی اسپیشل ہونے والی تھی۔ کیونکہ شاید دو دن بعد میر آہل اپنی بیوی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھو دینے والا تھا۔

☆...☆...☆

میر آہل کا ایک ہزار یارڈ پر پھیلا مینشن آج دھوپ میں چمک رہا تھا۔ گزشتہ دنوں بارش کی وجہ سے موسم خوش گوار ہو گیا تھا۔ اس لئے دھوپ کی شعاعیں چبھ نہیں رہی تھیں۔ آسمان پر چرند پرند چہچہا رہے تھے۔ ان کی چہچہاہٹ کانوں میں رس گھول رہی تھیں۔ اس گھر کے مکین آج اچھے مزاج میں تھے۔

میر آہل تھوڑی دیر پہلے ہی آفس سے آیا تھا۔ اور آتے ہی وہ اپنے کمرے میں فریش ہونے چلا گیا تھا۔ کیونکہ دن بھر کی مصروفیت نے اُسے تھکا کر رکھ دیا تھا۔

آج دل آویز بھی کافی ہلکے پھلکے اور خوشگوار مزاج میں تھی۔ کچن میں جھانک کر دیکھو تو دل آویز سیاہ رنگ کا ایپرن پہنی ہوئی تھی اور اپنے بالوں کو ڈھیلے جوڑے میں باندھا ہوا تھا۔ وہ آج کیک بنانے کی تیاری کر رہی تھی۔

اس نے تین انڈے ایک باؤل میں توڑ کر ڈالے اور اُسے چمچے سے پھینٹنے لگی۔

کام کرتے کرتے خیالوں نے خود بخود اُس کے ذہن کے تاریک حصے میں جگہ بنائی تو ایک پرانی یاد نے اس کے دل کے دروازوں پر آہستگی سے دستک دی اور دروازہ کُھلتا چلا گیا وہ کچھ یاد آنے پر مسکرانے لگی۔

("یہ کیک تم یقیناً میرے لئے بیک کر کے لائی ہو گی" الہان کی نیت بلیک فاریسٹ کیک کو دیکھ کر ڈگمگائی۔

"اب تمہاری شکل اتنی اچھی بھی نہیں ہے کہ تمہارے لئے اتنی محنت و مشقت کروں میں"

دل آویز نے تمسخر اڑایا۔

"میں نے یہ کیک جولی کے لئے بیک کیا ہے اُسے بہت پسند ہے بلیک فاریسٹ"

دل آویز نے الہان کے کیک کی جانب بڑھتے ہوئے ہاتھ پر زور سے چپٹ لگاتے ہوئے کہا۔

"یار دل آویز"

وہ تھوڑا قریب آیا۔

"وہ دیکھو پانی اس میں ڈوب کر مرنے کی کوشش کرو اگر ناکام ہو جاو تو فکر مت کرنا میں مدد کروں گا تمہاری اس نیک کام میں"

الہان ٹیبل پر رکھی پانی کی بوتل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا تو دل آویز نے گھور کر اُسے دیکھا۔

“s’il te plaît “

الہان نے ندیدے پن سے کیک کی جانب دیکھتے ہوئے ہاتھ جوڑے۔

"ہیں۔۔۔یہ کونسی زبان میں بات کر رہے ہو"

دل آویز چونکی۔

"فرینچ زبان میں"

کیک پر چاکلیٹ کی پرت دیکھ کر الہان کے منہ میں سیلاب آچُکا تھا۔ جس پر وہ بمشکل قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا ورنہ پورا برمنگھم اس سیلاب کی زد میں آجاتا۔

"واؤ تم فرینچ بھی بول لیتے ہو؟"

اس کی آنکھیں چمکی

"میں تو بنگالی اور سرائیکی بھی اچھے سے بول لیتا ہوں"

اس نے جواباً سڑا ہوا سا منہ بنایا

"پلیز الہان مجھے بھی کچھ سکھاؤ نہ"

دل آویز کی آنکھیں چمکی اور الہان کا منہ لٹکا

“je suis sorcière “

الہان نے سادگی سے مسکرا کر کہا

"اِس کا کیا مطلب ہے"

دل آویز نے پرجوشی سے سوال کیا۔

"اس۔ کا۔ مطلب۔ ہے۔"

وہ آہستگی سے کرسی سے اُٹھا۔۔۔اس کی نظر ابھی بھی کیک کے ڈبے پر تھی۔دل آویز اُسے غور سے ملاحظہ کرنے لگی۔

"اس کا مطلب ہے کہ۔۔۔۔۔۔میں ایک۔۔۔ڈائن ہوں"

اس نے ڈبے کو (پِٹ بُل) کی طرح ہاتھ سے دبوچا اور وہاں سے دُم دبا کر بھاگ گیا۔

"لعنت ہو تمہاری شکل پر الہان ڈِی سُوزا"

وہ پیچھے سے بُلند آواز میں چلائی تھی مگر وہ بھاگ چُکا تھا۔۔دل آویز اُسے بندروں کی طرح پھلانگتا ہوا دیکھ کر گردن پیچھے پھینک کر زور سے ہنسنے لگی تھی۔

"اُففففف اللہ۔۔۔کیا جوکر ہے یہ"

وہ کیک دراصل الہان کے لئے ہی لائی تھی۔ہنستے ہنستے اُس کی نظر الہان کے سامان پر گئی۔وہ اپنی کتاب اور ڈائری وہی ٹیبل پر چھوڑ گیا تھا۔اس نے ایک نظر اُس سمت دیکھا جہاں وہ غائب ہوا تھا۔دل آویز نے ہنستے ہوئے الہان کی بُھوری جِلد والی ڈائری اُٹھائی اور کچھ سوچتے ہوئے خاموشی سے اپنے بیگ میں رکھ لی۔

"اب بتاؤں گی اس کنکھجورے کو"

وہ ہونٹ آپس میں دباتے ہوئے شرارت سے مسکرائی تھی۔)

یکدم دل آویز کی ہنسی اُداسی میں تبدیل ہو گئی۔اس کا انڈے پھینٹنے والا ہاتھ اچانک سُست ہوا۔کھڑے کھڑے ہی اُس کا دل ہر احساس سے خالی ہو گیا تھا۔اس نے باؤل آگے کی جانب کھسکایا اور ایپرن اُتار کر کچن کیبنٹ میں واپس رکھ کے کمرے میں چلی آئی۔

کمرے میں میر آہل موجود نہیں تھا۔اس نے دیکھا بستر پر ایک باکس رکھا ہوا ہے۔جس پر پیلے رنگ کا اسٹکی نوٹ چپکا ہوا تھا۔

“For my gorgeous wife“

نوٹ پڑھتے ہی دل آویز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔اس نے باکس کھولا تو اندر ایک سیاہ رنگ کی ڈیزائنر میکسی تھی۔اس نے میکسی کو اٹھا کر سینے سے لگایا بلاشبہ یہ ایک بہت خوبصورت اور قیمتی ڈریس تھا۔

"کیسی لگی ڈریس مسز میر آہل؟"

میر آہل نے عقب سے اُسے اپنے حصار میں لیا تھا۔

"بہت اچھی ہے۔۔۔مگر اتنا پیار کس خوشی میں نچھاور کیا جارہا ہے"

دل آویز نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"ہمم۔۔۔ایک انویٹیشن ہے بس وہی جانا ہے"

"مگر میں جا کر کیا کروں گی؟"

وہ کچھ نروس ہوئی۔آج سے پہلے وہ کبھی میر آہل کے سوشل سرکل یا کسی بھی قسم کی پارٹی کا حصہ نہیں بنی تھی۔

"تم اس پارٹی کی چیف گیسٹ ہو میری جان۔۔۔تمہارے بغیر تو محفل پھیکی پھیکی لگے گی۔"

میر آہل نے خوشمگین انداز میں کہا تو دل آویز مسکرائی۔

"اچھا پر جانا کب ہے؟"

"کل"

اس نے دل آویز کا زاویہ اپنی جانب موڑا اور باری باری اس کی آنکھوں کو چوما۔اُسے دل آویز کی آنکھیں سحر انگیز لگتی تھیں۔کیونکہ جب پہلی بار اس نے دل آویز کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ایک دن وہ ان آنکھوں میں ڈوب جائے گا اور ویسا ہی ہوا۔اور اس لمحے میر آہل کے گمان میں بھی نہیں آیا تھا کہ یہ آنکھیں (جن میں اس کے لئے ہمیشہ محبت اور الفت کے رنگ دکھائی دیتے ہیں) ویران ہو جائے گیں۔یکدم صاف آسمان پر کالے بادلوں نے گھیر اتنگ کیا اور ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔

ٹیرس سے ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آرہے تھے۔جو وجود کو ٹھنڈک کا احساس بخش رہے تھے۔

"اونہوں۔۔۔یہ ٹھنڈی ہوائیں میرے رومانس میں خلل پیدا کر رہی ہیں"

وہ ہنسنے لگا تو دل آویز بھی ہنسنے لگی۔ اس نے آگے بڑھ کر سلائیڈ ڈور مقفل کیا اور پردے برابر کر دیئے۔

☆...☆...☆

میر آہل آج آفس نہیں گیا تھا۔ بلکہ وہ پورا دن گھر پر دل آویز کے ساتھ ہی تھا۔ رات کے سائے بڑھنے لگے تھے۔ وہ دونوں پارٹی میں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

دل آویز نے آہل کی دی ہوئی میکسی زیب تن کی تھی۔ اور اس لباس میں وہ انتہائی خوبصورت اور جاذب نظر لگ رہی تھی۔

اس نے ایک نگاہ اپنے تیار شدہ سراپے پر ڈالی تو خود بھی حیران رہ گئی۔ باقی سارے رنگ اپنی جگہ مگر کالے رنگ کی بات الگ تھی۔ اس نے اپنے لمبے بالوں کو کرل کر کے پُشت اور شانوں پر پھیلا دیا۔

جیولری کے نام پر دل آویز نے محض ڈائمنڈ کی وہ انگوٹھی پہنی ہوئی تھی۔ جو میر آہل نے اُسے سالگرہ پر تحفے کے طور پر دی تھی۔

اس نے بیڈ کے کنارے پر بیٹھ کر اپنی سیاہ ہائی ہیلز میں باری باری پاؤں ڈالے اور جھک کر انکے اسٹریپس کا ہُک لگانے لگی۔ دل آویز کی نظر میر آہل کے جوتوں پر پڑی اور اُس کی نظر نیچے سے اوپر اٹھی اور آہل کی آنکھوں پر جا کر ٹھہر گئی۔ میر آہل نے سیاہ ڈنر کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ بالوں کو جیل کی مدد سے ہمیشہ کی طرح دائیں جانب ٹکا رکھا تھا۔ چہرے پر نرم سی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

اس نے گلے میں سیاہ اور سفید رنگ کی چیک ٹائی پہنی ہوئی تھی۔ آہل نے ایک نگاہ اپنی کلائی میں بندھی رولیکس پر ڈالی اور پھر نظریں دل آویز کے چہرے پر ٹکا دیں۔

"کیا ہوا؟"

دل آویز نے اس کی نظروں کا تسلسل توڑا۔

"شاید میرا دماغ ہل گیا ہے"

اس نے ہاتھ کا مُکا بنا کر ہونٹوں پر رکھا۔

"کیوں؟"

وہ کنفیوژ ہوئی

"اس قدر حسین بیوی کو تو سب کی نظروں سے دور دل کے محفوظ حصے میں چھپا کر رکھنا چاہئے۔ اور میں تمہیں اپنے ساتھ پارٹی میں لیکر جا رہا ہوں"

وہ لب کاٹتے ہوئے بولا

"آہل"

وہ خوشمگین انداز میں مسکرائی

"آپ کو میرے پہلو میں دیکھ کر کسی کی اتنی ہمت نہیں ہو سکتی کہ وہ مجھے نظر بھر کر بھی دیکھیں"

اس نے آہل کی ٹائی کو ہلکا سا کستے ہوئے کہا تو وہ مسکرایا۔

"ہاں اگر میری نظر کسی پر چلی گئی تو وہ الگ معاملہ ہے" دل آویز دوبارہ جھک کر اپنی ہیلز کے اسٹریپس لگانے لگی۔

دو پل کی خاموشی۔۔۔۔

میر آہل اس کے قدموں میں پنجوں کے بل آہستگی سے بیٹھا۔

"کوشش کر کے دیکھ لینا ایک بار"

آہل نے اُس کی ہیلز کے اسٹریپس لگاتے ہوئے اپنے گھمبیر لہجے میں تند مزاجی سے کہا

"کیا کریں گے آپ؟"

دل آویز کا چہرہ جذبات کی شدت سے سرخ پڑنے لگا تھا۔

"میں اس شخص کے لہو سے پورے شہر کو رنگ دوں گا تمہاری قسم"

اس نے جھکی گردن کے ساتھ نظر اٹھا کر دل آویز کے چہرے کو دیکھا۔ اُسے ایسا لگا کہ دل سینہ توڑ کر باہر آ جائے گا۔ اس نے اپنے نچلے لب کو زور سے کاٹا۔

"اب چلیں ورنہ میں ارادہ بدل دوں گا"

اس کی آواز نے دل آویز کے ذہن پر چڑھتے خمار کو جھنجوڑا یکدم اس کے اوسان بحال ہوئے تو اس نے خجالت سے چہرہ جُھکا دیا۔

اس کا شرم سے گلنار ہوتا چہرہ، حیا سے جھکتی پلکیں میر آہل کا پسندیدہ نظارہ بن گئی تھیں۔ میر آہل کے چہرے پر شرارت سی مسکان نمودار ہوئی تھی۔

اُفففففف آہل۔۔۔۔

اس نے ہنستے ہوئے دل ہی دل میں کہا تھا۔ وہ آہل کی نظروں کا ارتکاز سمجھ گئی تھی۔ وہ کبھی کبھی میر آہل کے پوزیزو انداز کو دیکھ کر گھبرا جاتی تھی۔ مگر محبت کے تحفوں میں سے ایک تحفہ عدم تحفظی کا احساس بھی ہے۔ دل آویز کو اپنی قسمت پر رشک ہوا۔

☆...☆...☆

برمنگھم کی جانی مانی خوبصورت سی عمارت میں منعقد ہوئی اِس تقریب کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ اورنگزیب عالمگیر نے آسمان سے تمام ستارے توڑ کر اس پارٹی میں بکھیر دیئے ہیں۔ تقریب کا انتظام بتا رہا تھا کہ پیسے کا بے تحاشہ اور بے دریغ استعمال کیا گیا ہے۔ شہر کی بہت سی جانی مانی، خوبصورت اور نامور ہستیوں نے بھی اس شاندار تقریب میں شرکت کی تھی۔ اورنگزیب عالمگیر با اثر اور اثر رسوخ پرسنیلٹی کے مالک تھے۔ جس کی وجہ سے میڈیا اور ہالی وڈ سے وابستہ چند لوگ بھی اس تقریب میں شامل ہوئے تھے۔ محض پارٹی کا گلیمر بڑھانے کی غرض سے۔

اکثر ایکٹرز اور فلم اسٹارز کو شہر کے امیر کبیر لوگ اپنی پارٹیز میں پیسے دے کر انوائیٹ کرتے ہیں۔ تاکہ محفل کی شان مزید بڑھ جائے۔ اور اس طرح اُنہیں میڈیا کی توجہ بھی بھرپور حاصل ہوتی ہے۔ جو ان کی پروفیشنل زندگیوں پر بے حد پازیٹیو تریقوں سے اثر انداز ہوتی ہے۔

عمارت کی پانچویں منزل پر موجود یہ ہال اس وقت سفید قمقموں سے جگ مگ کر رہا تھا۔ اورنگزیب عالمگیر اپنے ہم عمر بزنس پارٹنرز اور چند دوستوں کے ساتھ وائن کا گلاس دائیں ہاتھ میں تھامے محو گفتگو تھے۔ ہر کوئی اپنی اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھا۔

اس مصروف سی چہل پہل اور اپنے آپ میں الجھے لوگوں کے درمیان محض اینا اورنگزیب تھی۔ جو اس ہال سے ملحقہ کاریڈور کے آخر میں موجود لفٹ کی جانب نظر ٹکائے میر آہل کی آمد کے انتظار میں کھڑی تھی۔

اینا نے سفید رنگ کا سلٹ میکسی ڈریس پہنا ہوا تھا۔ جو دائیں جانب سے گھٹنے تک کٹا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کا دایاں پاؤں گھٹنے تک دکھائی دے رہا تھا۔ مگر وہ جس ماحول میں پلی بڑھی تھی۔ اس ماحول میں ایسے لباس کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس نے پاس سے گزرتے ویٹر کی ٹرے سے ریڈ وائن کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگایا اور ایک نظر ہال کی مرکزی دیوار پر لگی گھڑی پر ڈالی۔

گھڑی کے کانٹے سست روی سے۔۔ ٹِک ٹِک ٹِک۔۔۔ کر رہے تھے اور اینا اورنگزیب کا چہرہ بے چینی سے سفید پڑھ رہا تھا۔

انتظار کا ہر لمحہ بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس نے ایک سانس میں جھٹکے سے گلاس میں موجود سُرخ مائع کو حلق میں انڈیلا اور اُسی وقت لفٹ کا دروازہ کُھلا اور اندر سے بھرے بھرے بازوؤں اور چوڑھے کندھوں والا میر آہل باہر نکلا اس کے ساتھ مائیکل اور چند گارڈز بھی موجود تھے۔ میر آہل کے شاندار سراپے پر نظر پڑتے ہی اینا کی سانسیں ساکن ہو گئیں۔

لفٹ سے ہال تک کا فاصلہ مشکل سے آدھے منٹ کا تھا۔ مگر اینا اورنگزیب کو لگا کہ یہ آدھا منٹ صدیوں پر مُحیط ہو گیا ہے۔ میر آہل سامنے سے چلتا ہوا آ رہا تھا۔ سیاہ ڈنر کے سوٹ میں نک سک سا تیار وہ شخص اس کے حواسوں پر ہر بار ایک نئے طریقے سے سوار ہوتا تھا۔ اور وہ ہمیشہ کی طرح سجیل اور جاذب نظر لگ رہا تھا۔

کہتے ہیں ہوا محسوس ہوتی ہے مگر اس لمحے اینا اورنگزیب کو میر آہل کے بالوں سے الجھتی ہوئی ہوا بھی دکھائی دے رہی تھی۔ کوئی اتنا چارمنگ کیسے ہو سکتا ہے۔ اینا مکمل اُس کے سحر میں گرفتار ہو گئی تھی۔ اورنگزیب عالمگیر نے یہ منظر دیکھا تو اُن کے لب فاتحانہ مسکراہٹ میں پھیل گئے۔

اینا بے ساختہ مسکرائی پر اگلے ہی پل اس کی دنیا رُک گئی۔ دل آویز جو میر آہل کے عین پیچھے چل رہی تھی عقب سے نکل کر آہل کے برابر میں آ گئی۔ اینا کی مسکان فوراً سمٹی۔۔۔ اورنگزیب عالمگیر کی مسکراہٹ بھی فوراً غائب ہوئی۔ میر آہل نے مائیکل سے گفتگو کرتے کرتے سرسری انداز میں دل آویز کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا تھا۔

ایناکافسوٹوٹاپھر آنکھیں سرخ ہوئیں اُس نے غصے سے اپنی مُٹھی اتنے زور سے بھینچی کہ ہاتھ میں پکڑا وائن گلاس چھن سے ٹوٹ گیا۔ بلکل اُس کے خوابوں کی طرح جو اس نے اپنی آنکھوں میں سجائے تھے۔ جیسے ہی وہ دونوں ہال میں داخل ہوئے وہاں موجود میڈیا دیوانہ وار ان کی جانب لپکا تھا اور کھچا کھچ ان کی تصویریں کھینچنا شروع ہو گیا تھا۔

وہاں موجود سب کے چہروں پر تجسس پھیلا ہوا تھا۔ ان سب کی نظریں مقناطیس کی طرح اُن دونوں پر منجمد ہو گئیں۔ فلیش لائٹس کی روشنی میں اور میڈیا کے درمیان گھرے میر آہل اور دل آویز اس وقت پاور کپل لگ رہے تھے۔

آگے سے نیوز رپورٹرز مائیک تانے میر آہل سے بڑے اشتیاق سے اُس کے ساتھ موجود لڑکی کے بارے میں سوال کر رہے تھے۔ کیونکہ آج سے پہلے وہ کبھی بھی کسی بھی عورت کے ساتھ نہیں دِکھا تھا۔

"سر پلیز کیا آپ ہمیں بتائے گے کہ آپ کے ساتھ موجود یہ خاتون کون ہیں؟"

میر آہل نے مسکرا کر ایک نگاہ سوال کرنے والے رپورٹر پر ڈالی اور پھر دوسری نگاہ اپنے پہلو میں کھڑی ڈری سہمی ہوئی سی دل آویز پر ڈالی۔

"یہ دل آویز میر ہیں۔۔۔۔ میری بیوی"

اس نے دل آویز کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تشکر سے کہا۔ اورنگزیب عالمگیر کی گرفت گلاس پر سخت ہوئی اور ہونٹ ناگواری سے بھینچ گئے۔

"سر آپ کی شادی کب ہوئی؟"

"آپ نے یہ بات اب تک پبلک میں کیوں نہیں بتائی؟"

"سر سر"

میر آہل مزید کسی بھی سوال کا جواب دیئے بغیر دل آویز کا ہاتھ تھامے آگے بڑھ گیا۔ میڈیا انگلینڈ کے سب سے بڑے بزنس ٹائیکون کی وائف دل آویز میر کے بارے میں مزید جاننے کے لئے پاگل ہو رہی تھی۔ اور اتنی افراتفری دیکھ کر دل آویز گھبرا گئی۔

"ریلیکس"

میر آہل نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ گارڈز نے میڈیا کو آہل اور دل آویز کی تصاویر کھینچنے اور مزید سوالات پوچھنے سے منع کر دیا۔

میر آہل لوگوں پر مسکراہٹ نچھاور کرتے ہوئے اینا اور نگزیب کے سامنے سے اُسے مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا تھا۔ یوں جیسے کہ اینا وہاں موجود ہی نہیں تھی۔ اور نگزیب اور آہل کا سوشل سرکل تقریباً ایک ہی تھا۔ وہاں بہت سے چہرے اُسے جانتے تھے۔ میر آہل لوگوں کے درمیان سے گزرتا سر کے اشارے سے سب کو جواب دیتا ہوا بار کاؤنٹر کے پاس کھڑے اور نگزیب عالمگیر کی جانب چلا آیا۔

دل آویز بھی اس کے ساتھ ہی تھی۔ میر آہل نے کٹیلی نگاہیں اور نگزیب کے شکست خوردہ چہرے پر ڈالی۔

"تم نے بہت غلط کیا ہے میر آہل۔۔۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ تمیں اگر یہ آفر منظور نہیں تھی تو تم اس تقریب میں شرکت نہ کرتے میں تمہارے فیصلے کی عزت کرتے ہوئے اینا کو سمجھا دیتا"

اینا کا نام سنتے ہی دل آویز کے ماتھے پر شکنوں کا جال بچھا تھا اُس نے نا سمجھی سے سامنے کھڑے آدھی عمر کے اس شخص کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ ان کی آنکھیں دل آویز کو شناسا لگیں۔ وہ اس شخص سے پہلی بار مل رہی تھی مگر یہ آنکھیں۔ ان آنکھوں کو وہ پہلے بھی بہت بار دیکھ چکی تھی۔

میر آہل ناخن سے ٹھوڑی کو کھرچتے ہوئے اور نگزیب کے کان کی جانب جُھکا

"یہ آپ کی اُن باتوں کا جواب ہے جو آپ نے میری بیوی کے بارے میں کہی تھیں"

اور نگزیب عالمگیر کے اعصاب تن گئے۔ آہل نے اتنے آرام سے سرگوشی کی تھی کہ دل آویز اس کی بات نہیں سن سکی مگر سامنے کھڑے شخص کے تاثرات دیکھ کر اتنا تو وہ سمجھ گئی تھی کہ مسئلہ گھمبیر ہے۔

"تم بہت پچھتاؤ گے آہل بہت زیادہ"

اور نگزیب عالمگیر کا انداز آہل کو انتباہ کرنے والا تھا۔ آہل نے ناگواری سے سر جھٹکا۔

"اور نگزیب میری بات سُنو"

وہ تھوڑا اور نزدیک ہوا

"میں اب تک تم سے اور تمہاری سائیکو بیٹی سے بہت نرمی سے پیش آتا رہا ہوں لیکن مستقبل میں ایسا کچھ نہیں ہو گا"

آہل نے اُسے خبر دار کیا اور نگزیب نے آہل کے چوڑے کندھوں کے اوپر سے پیچھے کھڑی دل آویز پر کٹیلی نگاہ ڈالی تھی۔ دل آویز نے بروقت غیر آرام دہ ہو کر پہلو بدلا تھا۔

میر آہل فاتحانہ انداز میں مسکرایا اور دل آویز کو لیکر آگے بڑھ گیا۔ وہاں سے گزرتے ہوئے دل آویز کی نظر اینا اور نگزیب پر گئی۔ جو کسی سے پریشانی اور غصے کے عالم میں موبائل پر بات کر رہی تھی اور بروقت موبائل کو کانوں سے لگائی اینا اور نگزیب نے جلن اور حسد کی آگ میں جلتی نظروں سے اُسے دیکھا تھا اور دل آویز سیکنڈز کے ہزارویں حصے میں پورا معاملہ سمجھ گئی تھی۔ تو یہ وجہ تھی اُسے اِس پارٹی میں لانے کی۔

"اب ہمیں چلنا چاہئے آہل آج کے لئے اتنا کافی ہے"

اس نے آہل کے کوٹ کا کنارہ پکڑ کر آہستگی سے کھینچ کر اُسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

"چلتے ہیں وائفی اتنی جلدی کیا ہے ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے"

وہ پر اسرار لہجے میں دائیں آنکھ بند کرتے ہوئے بولا اور ایک نظر دل آویز کے پیچھے کچھ فاصلے پر کھڑی اینا اور نگزیب کو دیکھا۔ اس کی مسکراہٹ میں اچانک سختی آگئی۔ دل آویز نے اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے پلٹ کر پیچھے دیکھا تھا۔

"پلیز آہل"

اُس نے ملتجی نظروں سے اُسے دوبارہ مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

میر آہل نے اینا اور نگزیب کی خون ہوتی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دل آویز کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور اُسے آہستگی سے گھمایا۔ دل آویز ایڑیوں کے بل گھومتے ہوئے ہال کے درمیان جا رُکی۔ وہ بلکل بھی اس چیز کے لئے تیار نہیں تھی۔ وہاں موجود تمام لوگوں نے بروقت دل آویز کو دیکھا تھا۔ ہال میں اچانک نیم اندھیرا چھا گیا اور پس منظر میں مدھم سی موسیقی چلنے لگی۔ اندھیرے میں محض دل آویز تھی۔ جس پر اسپاٹ لائٹ تھی۔ شرمندگی سے دل آویز

کے دونوں کان سرخ ہو گئے تھے۔ میر آہل نے اُسے کمر سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچا تو وہ بے ساختہ اس کے سینے سے جا لگی۔

دل آویز کی لٹیں پھسل کر اس کے رخساروں کو چھونے لگی تھیں۔

میر آہل نے تند مزاجی سے اس کی لٹوں کو چہرے سے ہٹایا۔ ان دونوں کو ڈانس کرتا دیکھ کر وہاں موجود باقی کپلز بھی ڈانس کرنے لگے تھے۔ یکدم پارٹی کا ماحول رومانی ہو گیا تھا۔ مائیکل جو کافی دیر سے کہیں غائب تھا۔ یکدم کہیں سے لوگوں کے درمیان نمودار ہوا اور آہل کی جانب دیکھتے ہوئے مُسکرا کر تھمز اپ کا اشارہ کیا۔ اور پھر ایک نظر اینا اور نگزیب کو دیکھا جو جل کر کوئلہ ہو گئی تھی۔

اُس کی سڑی ہوئی شکل دیکھ کر مائیکل کے مُردہ پوروجوں کو بھی آرام آگیا تھا۔ وہ دور کھڑی ان دونوں کی نزدیکیوں کو غصے اور بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی خون ہوتی آنکھوں میں بے ساختہ پانی بھرنے لگا تھا۔ دل میں ایک خلش سی پیدا ہوئی تھی۔

اس چبھن پر قابو پانے کے لئے اینا نے بار کاؤنٹر سے ایک گلاس اُٹھایا اور اس میں موجود خاکستری رنگ کا مائع گھونٹ گھونٹ اپنے اندر اُنڈیل دیا مگر جلن کم نہیں ہوئی۔ تو اُس نے ایک اور گلاس اٹھا کر اپنے اندر کی آگ کو بجھانے کی کوشش کی مگر یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی۔ ہر گھونٹ کے ساتھ اینا کے اندر کی آگ مزید بھڑک رہی تھی۔

دل آویز اُس کی بانہوں میں مقید تھی اور اینا اور نگزیب کی آنکھوں میں میر آہل۔۔۔

"اینا تمہیں یہاں سے چلنا چاہئے"

اور نگزیب نے اُس کے کندھے کو نرمی سے چھوتے ہوئے کہا انہیں اینا کی حالت دیکھ کر شُبہ ہوا۔ وہ کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی اور ٹھیک ہوتی بھی کیسے اپنی محبت کو کسی اور پر قربان ہوتا دیکھ کر کوئی کیسے ٹھیک رہ سکتا ہے۔

"اب آگ لگی ہے تو خاک ہونے تک تماشہ بھی دیکھیں گے"

اینا کی آنکھ کے کنارے پانی سے بھیگ چکے تھے۔ اس کے اعصاب جیسے شل ہونے کو تھے۔ وہ بار کاؤنٹر سے پُشت اور دونوں کہنیاں ٹکائے۔ شیمپین کا گلاس تھامے گردن کو ذرا سا بائیں جانب گرائے اُن دونوں کو ایک

دوسرے کی بانہوں میں جھولتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ دل زاروقطار دھاڑے مار مار کر رو رہا تھا۔ مگر پانی صرف آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔

اس مدھم سے اندھیرے میں کوئی نہیں تھا۔ جو اس کے اندر کی توڑ پھوڑ کو دیکھ سکتا۔ سب کی نظروں کا مرکز تو دل آویز تھی۔

سو آج ثابت ہوا کہ اینا اورنگزیب جس نے میر آہل کو ٹوٹ کر چاہا تھا۔ جس نے محبت میں اپنا سب کچھ نیلام کیا تھا۔۔۔ ہار چکی تھی۔ اپنا سب کچھ دینے کے بعد بھی وہ خالی ہاتھ کھڑی تھی۔ محبت نے اُسے بری طرح سے شکست دی تھی۔ اور محبت میں شکست کھائے ہوئے شخص سے زیادہ خطرناک دنیا میں اور کوئی دوسرا شخص نہیں ہوتا۔

اینا اورنگزیب نے گلاس واپس کاؤنٹر پر رکھا اور اپنے گیلے چہرے اور آنکھوں کو ہتھیلی سے پونچھتے ہوئے میر آہل کی جانب قدم بڑھائے۔ اسٹیپس اترتے ہوئے۔ اُس کے قدم لڑکھڑائے تھے مگر اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

آج کے بعد اُسے خود کو سنبھالنے کے لئے کسی بھی شخص کے سہارے کی ضرورت نہیں پڑنے والی تھی۔ اینا اورنگزیب آج کے بعد سنبھل گئی تھی۔ بچپنا ختم ہو گیا تھا۔ میر آہل کو پانے کی ضد ختم ہو گئی تھی۔ محبت پانے کی یہ ضِد ختم ہو گئی تھی۔

یہ محبت کی آخری منزل تھی۔ اور جانتے ہو۔۔۔ محبت کی آخری منزل کیا ہے۔

موت۔۔۔۔

موت۔۔۔ محبت کی وہ آخری منزل ہے جس کے بعد ساری مُشکلیں حل ہو جاتی ہیں۔

میر آہل نے اینا کو اپنی سمت آتا دیکھ کر دل آویز کو خود کے نزدیک کر کے اپنے کسرتی بازوؤں کے پیچھے چُھپا لیا۔ ناجانے کیوں ایک عجیب سے احساس نے اس کے دل کو اپنی گرفت میں لیا تھا۔

"آہل"

اس کی آنکھیں اتنی خالی تھیں کہ دل آویز کو اُسے دیکھ کر خوف سا آیا۔

"میں نے ہار مان لی"

وہ قرب سے مسکرائی۔

"مجھے میری محبت نہیں ملی"

اس نے لمحے بھر کے لئے رُک کر میر آہل کے پیچھے کھڑی دل آویز کو دیکھا تھا۔

"میں اُمید کرتی ہوں کہ تمہیں تمہاری محبت مل جائے"

یہ کہہ کر وہ میر آہل کے برابر سے نکل کر آگے کاریڈور کی جانب بڑھ گئی۔ وہ مزید وہاں ٹھہرتی تو اپنا آپا کھو دیتی۔ میر آہل کو اس کی بات کچھ سمجھ نہیں آئی تھی۔ اُسے لگا اینا اورنگزیب عالمگیر اپنا دماغی سلطولن کھو بیٹھی ہے۔ اس لئے ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔

« «

آج کی شام کا سارا فسوڈھیر ہو گیا تھا۔

"آپ نے یہ سب کیوں کیا آہل"

وہ دونوں لفٹ میں داخل ہوئے۔ اس کے سوال پر آہل نے ہاتھ کے اشارے سے گارڈز اور مائیکل کو لفٹ میں داخل ہونے سے روک دیا۔ شاید وہ اس وقت تنہائی چاہتا تھا۔ لفٹ کا دروازہ مقفل ہوتے ہی اس نے اپنا رُخ دل آویز کی جانب موڑا

"ان سب کو یہ شٹ اپ کال دینا لازمی تھا دل آویز کیونکہ ابھی میں اتنا بے غیرت نہیں ہوا ہوں کہ اپنی بیوی کے خلاف چُپ چاپ خاموشی سے بکواس سنتا رہو" وہ ناگواری سے بولا دل آویز اس کا یہ ردعمل اب جا کر سمجھی تھی۔

"میں نہیں سُن سکتا کچھ بھی تمہارے خلاف۔۔۔ت۔۔ تم میری بیوی ہو میری شریک حیات اور ان سب پر لازم ہے کہ تمہارا احترام کرے اور جس نے بھی ایسا نہ کیا میں اس کا یہی حشر کروں گا"

پتا نہیں اُسے اتنا غصہ کس بات پر آرہا تھا۔ اس نے اپنی ٹائی نوچتے ہوئے ڈھیلی کی۔

"آہل"

وہ تھم گئی۔ آہل کی آنکھوں میں اتنا غصہ، اتنا جلال دیکھ کر اُس کا دل ایک پل کے لئے سُن ہو گیا تھا۔ دل آویز کے پُکارنے پر اُس نے گردن ترچھی کر کے اُس کے سہمے ہوئے وجود پر نظر ڈالی اور میر آہل کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس نے دل آویز کا فق ہوتا چہرہ اپنی ہتھیلیوں میں قید کیا۔

"م۔۔ میں اِن آنکھوں میں محبت دیکھنے کا عادی ہوں پلیز اِن میں میری وجہ سے خوف مت لانا"

اس نے دل آویز کی روشن پیشانی کو چومتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"میں آپ سے کبھی بھی خوف زدہ نہیں ہو سکتی آہل مجھے دشمنوں کا ڈر ہے۔ آج جو بھی ہوا ٹھیک نہیں ہوا" وہ اب بھی پریشان تھی۔

"میں کبھی بھی تمہیں کسی بھی قسم کا ضرر پہنچنے نہیں دوں گا۔۔۔" اُس نے یقین سے اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا تو دل آویز کے کندھے ڈھلکے اور لفٹ کا دروازہ کُھلا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ لفٹ سے باہر آئے۔

مائیکل اور گارڈز دوسری لفٹ سے پہلے ہی نیچے آ گئے تھے اور اُن دونوں کا انتظار کر رہے تھے۔ لابی عبور کر کے وہ دونوں عمارت کے مرکزی دروازے کو پار کر کے باہر آ گئے تھے۔ ڈرائیور اُن کی گاڑی ڈرائیو وے پر لے آیا۔ شوفر نے دل آویز کے لئے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا۔ میر آہل عین اُس کے پیچھے کھڑا تھا۔ جب مائیکل نے آہل کو پُکارا۔۔۔

وہ مائیکل کی بات سننے کے لئے جیسے ہی پیچھے پلٹا۔۔۔ اُسی وقت ہوا میں فائر کی گونج سنائی دی۔ ایک کے بعد ایک دو فائر کئے گئے۔ ایک پل کے لئے آس پاس موجود ہر ایک شہ خاموش ہو گئی۔ کان کے پردے سُن ہو گئے۔ میر آہل نے پلٹ کر دل آویز کی جانب دیکھا تھا۔ جس کے دونوں ہاتھ آہستگی سے پہلو میں گرے تھے۔ میر آہل کی پلکیں لرزنے لگی تھیں اور سب دھواں دھواں ہو چکا تھا۔

اِسی سناٹے میں ایک اور فائر کی گونج ہوا میں بلند ہوئی تھی۔ اچانک ہی بہری ہوتی سماعتوں میں جان سی پڑ گئی۔ یکدم وہاں بھگ دھڑ مچ گئی تھی۔ میر آہل نے فوراً دل آویز کے نڈھال سے گرتے سراپے کو اپنی بانہوں میں سمیٹا تھا۔ وہ اس کے مضبوط بازوؤں میں جھولتی چلی گئی تھی۔

"کال دا ایمبولینس"

میر آہل زور سے چیخا تھا اور اس لمحے اُس نے دیکھا کہ دل آویز کے جسم سے خون کے فوارے چھوٹ رہے ہیں۔ اور اُس کے پس منظر سے دنیا کی ہر شہہ غائب ہو گئی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ اس کی سانس بند ہو گئی تھیں۔

یکدم ماحول میں ہل چل سی مچ گئی تھی۔ مائیکل اور گارڈز نے اُن دونوں کو چاروں جانب سے گھیر لیا۔ اس شور شرابے میں آہل کو بس دل آویز کی لرزتی پلکیں دِکھائی دے رہی تھیں۔ وہیں پلکیں جِن پر آہل کے ہونٹوں کا لمس ابھی بھی محسوس کیا جاسکتا تھا۔ اس کی سانسیں رُک رُک کر چل رہی تھیں۔

سماعتوں سے ایمبولینس کے سائرن کا شور ٹکرایا تو وہ کچھ پل کے لئے ہوش میں آیا۔ اُس نے دل آویز کو بانہوں میں سمیٹ کر ایمبولینس میں رکھے اسٹریچر پر لٹایا سب کچھ سِلو موشن میں ہو رہا تھا۔ میر آہل کو لگا اس کی دنیا اُجڑ گئی ہے۔ ایمبولینس میں موجود پیرامیڈیک نے دل آویز کو آکسیجن ماسک لگایا۔ اور فوراً سے اُسے پین کلر کا انجیکشن دیا۔ اس پورے واقعے کے دوران دل آویز کا ہاتھ میر آہل کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی آنکھوں سے اُبل اُبل کر آنسوں گر رہے تھے۔

"میں تمہیں جانے نہیں دوں گا آئی پرامس"

اس نے دل آویز کے بے حس ہاتھ کو لبوں سے لگاتے ہوئے خود سے وعدہ کیا تھا۔

جیسے ہی ایمبولینس ہسپتال کے احاطے میں داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے ایک کے بعد ایک میڈیا وینز آکر رُکی تھیں۔ ایک شخص فوراً اندر سے اسٹریچر لے کر حاضر ہوا تھا۔ میر آہل نے دل آویز کو ایمبولینس سے نکال کر اسٹریچر پر لٹایا۔

اسٹریچر کو سیدھا آپریشن تھیٹر کی جانب لے جایا جا رہا تھا۔ فوراً ہی ڈاکٹرز اور ان کا تمام اسٹاف حرکت میں آگئے تھے۔ میر آہل اسٹریچر کے ساتھ ساتھ دل آویز کا بے جان ہاتھ تھامے چل رہا تھا۔ اور مائیکل اس کے پیچھے تھا۔

"جس نے بھی تمہارے ساتھ یہ ظلم کیا ہے تمہاری قسم وہ سب تمہارے خون میں ڈوب جائے گے"

دل آویز کا ہاتھ میر آہل کے ہاتھ سے آہستگی سے جُدا ہوا۔ اُس نے ایک آخری نگاہ دل آویز کے بے رنگ چہرے پر ڈالی اور آپریشن تھیٹر کے دروازے بند ہو گئے۔

میر آہل وہیں دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔مائیکل نے فوراً اُسے شانوں سے پکڑ کر سہارا دیا۔

"ڈونٹ وری سر میم کو کچھ نہیں ہو گا وہ بلکل ٹھیک ہو جائے گیں" آہل کے اعصاب شل ہو گئے تھے۔اُس کے ارد گرد کا سارا شور مدھم ہو تا چلا گیا۔ آنکھوں کی پتلیوں پر محض دل آویز کا ہنستا مسکراتا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔وہ تمام لمحے دِکھ رہے تھے جو اُن دونوں نے ساتھ گزارے تھے۔اور اُس کی آنکھوں سے آنسوں کے قطرے زارو قطار بہہ رہے تھے۔

"مائیکل۔۔۔مجھے وہ شخص چاہئے"

آہل نے نقاہت سے اس کے بازوؤں کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"مجھے وہ شخص کسی بھی حال، کسی بھی قیمت پر چاہئے۔میرا بہت بڑا نقصان ہوا ہے اور اگر مجھے وہ شخص نہیں ملا تو میں پورے برمنگھم کو آگ لگا دوں گا"

وہ حلق پھاڑ کر چیخا تھا۔مائیکل کی آنکھیں پھیل گئیں۔اس نے آج سے پہلے کبھی آہل کو اتنے جلال میں نہیں دیکھا تھا۔اُس نے فوراً کوٹ کے پاکٹ سے موبائل نکال کر چند نمبرز ڈائل کئے۔میر آہل کا بہت اثرورسوخ تھا۔اُس کے ایک فون کال پر برمنگھم شہر کے تمام بڑے پولیس آفیسرز اور میڈیا چینلز حرکت میں آگئے تھے۔اُس ہوٹل (جہاں یہ حادثہ پیش آیا تھا) اور اس کے ارد گرد کے تمام علاقوں کو سِیل کر دیا گیا تھا۔

اب نہ تو وہاں کوئی داخل ہو سکتا تھا اور نہ ہی نکل سکتا تھا۔تمام روڈز اور دکانوں کو سیل کر دیا گیا تھا۔

یہاں تک کہ برمنگھم ایئرپورٹ، ریلوے اسٹیشن اور ہائی ویز پر بھی پوری طرح سے ناکا بندی لگادی گئی تھی۔ ہر آنے جانے والی گاڑیوں کو ہر طرح سے مانیٹر کیا جارہا تھا۔ہر طرح کی فون کالز کو ٹیپ کیا جارہا تھا۔جب تک اس حادثے میں ملوث شخص مل نہیں جاتا کوئی بھی برمنگھم شہر کے باہر قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ہاسپٹل کے باہر میڈیا جمع ہو گئی تھی۔جس کو قابو میں لانے کے لئے بھاری تعداد میں پولیس کے اہلکاروں کو نافذ کیا گیا تھا۔کسی کو بھی اندر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ہر ایک شخص پر کڑی نظر رکھی جارہی تھی۔دل آویز کا آپریشن جس او-ٹی میں ہو رہا تھا۔اُس کے باہر بھی حفاظتی اقدامات کے پیش نظر دو اہلکاروں کو نافذ کر دیا گیا تھا۔

نیوز چینلز پر پل پل کی اپڈیٹس کو نشر کیا جا رہا تھا۔ اس مسئلے کو حکومتی سطح پر ہائی لائٹ کیا جا رہا تھا۔ یہ انگلینڈ کی حکومت کے لئے ایک بہت بڑا سوال تھا کہ انگلینڈ جیسے ترقی یافتہ مُلک میں اتنے دھڑلے سے دہشتگردی ہو رہی تھی۔ جس کی وجہ سے انگلینڈ گورمنٹ پر پریشر بڑھ رہا تھا۔

میر آہل نے محض آدھے گھنٹے کے اندر پورے شہر کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ جولیانہ کافی مُشکلوں سے ہسپتال تک پہنچی تھی۔ اُسے ہسپتال کے دروازے پر ہی سیکیورٹی پروٹوکول کے تحت روک لیا گیا تھا۔ کافی دیر وہاں پھنسے رہنے کے بعد جُولیانہ نے مائیکل کو کال کر کے فوراً اپنی موجودگی کی اطلاع دی۔ اُسی کے تصدیق کرنے پر جولیانہ کو اندر داخل ہونے دیا گیا تھا۔ ورنہ کسی کو بھی وہاں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ سوائے میر آہل اور مائیکل کے۔۔۔۔ برمنگھم پر تیرہ اپریل دو ہزار پچیس کی رات بہت بھاری گزری تھی۔ ہر نیوز چینل پر ایک ہی خبر چل رہی تھی کہ انگلینڈ کے نامور بزنس ٹائیکون میر آہل کی بیوی پر قاتلانہ حملہ کیا گیا تھا۔ شہر میں افراتفری کا عالم تھا۔ یوں جیسے قیامت آگئی تھی۔

☆...☆...☆

برمنگھم میں مچی افراتفری سے ہزاروں میل دور لندن میں الہان اس وقت کچن میں اپنے لئے میگی بنا رہا تھا۔

دس منٹ بعد وہ کچن سے ایک ہاتھ میں میگی کا باؤل اور دوسرے ہاتھ میں پیپسی کا کین پکڑے باہر نکلا اور خراماں خراماں چلتا ہوا لاؤنج میں ٹی وی کے سامنے رکھے صوفے پر آرام سے آکر براجمان ہو گیا۔ آج کے دن نے کافی تھکا دیا تھا اُسے۔۔۔ جاب اور اس کے بعد اپنے میوزک اسٹوڈیو میں دیر رات تک کام کرنا کافی مُشکل تھا۔ مگر خود کو مصروف رکھنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرتے رہنا ضروری بھی تھا۔ اس وقت رات کے کچھ ایک سوا ایک بج رہے تھے۔

اور اُس نے مووی دیکھنے کی غرض سے ٹی وی آن کیا تھا۔ ذہن کو سوچوں سے دور رکھنے کا یہ ایک بہت اچھا طریقہ تھا۔ جس پر وہ روز رات کو عمل کیا کرتا تھا۔ وہ ایک کے بعد ایک چینل بدلتا گیا۔ پھر اچانک ایک نیوز چینل پر الہان کی بٹن دباتی انگلیاں ساکت ہوئیں۔

"انگلینڈ کے مشہور بزنس ٹائیکون میر آہل کی وائف پر قاتلانہ حملہ"

اینکر سنسنی خیز انداز میں نیوز پڑھ رہا تھا اور پس منظر میں میر آہل کی تصویر اور وہ تمام مناظر کی جھلک دکھائی جا رہی تھی۔ جو اُس عمارت کے باہر پیش آئے تھے۔

اور الہان کے ہاتھ سے میگی کا باؤل اور ریموٹ بروقت چھوٹ کر زمین پر گرے تھے۔ اس کی آنکھیں اسکرین پر مقناطیس کی طرح چپک کر رہ گئی تھیں۔ وہ خالی الذہنی کی حالت میں صوفے سے کھڑا ہو گیا۔ اس کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ اُسے اپنی آنکھوں اور سماعتوں پر یقین نہیں آیا۔

نیوز اینکر بار بار ایک ہی نیوز سنائے جا رہا تھا۔ جو بھی نیوز چینل لگاؤ وہاں ایک ہی خبر نشر کی جا رہی تھی۔ اس نے پینٹ کی پاکٹ سے اپنا فون نکالا آنکھ میں آنسوں بھر جانے کی وجہ سے اسکرین دُھندلی دِکھائی دینے لگی تھی۔ جیسے تیسے اُس نے ایک نمبر ڈائل کیا اور فون کان سے لگایا۔

اگلے ایک گھنٹے بعد وہ ایئرپورٹ پر برمنگھم جانے کے لئے طیارے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ گھر سے خالی ہاتھ نکلا تھا۔ چند کریڈٹ کارڈز اور پاسپورٹ کے سوا کچھ نہیں تھا اس کے پاس۔ اس کے ہاتھ پریشانی سے کانپ رہے تھے۔ ماتھے پر شکنوں کا جال بچھا تھا۔ وہ لب کاٹتا وِنڈو سیٹ پر بیٹھا کھڑکی سے باہر رن وے کو خالی نگاہوں سے گھورنے لگا۔ اُسے اپنے ارد گرد دھواں پھیلتا دکھائی دیا۔ اس دھویں میں ایک شکل اُبھری تھی وہ دل آویز کی معصوم سی شکل تھی۔

("یار ڈوب مرو تم ایک چھوٹا سا اسائمنٹ نہیں کر سکی تم میرا بڑے افسوس کی بات ہے"

"میں مر گئی نہ تو یاد رکھنا تم رو رو کر اپنی آنکھیں سُجا لو گے"

دل آویز نے اسائمنٹ فائل اس کے جانب بڑھاتے ہوئے اِترا کر کہا۔

"تمہاری سوچ ہے بیٹا۔۔۔ میں تو شکرانے کی نفل ادا کروں گا"

اس نے ڈھٹائی سے فائل اس کے ہاتھ سے کھینچ لی

"اچھا بے شرم انسان میں مر گئی تو یہ اسائمنٹس اپنے فرشتوں سے کروالینا تم سہی ہے"

وہ اس کے ہاتھ سے اسائمنٹ کی فائل دوبارہ کھینچتے ہوئے چڑ کر بولی۔

"ارے یار میں تو مزاق کر رہا تھا۔ اتنی اچھی دوست کے مرنے پر میں کیسے خوش ہو سکتا ہوں بھلا"

وہ مسکینیت سے بولا اس کی شکل دیکھ کر دل آویز کا قہقہہ نِکل گیا۔)

الہان نے مشکل سے سانس اپنے پھیپھڑوں میں اتاری تھی اُسے لگا طیارے میں آکسیجن کی کمی ہو گئی ہے۔ ماضی کے ایک منظر نے اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر نمی بھر دی تھی۔ اس نے ہتھیلی سے آنسوں صاف کرنے کی کوشش کی۔ دل آویز کی بات سچ ہو گئی تھی کاش وہ اُسے اپنی سوجی ہوئی آنکھیں دکھا پاتا۔ جو اُس کی خیریت کی دعا کرتے کرتے بار بار بھیگ رہی تھیں۔ پلین برمنگھم کے لئے ٹیک آف کر رہا تھا۔ جب اچانک کسی نے آہستگی سے اُس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تو الہان نے چونک کر گردن ترچھی کر کے دیکھا۔ وہ گلابی رنگ کے فراق میں ملبوس ایک تیرہ سال کی چھوٹی انگریز بچی تھی۔ جو اُسے نرمی سے مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔ اس نے ہیزل گرین آنکھوں پر سیاہ رنگ کے موٹے سے چشمے پہنے ہوئے تھے اور سنہری بالوں کی دو چُٹیاں بنائی ہوئی تھی۔ اس کے مسکرانے پر بریسز لگے دانت نمایا ہوتے تھے۔ الہان نے بھی اُسے مسکرا کر دیکھا تو وہ بلش کرنے لگی۔

"آپ کیوں رو رہے ہیں؟"

معصومیت سے سوال پُوچھا گیا۔

"میرا ایک فرینڈ بہت بیمار ہے"

الہان نے پلکیں زور سے جھپکائیں تو منظر کچھ صاف ہوا۔

"رونے سے فرینڈ کی بیماری ٹھیک تھوڑی ہو جائے گی"

وہ مسکرائی

"تو پھر کیا کرنا چاہئے مجھے؟"

اس نے بے مقصد ہی پوچھ لیا

"دعا"

"آپ کو اپنے فرینڈ کے لئے دعا کرنی چاہئے۔ میرے پاپا کہتے تھے کہ جو لوگ سچے دل سے دعا کرتے ہیں۔ تو گاڈ ان کی دعا رد نہیں کرتا"

چشمے کے پیچھے معصوم آنکھیں الہان کے گیلے چہرے پر جمی تھیں۔

"اور آپ کو پتا ہے میرے پاپا کیا کہتے تھے"

الہان کے سوال پر اس بچی کا سر نفی میں ہلا

"میرے پاپا کہتے تھے کہ بچوں کی دعا گاڈ جلدی قبول کرتا ہے"

وہ اپنے اندر کی تکلیف کو دباتے ہوئے بمشکل مسکرایا

"کیا آپ میرے فرینڈ کے لئے دعا کرو گی؟"

اس کی بات پر بچی نے فوراً اثبات میں گردن ہلائی اور آنکھ بند کر کے دعا کرنے لگی۔

"ڈیئر گاڈ۔۔۔ پلیز ان کے دوست کو جلدی صحتیاب کر دیں۔ کیونکہ جب کوئی اپنا دور چلا جاتا ہے تو بہت رونا آتا ہے۔ میں نہیں چاہتی میری طرح کوئی دوسرا روئے۔ پلیز گاڈ ہیلپ ہِز فرینڈ"

اس نے آنکھیں کھول کر الہان کی جانب دیکھا۔

"اب آپ کا دوست جلدی ٹھیک ہو جائے گا"

وہ پر امید لہجے میں بولی۔

"ایک بات پوچھوں؟"

الہان نے اس کی معصومیت بھرے چہرے کو غور سے دیکھا۔

"آپ گاڈ سے یہ کیوں کہہ رہی تھیں کہ (میں نہیں چاہتی میری طرح کوئی دوسرا روئے) آپ نے اپنے کس فرینڈ کو کھویا ہے؟"

اس کا سوال سنتے ہی بچی کی آنکھوں کی چمک ماند پڑی۔ الہان کو اپنے سوال پر اچانک پچھتاوا ہوا۔

"پاپا کو"

یہ کہہ کر اُس بچی نے اپنا سر نیچے گرا لیا۔

"میرے پاپا میرے بیسٹ فرینڈ تھے۔ ان کی ڈیتھ سے پہلے ہم سب برمنگھم میں رہتے تھے۔ دو سال پہلے ان کی ایک کار ایکسڈنٹ میں موت ہو گئی۔ میرا برتھڈے تھا اُس دن۔ وہ آفس سے واپسی پر کیک لیکر گھر آ رہے تھے۔ جب ایک لال رنگ کی کار نے میرے پاپا کی کار کو زور سے ٹکر ماردی اور ان کی کار بے قابو ہو کر برج سے نیچے گر گئی۔ اور آن دا اسپاٹ ان کی ڈیتھ ہو گئی۔ کار نشے میں دُھت ایک لڑکی چلا رہی تھی۔ مگر انویسٹیگیشن افیسر نے بعد میں کہا

کہ کار لڑکی نہیں کوئی ادھیڑ عمر کا آدمی چلا رہا تھا۔ اور بعد میں اس آدمی کو جیل بھی بھیج دیا گیا۔ اس واقعے کے بعد ہم لندن شفٹ ہو گئے۔ آج میری برتھڈے ہے مگر میں اب اپنی برتھڈے نہیں مناتی کیونکہ آج کا دن میری زندگی کا سب سے بُرا دن ہے کیونکہ آج کے دن میں نے اپنے بیسٹ فرینڈ کو کھویا تھا"

وہ بچی اب بھی نیچے اپنی گود میں رکھے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی اور الہان ششدر سا اُس بچی کو دیکھ رہا تھا۔ جس کی آواز ایک بار بھی یہ پورا واقع بتاتے ہوئے گیلی نہیں ہوئی تھی۔ اچانک الہان کی سماعتیں سُن ہو گئی تھیں۔ زمین سے ہزاروں فٹ اوپر آسمان میں بادلوں کے درمیان اُس کے ضمیر پر ماضی کے بادلوں میں گھری ایک بھولی بھٹکی یاد نے کھینچ کر تماچہ مارا تھا۔

("ڈیڈ آپ کب تک اینا کی غلطیوں کو کور کرتے رہیں گے ؟" الہان کو اب بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ اینا کی لاپرواہی نے ایک بے قصور شخص کی جان لے لی تھی۔

"میں اُس کا باپ ہوں الہان"

"اور جو مرا ہے وہ بھی کسی کا باپ تھا ڈیڈ گیارہ سال کی چھوٹی بیٹی ہے اُس شخص کی۔ یہ آپ اچھا نہیں کر رہے ہیں"

"ہاں تو کیا کروں اپنی بیٹی کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج دوں. اتنا ایموشنل ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور ویسے بھی وہ نشے میں تھی۔ اس نے جان بوجھ کر تو نہیں کیا ہے۔ تم اس معاملے میں مت پڑو میں سب ہینڈل کر لوں گا "

اورنگزیب نے جیب سے موبائل نکال کر کوئی نمبر ڈائل کرتے ہوئے خفگی سے کہا۔

"رئیلی ڈیڈ آپ اینا کی غلطی کو اس طرح سے جسٹیفائی کریں گے کہ یہ غلطی سے ہوا ہے۔ مگر تب آپ کیا کریں گے جب کسی دن وہ واقعی جانتے بوجھتے کسی کی جان لے لیگی۔ اس دن بھی آپ یہی جسٹیفکیشن دیں گے ؟"

الہان نے افسوس سے سر کو جنبش دی۔)

الہان نے لرزتے ہاتھوں سے اس بچی کے گال کو چھوا تو وہ اداسی سے مسکرائی۔ الہان کے دل میں درد کی ایک نئی لہر اُٹھی اور یہ تکلیف پہلے سے دُگنی ہو گئی تھی۔ کیسے لوگ تھے یہ جن کو کسی بھی شہہ کا ڈر خوف نہیں تھا۔ کیا یہ لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اِنہیں بھی موت آنی ہے۔ انہیں بھی اللہ کے آگے جواب دینا ہے۔

بد نصیب وہ نہیں ہے جسے آخرت نہیں ملتی، بد نصیب تو دراصل وہ ہیں جنہیں نہ دینا ملتی ہے اور نہ آخرت۔

"ڈاکٹر میری وائف کی کیا کنڈیشن ہے"

جیسے ہی ڈاکٹر تھیٹر سے نکلے اس نے فوراً سے سوال کیا۔ مائیکل اور جولیانہ بھی ڈاکٹر کو دیکھ کر بینچ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر نے گہری سانس لیتے ہوئے ماسک اُتار کر پاس رکھے ڈسٹ بن میں پھینکا اور رُخ آہل کی جانب پھیرا۔

"بُلٹ آپ کی وائف کے دل کے نیچے لگی ہے اور خون بھی کافی بہہ گیا ہے"

لمحے بھر کی خاموشی

"ہم اپنی جانب سے ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں اُنہیں بچانے کی لیکن ہمیں کچھ خاص اُمید نہیں ہے مسٹر میر "

میر آہل کا مضبوطی سے تنا ہوا جسم ایک سیکنڈ کے لئے لڑ کھڑایا۔ آنکھ کے سامنے کالے بادل سے منڈلانے لگے۔ تو ڈاکٹر نے اُس کے ڈھلکتے کندھے پر ہمدردی سے ہاتھ رکھا۔

"اس لئے آپ ہر طرح کی صورتحال کے لئے خود کو تیار رکھیں"

ڈاکٹر کو آہل کے چہرے کے بدلتے تاثرات بخوبی سمجھ آ رہے تھے۔ لمحے بھر کے لئے کاریڈور میں سکوت طاری ہو گئی۔

"ڈاکٹر"

چند سیکنڈز گزرنے کے بعد آہل نے ڈاکٹر کا کندھے پر رکھا ہاتھ اپنے کانپتے ہاتھوں میں لیا۔ اور نم آنکھوں سے اُمید بھری نظروں سے اُنہیں دیکھا۔

" آئی۔۔لو۔۔ہر۔۔سو۔۔مچ"

اس کی آواز جیسے کسی خلا سے نکل رہی تھی۔ڈاکٹر نے آہل کے ہاتھوں کی کپکپی کو واضح طور پر محسوس کیا تھا۔

"پلیز"

آنسوؤں کا ایک گولا اُس کے حلق میں اٹکا۔اُس میں مزید کچھ کہنے کی سکت باقی نہیں بچی تھی۔ آہل نے آہستگی سے ڈاکٹر کا ہاتھ چھوڑا اور خالی الذہنی کی حالت میں چلتا ہوا کاریڈور سے باہر نکل گیا۔ پیچھے مائیکل اور جولیانہ کھڑے اُس کی پشت گھور رہے تھے۔ دونوں میں سے کسی نے بھی آہل کے پیچھے آنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ وہ چلتا چلتا باہر لان میں آگیا۔ جہاں چند مریض کھلی فضا میں واک کر رہے تھے۔

وہ ہرے سبزے پر چلتا لان کے پر سکون گوشے میں آگیا۔ جہاں مچھلیوں کا چھوٹا سا تالاب بنا ہوا تھا۔

اس نے آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے لمبی لمبی سانسیں لیں۔ مگر دل کا عالم تھا جو سنبھلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

وہاں کھڑے کھڑے اُس نے اپنی زندگی کے ان چند سالوں کا جائزہ لیا جو اس نے دل آویز کے بغیر گزارے تھے۔ ان تمام سالوں میں کچھ نہیں تھا۔ دل آویز کے بغیر اس کی زندگی میں کچھ نہیں تھا۔ وہ تھی تو سب تھا۔ وہ نہیں تھی تو خود میر آہل بھی نہیں تھا۔

اور ایک ایسی زندگی جس میں دل آویز نہ ہو وہ زندگی میر آہل کے لئے بیکار تھی۔

کسی نے اس کے کندھے پر پیچھے سے ہاتھ رکھا تھا۔ وہ مائیکل تھا۔ آہل کو اس طرح ٹوٹتا بکھرتا ہوا دیکھ کر اُس سے رہا نہیں گیا۔ وہ آہل کو اُس کے اِتنے مشکل وقت پر تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

"میں ہمیشہ سوچتا تھا کہ وہ مجھے میری کسی نیکی کے بدلے میں ملی ہے"

اُس نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا وہ یوں ہی نیچے تالاب میں رنگ برنگی مچھلیوں کو دیکھتے دیکھتے بڑبڑانے لگا۔

"اس کے آجانے سے میری زندگی میں موجود ساری خلش مٹنے لگی تھی"

اس کے منہ سے سِسکی نکلی

"میں اپنی خامیوں، اپنے خوف سے جیتنے لگا تھا"

ایک کے بعد ایک آنسوں کے قطرے اس کی آنکھ سے نکل کر چہرے پر بہہ رہے تھے۔

"میں اندھیروں سے نکل کر دوبارہ روشنی کی جانب بڑھ رہا تھا"

مائیکل کی آنکھ بھی اشک بار ہونے لگی۔

"میرے دل میں زندگی کو جینے کی تمنا نے ایک بار پھر سر اٹھایا تھا"

مائیکل خاموشی سے پیچھے کھڑا بنا کچھ کہے آہل کو سُن رہا تھا۔

"وہ خوشیاں، وہ روشنی، وہ خواہشیں مجھ سے روٹھ جائے گیں اگر دل آویز کو کچھ ہو گیا مائیک"

وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسا کیا کرے کہ دل آویز ٹھیک ہو جائے۔ کاش دولت سے صحت بھی خریدی جاسکتی تو وہ دل آویز کے لئے زندگی خرید لیتا۔

"سر۔۔۔ جتنا بُرا آپ کے ساتھ ہو سکتا تھا وہ ہو گیا"

مائیکل نے آہل کو اپنے حصار میں قید کرتے ہوئے کہا۔

"اب جو ہو گا صرف اچھا ہو گا۔ اللہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتا"

وہ اُس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے ڈھارس سے بولا۔

"آپ فائٹر ہیں آپ نے بہت سی آزمائشوں کا تنہا سامنا کیا ہے۔ آپ اب ہمت نہیں ہار سکتے ورنہ دشمنوں کو لگے گا آپ نے ہار مان لی ہے اور آپ اپنے دشمنوں کو یہ اطمینان ہر گز نہیں دیں گے"

وہ آہل کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

"اتنا یاد رکھیں آپ میم کی اور میم آپ کی طاقت ہیں۔ دل آویز میم او۔ٹی میں اپنی زندگی کے لئے اب بھی لڑ رہی ہیں۔ جب اُنہوں نے ابھی تک ہار نہیں مانی تو آپ ہار کیسے مان سکتے ہیں"

آہل نے نظر اُٹھا کر مائیکل کی پر امید آنکھوں میں دیکھا تھا اور یکدم کسی نے اس کے نڈھال ہوتے جسم میں جان بھر دی تھی۔ اس نے آنسوں خشک کرتے ہوئے جیب سے موبائل نکالا اور ایک نمبر ڈائل کیا۔

کچھ دیر بعد ایک پولیس آفیسر اور اس کے ہمراہ چند کانسٹیبلز وہاں اس کیس کی اپڈیٹ کے ساتھ موجود تھے۔

"سر جس نے آپ کی وائف پر فائر کیا تھا وہ شخص ہمیں مل گیا ہے۔ اس کے پاس سے وہ گن اور باقی کی بُلٹس بھی برآمد ہو گئیں ہیں پر"

آفیسر بولتے بولتے رُکا تو آہل نے بھنویں اُچکا کر مستفسرانہ نظروں سے اس کی شکل دیکھی۔

"پر کیا آفیسر؟"

"پر ہمارے آنے سے پہلے ہی اس شخص نے خودخوشی کر لی تھی اور موت کی وجہ زہر ہے"

آفیسر بات مکمل کر کے خاموش ہو گیا۔

"واٹ پر کیوں؟"

آہل کا دماغ گھوم گیا۔

"صاف ظاہر ہے کہ وہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ اُس نے یہ کام کس کے کہنے پر کیا ہے"

آہل نے ضبط سے سانس اندر کھینچی اور ناگواری سے آفیسر کو دیکھا۔

"کیا پتا اس نے خودخوشی نہ کی ہو اُسے قتل کروا دیا گیا ہو"

مائیکل نے سوال کیا۔

"ہو سکتا ہے مگر لاش کی باڈی یا کسی دوسری چیز پر کسی اور کے فنگر پرنٹس نہیں ملے ہیں۔ سارے ثبوت دیکھ کر یہی لگتا ہے کہ زہر کھا کر خودخوشی کی گئی ہے"

کافی پروفیشنل انداز میں جواب دیا گیا تو مائیکل نے شانے اُچکائے۔

"ہر حال میں پتا کرو کہ اُسے ایسا کرنے کے لئے کس نے کہا۔۔ کوئی۔۔۔ کوئی تو ثبوت ملا ہو گا۔ اس کا نام، موبائل نمبر، آئی ڈی کارڈ۔۔ کچھ بھی"

آہل دائیں سے بائیں چکر کاٹتے ہوئے بولا

"سر حیرت کی بات ہے اس شخص کے فنگر پرنٹس ریکارڈ میں موجود ہی نہیں ہیں۔ کیا نام ہے، کہاں سے آیا ہے، کون ہے کوئی اتا پتہ نہیں ہے اور اُس گن کا بھی کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ اور انویسٹیگیشن کے بعد معلوم ہوا ہے کہ جو موبائل اس کے پاس سے ملا تھا حیرت کی بات ہے کہ اس موبائل سے کبھی نہ کوئی کال کی گئی اور نہ کبھی کوئی کال موصول ہوئی ہے۔ ایسا لگتا ہے جس نے بھی یہ سب کروایا ہے وہ بہت پہلے سے اس کی تیاری کر رہا تھا۔ سب کچھ اتنا کلین ہے کہ سمجھ نہیں آ رہا"

آفیسر کی بات نے آہل اور مائیکل دونوں کے اوسان خطا کر دیئے تھے۔ ایسا کیسے ممکن تھا۔

"کیا آپ کو کسی پر شک ہے؟"

آفیسر نے بغور آہل کی جانب دیکھا اور آہل نے مائیکل کو۔

(میں اُمید کرتی ہوں کہ تمہیں تمہاری محبت مل جائے)

آہل نے چونک کر سر اٹھا کر آفیسر کو دیکھا اس کے سامنے بکھرے ہوئے پزل کے ٹکڑوں کی ترتیب لمحوں میں درست ہو گئی۔

"اینا۔۔۔ اورنگزیب۔۔۔ عالمگیر"

اس نے چباتے ہوئے ایک ایک لفظ ادا کیا۔

اُس کے ذہن میں پہلے یہ نام کیوں نہیں آیا تھا۔ حالات نے اُسے اتنا ڈسٹرب کر دیا تھا کہ اس کا دماغ چلنا بند ہو گیا تھا۔

☆...☆...☆

اگلے آدھے گھنٹے کے اندر اینا اورنگزیب کو پوچھ گچھ کے لئے حراست میں لے لیا گیا تھا۔ اُسے انویسٹیگیشن روم میں لے جایا گیا۔ جہاں نیم اندھیرا تھا۔ درمیان میں ایک ٹیبل اور دو کرسیاں آمنے سامنے رکھی ہوئی تھیں۔ جن میں سے ایک پر اینا دھڑلے سے پیچھے کرسی سے ٹیک لگائے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ سامنے ایک آفیسر

کمرے میں دائیں سے بائیں چکر کاٹ رہا تھا۔ اینا نے گردن دائیں جانب گرا کر سامنے شیشے کی دیوار کو بغور دیکھا اور ہلکا سا مسکرائی۔

"آپ کا کیٹ واک ختم ہو گیا ہے آفیسر تو جلدی سے سوال جواب کا کھیل شروع کر لیں۔ کیونکہ مجھے بنا اے-سی کے زیادہ دیر بیٹھنے کی عادت نہیں ہے"

وہ ڈھٹائی سے پہلو بدلتے ہوئے بولی تو آفیسر بلمقابل کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"آپ مسٹر میر کو کب سے جانتی ہیں؟"

وہ ہاتھ باہم ملاتا ہوا ٹیبل پر جھکا۔

"کافی سالوں سے"

"کتنے سالوں سے؟"

"یہی کچھ چار، پانچ سال"

"چار یا پانچ؟"

"پتا نہیں"

اس کے جواب پر آفیسر مُسکرایا

"اور مسز میر کو؟"

"جب سے اُس کی بزنس ٹائیکون میر آہل سے شادی ہوئی ہے اس سے تھوڑا پہلے سے"

"کتنا تھوڑا؟"

"پتا نہیں"

وہ سابقہ انداز میں بولی

"جب مسز میر کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تب آپ کہاں تھیں؟"

اینا کا ضبط ڈگمگایا

"میں اپنے گھر میں آرام کر رہی تھی"

"کیوں آپ کی تو سالگرہ تھی رائٹ اور آپ کے ڈیڈ نے ایک بہت بڑی پارٹی بھی دی تھی اس خوشی میں، پھر آپ وقت سے پہلے ہی کیوں گھر چلی گئیں؟"

سوال سیدھا تھا مگر اینا کو ناگوار گزرا

"میرا موڈ ختم ہو گیا تھا پارٹی کرنے کا اس لئے گھر چلی گئی اور اب یہ مت پوچھئے گا کہ موڈ کیوں ختم ہو گیا تھا۔ اس سوال کی جواب دے نہیں ہوں میں۔۔۔ آفیسر"

لفظ آفیسر پر زور دیا گیا۔

"پلیز میم ہمارے ساتھ تعاون کریں تاکہ ہم قاتل تک جلد از جلد پہنچ سکے"

اس کی بات پر اینا غصے سے کھڑی ہو گئی۔

"واٹ دا ہیل۔۔۔ میں۔۔ اینا اورنگزیب۔۔ اورنگزیب عالمگیر کی ایک لوتی بیٹی تمہیں قاتل دکھائی دیتی ہے"

اس نے ٹیبل پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے غصے سے کہا۔

"میم پلیز بیٹھ جائیں"

آفیسر کا انداز خبر دار کرنے والا تھا۔ اینا کے کان غصے سے مزید سرخ ہو گئے۔

"میرا۔۔۔ اس۔۔۔ واقعے۔۔۔ سے۔۔۔ کوئی۔۔۔ تعلق۔۔۔ نہیں۔۔۔ ہے۔۔۔ سمجھے۔۔۔ آفیسر۔۔۔ اور۔۔۔ کس بنا پر۔۔۔ مجھ سے۔۔۔۔ پوچھ گچھ کی۔۔۔۔ جارہی ہے"

ایک ایک لفظ کو ٹھہر ٹھہر کر ادا کیا گیا۔

اس سے پہلے کہ آفیسر کچھ کہتا کمرے کا دروازہ کھول کر میر آہل اندر داخل ہوا۔ آہل کے آتے ہی آفیسر کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ اب کمرے میں اینا اورنگزیب اور میر آہل تنہا رہ گئے تھے۔

"میرے کہنے پر تمہیں انویسٹیگیشن میں شامل کیا گیا ہے اینا اورنگزیب "

میر آہل کی گردن کی نسیں اُبھرنے لگیں۔

"میں نے کچھ نہیں کیا ہے آہل"

وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ بولی

"یہ تمہارے اعمال ہیں جو تمہارے سامنے آئے ہیں۔ بہت تکبر تھا تُمہیں خود پر اور اپنی بیوی پر بس اللہ نے اُسی کی سزا دی ہے تُمہیں"

اینا نے مصنوعی لاپرواہی سے شانے اُچکاتے ہوئے کہا۔

"مزید کوئی فضول بکواس کی تو تمہیں یہی زندہ درگور کر دوں گا میں سمجھی"

اس نے غصے سے مُٹھی بھینچتے ہوئے بلند آواز میں کہا تو اینا اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے ایک قدم آگے آئی اور وحشت سے مسکرائی۔

"وہ باتیں مت کرو۔۔۔ میر آہل۔۔۔ جو تم نہیں کر سکتے"

وہ ایک سیکنڈ رُکی

"اور ہاں آئندہ میرے سامنے آواز اونچی مت کرنا"

اس کے چہرے پر ایک عجیب سی وحشت طاری تھی۔ آہل محض دانت پیس کر رہ گیا۔ چند لمحے بعد دو کانسٹیبلز کمرے میں داخل ہوئے۔

"میم آپ جاسکتی ہیں"

اینا نے کٹیلی نظروں سے میر آہل کے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھا اور خاموشی سے اس کے برابر سے نکل گئی اور میر آہل وہاں تنہا کھڑا رہ گیا۔

پانچ گھنٹے گزر گئے تھے اور پولیس کو اس کیس کے متعلق کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔ جس شخص نے دل آویز پر فائر کیا تھا۔ اس کے بارے میں پولیس اب بھی چھان بین کر رہی تھی۔ تمام نیوز چینلز پر اینا اورنگزیب کے اس کیس میں ملوث ہونے کی خبروں کو چٹپٹے انداز میں نشر کیا جارہا تھا۔ اس ہل چل سے دور واپس ہسپتال کے اس خاموش کاریڈور میں آؤ تو یہاں چار سُو یاسیت بھرا ماحول تھا۔ مائیکل اور جولیانہ بینچ پر بیٹھے مسلسل دل آویز کی صحتیابی کی دعا مانگ رہے تھے۔ ڈاکٹرز نے آپریشن کے ذریعے بُلٹ تو نکال لی تھی۔ مگر دل آویز کا زندہ رہنا مشکل تھا۔ ہر گُزرتا پل اُسے زندگی سے دور لے جارہا تھا۔ ڈاکٹرز کے مطابق جب تک دل آویز بے ہوشی کی حالت میں تھی اس کے لئے ایک

ایک منٹ کریٹیکل تھا۔ میر آہل نے شیشے کے دوسری جانب زندگی اور موت کے درمیان جھولتی دل آویز کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر آکسیجن ماسک لگا تھا۔ اور ہاتھ کی پشت پر کینولا پیوست تھا۔ جس کے ذریعے ڈرپ میں موجود مائع اس کی نسوں کے رستے بدن میں داخل ہو رہا تھا۔ ایک نرس نے ڈِرپ میں انجیکشن لگایا اور مانیٹر پر نظریں مرکوز کئے فائل میں کچھ لکھنے لگی پھر روم سے باہر آگئی۔

میر آہل وہی شیشے کے سامنے کھڑا رہا آنکھیں صحرا ہو گئی تھیں۔ اُس نے شیشے کو آہستگی سے چُھوا جیسے اُس کے بے حس رخساروں کو چھو رہا ہو۔ کچھ گھنٹوں پہلے تک اس چہرے پر کتنی رونق تھی اور اب یہ چہرہ بنجر پڑا تھا۔ وہاں زندگی کی کوئی دمک نہیں تھی۔

محبت ہر پل انسان کو سُولی پر لٹکائے رکھتی ہے۔ کبھی لاحاصل کی تکلیف تو کبھی مل کر بھی محبت کو کھو دینے کا خوف۔ وہ دل آویز سے ملا تو اُسے لگا اب سب کامل ہے مگر وہ بھول گیا تھا کہ موت وہ دستک ہے جو اچانک خوشیوں کے دروازے پر پڑتی ہے اور سب ویران کر دیتی ہے۔ اس کی دنیا بھی ویران ہو رہی تھی اور وہ کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔

"یہ اللہ اس انتظار کو عارضی رکھنا ورنہ تیرا یہ بندا پھر سے ٹوٹ جائے گا"

اس نے سر شیشے سے ٹکاتے ہوئے سرگوشی کی تھی۔ انتظار کا ایک ایک لمحہ ایک صدی جیسا لگ رہا تھا۔

☆...☆...☆

الہان نے جیسے ہی برمنگھم لینڈ کیا اُسے ائیر پورٹ کے اندر ہی روک لیا گیا۔ کسی کو بھی ائیر پورٹ کی دسترس سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس نے پریشانی سے کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھا اور بادل ناخواستہ اورنگزیب عالمگیر کو کال کی۔ اس وقت اورنگزیب اپنے گھر کے ٹی وی لاؤنج میں رکھے جہازی صوفے پر ٹانگ رکھ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ جب الہان کی کال اُن کو موصول ہوئی تھی۔ اس کی اچانک برمنگھم آمد پر وہ کچھ حیران ہوئے تھے۔ وہ ایسے حالات میں الہان کے یہاں ہونے کی بلکل بھی توقع نہیں کر رہے تھے۔

خاص طور پر تب جب اینا کو پوچھ گچھ کے لئے تحویل میں لیا گیا تھا۔ بارحال اورنگزیب عالمگیر کا بھی شہر میں اثر ورسوخ تھا۔ انہوں نے فوراً ائیر پورٹ اتھارٹی کو فون کر کے الہان کو وہاں سے نکلنے کی اجازت دلوادی تھی۔

ساری جنگ ہی طاقت کی تھی۔ آغاز سے انجام تک یہ انسان ہی ہے جو اقتدار اور غلبے کی ہوس میں دوسرے انسان کو قتل کرتا آیا ہے۔ اگر انسانوں کو اس بات کا احساس ہو جائے کہ اُن کے غلبہ و تسلط کے شوق نے انسانیت کا کتنا نقصان کیا ہے تو وہ شیطان کو کوسنے کے بجائے اپنی ذات کی تصیح کی جنگ میں لگ جائے۔

☆...☆...☆

میر آہل نے دل آویز کے ہاتھ کو آہستگی سے اپنے ہاتھوں میں لیکر اپنی آنکھوں سے لگایا۔ ڈاکٹرز اپنی تمام تر کوششیں کرنے کے بعد اب مایوس ہو گئے تھے۔ تو پھر قسمت نے فیصلہ سُنا دیا تھا۔ وہ جا رہی تھی یہ پل میر آہل کی قُربت میں اُس کے چند آخری پل تھے۔

آہل کا دل اچانک بہت بھاری ہوا اتنا کے سانس لینا دشوار لگنے لگا۔

"تم یہ اچھا نہیں کر رہی میرے ساتھ"

اُس نے سر دل آویز کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"مجھے اکیلا چھوڑ کر جا رہی ہو"

وہ سِسکا

"مجھے پھر سے اندھیروں میں دھکیل کر جا رہی ہو"

دھڑکنوں کی رفتار مدھم ہوئی

"اس بار میں ان اندھیروں میں لوٹا تو پھر کبھی روشنی کی جانب نہیں آسکوں گا"

آنسوؤں کا گولا اُس کے حلق میں اٹکا

"م۔۔ میں تمہارے ساتھ پوری دُنیا گھومنا چاہتا تھا۔ تمہارا ہاتھ پکڑ کر کعبے کا طواف کرنا چاہتا مگر اب تم جا رہی ہو۔۔۔ م۔۔۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر۔۔۔ میرے خوابوں کو ادھورا چھوڑ کر"

وہ نا چاہتے ہوئے بھی ہچکیوں سے رونے لگا۔ ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں آنکھ اور دل دونوں میں چُبھنے لگیں۔

"میں چاہتا تھا ہماری ایک بیٹی ہو جس کی آنکھیں بلکل تمہارے جیسی ہو۔۔۔ وہ آنکھیں جس نے میرے دل کو تمہارے آگے گھُٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا"

اُس نے روتے روتے دل آویز کے ہاتھ کی پشت کو اپنے گیلے ہونٹوں سے لگایا مگر نظر اٹھا کر اس کے بے جان ہوتے چہرے کی جانب دیکھنے کی ہمت نہیں کی۔ میر آہل میں اتنا جگر، اتنا حوصلہ نہیں تھا۔

"میں نے سوچا تھا اگر ہمارا بیٹا ہوا تو اُسے میں کبھی بھی اپنے جیسا پتھر دل نہیں بننے دونگا۔ وہ بھی بلکل تم جیسا ہو گا۔۔۔ بلکل تمہاری طرح"

وہ روتے روتے یاسیت سے مُسکرایا۔ اس کے اعصاب شل ہو گئے تھے۔ وہ پتا نہیں کس امید سے دل آویز کو یہ باتیں بتا رہا تھا۔ جیسے یہ باتیں وہ سُن رہی ہو گی۔ یہ باتیں سُن کر وہ رُک جائے گی۔ یوں جیسے ابھی نیند سے اٹھ کر میر آہل کو گلے سے لگا لے گی۔ اس خاموش کمرے میں اس وقت میر آہل کی سسکیوں کی آواز گونج رہی تھی۔ آج موت بھی اپنی بے رحمی پر افسردہ تھی۔ زمین سے آسمان تک ہر چیز میر آہل کی بے بسی پر ماتم کر رہی تھی۔

میر آہل ہار چُکا تھا۔ وہ جس نے سب کو مات دی تھی آج زندگی سے اپنی زندگی کو ہار بیٹھا تھا۔

"مت جاو پلیز"

اس خاموش کمرے میں آہل کی بے درد سسکیوں کے درمیان کسی نے بہت آہستگی سے میر آہل کے شکست خوردہ وجود پر اپنے لمس کہ بارش کی تھی۔

"آ۔۔ آپ نے۔۔ و۔۔ وہ۔۔ سب تو۔۔ کہہ دیا۔۔ جو۔۔ آ۔۔ آپ کے۔۔ دل۔۔ میں۔۔ تھا مگر۔۔ وہ۔۔ نہیں۔۔ کہا۔۔ جو۔۔ مجھے س۔۔۔ سننا ہے"

میر آہل کا سانس ساکن ہوا۔ اس نے چونک کر ایک جھٹکے سے سر اُٹھایا۔ دل آویز اپنی بوجھل پلکیں آہستگی سے اٹھا کر اُسے مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔ اس کے گال آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے۔ میر آہل کا چہرہ حیرت سے سفید ہوا۔

حیرت، خوشی، آنسوں اور لمحے بھر کی خاموشی

"بولئے نہ آہل۔۔۔ پلیز"

دل آویز نے آہستگی سے اپنے چہرے پر لگے ماسک کو نیچے کرتے ہوئے کہا تھا۔ یہ اس لمحے کی حیرت تھی جس نے میر آہل کے ہونٹوں پر قفل ڈال دیئے تھے۔ یہ اُس کے ساتھ کیا ہو گیا تھا اُسے سمجھ نہیں آیا یہ معجزہ تھا یہ وہ کوئی

خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ پل گنگ نگاہوں سے بنا پلک جھپکے دل آویز کو دیکھتا رہا پھر یکدم ایک بھاری سانس اپنے پھیپھڑوں میں اُتارتے ہوئے دوبارہ اس کے ہاتھ پر سر ٹکا کر دل کھول کر رو دِیا۔ دل آویز اُسے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتا ہوا دیکھ کر نم آنکھوں سے مسکرائی تھی۔

"آئی لو یو۔۔"

وہ ہچکیوں کے درمیان بولا۔

"آئی لو یو سو مچ"

وہ اس کے ہاتھ کو ہونٹوں اور آنکھوں سے لگاتے ہوئے دیوانوں کی طرح بولا۔

"آئی لو یو ٹو دی کور آف مائے ہارٹ"

دل آویز نے اپنا ہاتھ اس کے بھیگے چہرے پر رکھا تو وہ نہال ہو گیا۔ اللہ نے اس آزمائش سے میر آہل کو بچا لیا تھا۔ اس نے اپنے بندے کو اندھیروں میں گھرنے نہیں دیا۔ دل آویز اس کے اظہار پر فریفتہ ہو گئی تھی۔ وہ اب دل آویز کے سینے سے لگا اپنے رب کی نعمتوں کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ آج ان دونوں کی محبتیں کامل ہو گئی تھیں۔

یہ منظر مائیکل اور جولیانہ نے گلاس ونڈو سے دیکھا تھا۔۔ جولیانہ خوشی سے روتے روتے پیچھے دیوار سے جا لگی تھی۔ اس منظر نے مائیکل کی آنکھوں کو بھی بھیگا دیا تھا۔ سب کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ رب کا جتنا شکریہ ادا کیا جاتا کم تھا۔ اس نے سب کی خوشیوں کو دُگنا کر کے جو لوٹایا تھا۔

☆...☆...☆

گاڑی سے اُتر کر الہان نے بیس منزلہ پُر شکوہ بلڈنگ کی جانب دیکھا تھا۔ جس کا آرکیٹیکچر جدیدیت کا حامل اور نہایت خوبصورت تھا۔ ائیر پورٹ سے ہوٹل کا رستہ یوں تو بیس سے پچیس منٹ کا تھا۔ مگر آج اُسے یہاں تک آتے آتے ایک سے سوا گھنٹہ لگ گیا تھا۔ پورے شہر میں ناکا بندی ہونے کے سبب ہر گاڑی کو روک کر مکمل چھان بین کے بعد ہی آگے جانے دیا جا رہا تھا۔ یہ برمنگھم شہر کی مصروف شاہراہوں میں سے ایک تھی. مگر آج قرب وجوار میں خطرناک حد تک سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ اس سناٹے میں بھی آواری ہوٹل پورے شان سے سر اُٹھائے کھڑا تھا۔

الہان ایک بھی لمحہ ضائع کیئے بغیر ہوٹل کی حدود میں داخل ہو گیا۔ مین انٹرنس پر موجود گارڈ نے اُسے دیکھتے ہی مسکرا کر شیشے کا دروازہ اس کے لئے کھولا تھا۔ آس پاس موجود اسٹاف الہان کو دیکھتے ہی رُک کر اُسے رُک کر گریٹ کرنے لگتے یوں جیسے وہاں موجود سب لوگ اُسے پہلے سے ہی جانتے ہو۔ وہ سر کے اشارے سے سب کو جواب دیتا سیدھا لفٹ کی سمت بڑھ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کی منزل کیا تھی۔ لفٹ اٹھارویں منزل پر جا کر ساکن ہو گئی۔

راہداری کے دونوں جانب کمرے تھے وہ بنا رُکے راہداری عبور کر کے آگے سے دائیں جانب مُڑ کر دوسری راہداری میں داخل ہوا۔ اس راہداری کے دائیں جانب ایک ساتھ چار کمرے تھے اور بائیں جانب ریلنگ تھی۔ یہاں سے رات کی تاریکی میں برمنگھم تاروں کی طرح جھلملاتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ راہداری کے آخر میں موجود کمرے کے سامنے جا کر رُک گیا اور دو انگلیوں سے دروازے پر دستک دی۔

مگر آگے سے کوئی جواب نہیں آیا اُس نے دوبارہ سابقے انداز میں دستک دی اب بھی دوسری جانب مکمل سناٹا تھا۔ اس بار الہان نے دستک دینے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ مقابل نے تیسری دستک سے پہلے ہی دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ دونوں آج پھر آمنے سامنے کھڑے تھے۔ اینا نے گردن دائیں جانب گرا کر تنزیہ مسکراہٹ سے الہان کے سپاٹ چہرے کو دیکھا تھا پھر گھوم کر دوبارہ چھوٹے سے بار کاؤنٹر کے سامنے رکھی چیئر پر جا کر بیٹھ گئی۔

الہان بھی اس کے پیچھے پیچھے وی-آئی-پی سویٹ میں داخل ہوا اور دروازہ مقفل کر دیا۔

" آج کی تاریخ میں رونما ہونے والے ڈرامے میں بس ایک تمہاری انٹری باقی تھی وہ بھی ہو گئی "

اس نے گلاس میں موجود باقی مائع پیتے ہوئے تنزیہ انداز میں کہا مگر الہان کچھ نہیں بولا وہ ہنوز سپاٹ چہرہ لئے آنکھیں سکیڑ کر اُسے دیکھتا رہا۔

" جسے دیکھو دل آویز۔۔۔ دل آویز کرتا رہتا ہے۔ جیسے اس پوری دنیا میں دل آویز کے سوا کوئی دوسرا ہے ہی نہیں۔۔۔ تمہیں پتا ہے کچھ دیر پہلے ڈیڈ کی کال آئی تھی اینڈ گیس واٹ وہ بھی دل آویز کے لئے فکر مند تھے۔۔۔ اونہوں۔۔۔ "

اس نے ہنکارا بھرا اور شراب کی بوتل کو گلاس میں اُنڈیلا مگر گلاس کو ہونٹوں سے نہیں لگایا۔ الہان کی خاموشی اس کی سماعتیں پھاڑ رہی تھیں۔

"تم بھی کہہ دو جو کہنا ہے۔ میر آہل، پولیس آفیسر اور ڈیڈ کی طرح"

اس نے پیچھے کھڑے الہان کو مڑ کر غصے سے دیکھا مگر اس کی آنکھوں میں موجود اپنے لئے ترس دیکھ کر اس کے تن بدن میں عجیب قسم کا اُبال اُٹھا۔

"تمہیں بھی لگتا ہے نہ دل آویز کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا وہ میں نے کروایا ہے۔۔۔ بولو"

اس نے ایک پل کے لئے رُک الہان کی بنجر آنکھوں میں دیکھا اتنی خالی آنکھیں اس نے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔

"ہاں۔۔۔ میں نے ہی یہ سب کیا ہے"

اس نے گلاس کو غور سے دیکھتے ہوئے عجیب انداز میں سرگوشی کی

"سب میں نے کیا ہے دل آویز پر فائر میں نے کروایا ہے"

اس نے کاؤنٹر کے کنارے کو سختی سے بھینچا

"میں ایسی ہی ہوں میں ہار برداشت نہیں کر سکتی کسی بھی حالات میں، کسی بھی صورت میں مجھے۔۔۔"

رک کر انگلی سے اپنے سینے پر دستک دی

"مجھے کوئی بھی مات نہیں دے سکتا۔ اگر مجھے میری محبت نہیں مل سکتی تو پھر میر آہل کو بھی اُس کی محبت نہیں مل سکتی۔ میں جس تکلیف سے گزری ہوں۔ اُسے بھی اِسی درد سے گزرنا پڑے گا کیونکہ یکطرفہ محبتیں خراج مانگتی ہیں "

وہ چلاتے ہوئے بولی مگر الہان کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا۔

"بہت محبت کی تھی میں نے اُس سے مگر اس نے مجھ پر اس دو ٹکے کی لڑکی کو فوقیت دی۔ کیا مانگا تھا میں نے بس اس کی زندگی میں تھوڑی سی جگہ"

اس نے غصے سے ہاتھ مار کر کاؤنٹر پر رکھی بوتل اور گلاس کو زمین پر پھینک دیا۔ کانچ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ماربل پر بکھر گئے۔ گلاس میں موجود مائع سفید فرش پر فانوس کی روشنی میں چمکنے لگا۔

"کیا زیادہ مانگا تھا میں نے بولو کیا زیادہ مانگ لیا تھا میں نے"

وہ چیخ رہی تھی، چِلا رہی تھی مگر سامنے والا مکمل سناٹے میں تھا۔

"اتنے گلٹ کے ساتھ تم زندگی کیسے گزارو گی اینا؟"

اینا نے مڑ کر الہان کو دیکھا اور کچھ پل خاموشی سے دیکھتی چلی گئی پھر یکدم بلند بانگ قہقہہ لگا کر ہنسی اور پھر ہنستی چلی گئی۔

"گلٹ؟"

وہ الہان کے گرد زور زور سے ہنستے ہوئے چکر کاٹنے لگی۔ مگر الہان اپنی جگہ ساکن کھڑا رہا۔

"کس بات کا گلٹ الہان۔۔۔ کس گلٹ کی بات کر رہے ہو تم؟"

وہ یکدم سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس کے بلمقابل آکر کھڑی ہو گئی۔

"تم نے دل آویز کو جان سے مارنے کی کوشش کی ہے اینا اسی بات کا گلٹ"

الہان کے ماتھے پر بل پڑے۔

"کون ثابت کرے گا کہ میں نے دل آویز کو مروانے کی کوشش کی ہے۔۔۔ کیا ہے کوئی ثبوت؟"

اس نے مکاری سے بھنویں اُچکاتے ہوئے مسکرا کر الہان کو دیکھا۔

"دل آویز پر قاتلانہ حملہ میں نے یعنی اینا اورنگزیب نے کروایا ہے کون ثابت کرے گا بتاو؟"

اینا کی ہنسی وحشت میں بدلی

" صحیح کہا تم نے اینا"

اُس نے افسردگی سے نیچے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کوئی تمہارے خلاف ثبوت پیش نہیں کر سکتا"

الہان نے سر کو دائیں بائیں ہلایا

"سوائے تُمہارے"

اینا نے چیلنجنگ انداز میں الہان کو دیکھ کر تمسخرانہ انداز میں مسکرائی تو جواباً الہان بھی یاسیت سے مُسکرایا۔

"اپنا خیال رکھنا اینا"

اُس نے نرمی سے اینا کے گال کو چھو کر کہا تو اس نے سوالیہ نظروں سے الہان کو گھورا

"کیونکہ آج کے بعد ہم دونوں کبھی نہیں ملیں گے"

وہ اُلٹے پیر دو قدم پیچھے ہوا مگر اُس کی نظر اب بھی اینا کے رنگ بدلتے چہرے پر تھی۔

کچھ بہت عجیب تھا اس کے انداز میں جو اینا اور نگزیب کو کھٹکا۔ الہان نے آہستگی سے سویٹ کا دروازہ کھولا، پیچھے اینا ٹکٹکی باندھے اُسے گھور رہی تھی۔ وہ رُکا مگر اس نے پلٹ کر اینا کو نہیں دیکھا۔

"کوئی تمہارے خلاف ثبوت پیش نہیں کر سکتا سوائے تمہارے۔۔۔ اینا"

وہ رسان سے بول کر کمرے سے نکل گیا اور اینا سناٹے میں آ گئی۔

راہداری عبور کرتے ہوئے الہان نے اپنی شرٹ پر لگے سب سے اُوپر والے بٹن پر اُنگلی پھیری تھی۔ لفٹ میں داخل ہوتے ہی اُس نے اپنے آپ کو دھات کی دیوار میں غور سے دیکھا تھا۔

اٹھارویں منزل سے گراؤنڈ فلور تک آنے میں تقریباً بیس سیکنڈز لگتے تھے۔ اور آج اِن بیس سیکنڈز میں اینا اور نگزیب کی پوری زندگی بدل گئی تھی۔

الہان لفٹ سے باہر نکلا فوئر سے گزرتے ہوئے اُس نے ایک نظر ریسیپشن کی دیوار پر نصب اسکرین پر ڈالی

"ایک تہلکہ خیز خبر۔۔۔

مشہور بزنس ٹائیکون میر آہل کی بیوی جن پر کچھ گھنٹوں پہلے ہی قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ سوشل میڈیا پر ابھی چند سیکنڈ پہلے وائرل ہوئی ایک ویڈیو سے معلوم ہوا ہے کہ اُن پر حملہ کروانے والا کوئی اور نہیں بلکہ شہر کے مشہور بزنس مین اور نگزیب عالمگیر کی اکلوتی بیٹی اینا اور نگزیب ہیں۔ یہ ہے وہ ویڈیو جس میں اینا اور نگزیب خود اپنے جُرم کا اعتراف کرتی نظر آ رہی ہیں"

نیوز چینل پر اینا اور نگزیب کی ویڈیو نشر کی جا رہی تھی۔ الہان کی آنکھوں سے چند آنسوں کے قطرے نکل کر اس کے رخساروں پر بہہ نکلے۔ آس پاس سے گزرتا ہوا ہر شخص رُک کر اسکرین پر بار بار چلتی اینا کی ویڈیو کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اور آپس میں سرگوشی کر رہے تھے۔

ریسیپشن پر موجود تقریباً الہان کی عمر کے لڑکے نے اُسے چونک کر دیکھا پھر خاموشی سے سر نیچے جُھکا دیا۔ وہ اس ہوٹل میں کافی عرصے سے کام کر رہا تھا۔ اس نے بہت بار اینا اور الہان کو اس ہوٹل میں آتے جاتے دیکھا تھا۔ الہان مزید وہاں نہیں رُک سکا وہ لمبے ڈگ بھر تا عمارت سے باہر نکل گیا۔

جب وہ یہاں آیا تھا تو ہر طرف ایک خوفناک سا سناٹا تھا اور اب جب وہ یہاں سے جا رہا تھا تو ایک خوفناک قسم کی ہلچل مچ گئی تھی۔

☆...☆...☆

ٹھیک پچپن منٹ بعد وہ دوبارہ لنڈن جانے کے لئے برمنگھم ائیر پورٹ کے ٹرانزٹ لاؤنج میں موجود ایک بینچ پر بیٹھا اپنی فلائٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ جو کسی وجہ سے بیس منٹ لیٹ تھی۔ اس جیسے اور بہت سے مسافر وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ دائیں جانب شیشے کی دیوار تھی جس سے باہر جھانک کر دیکھو تو ایک قطار میں چند طیارے کھڑے تھے۔ اور رن وے بلکل سنسان پڑا تھا۔ اُوپر سامنے دیوار پر ایل-ای-ڈی لگی ہوئی تھی۔

نیوز چینل پر اینا اورنگزیب کے متعلق پل پل کی خبر کو نشر کیا جا رہا تھا۔

"آخر کار پولیس نے اینا اورنگزیب کی لوکیشن ٹریس کر لی ہے وہ اپنے ذاتی ہوٹل آواری میں اس وقت موجود ہیں"

الہان دونوں کہنیاں گھٹنے پر ٹکائے خالی الذہنی کی کیفیت میں نیوز چینل پر چلتے سارے مناظر دیکھ رہا تھا۔ پولیس ہوٹل کو گھیرے کھڑی تھی۔ اس نے منہ اپنی ہتھیلیوں میں چُھپا لیا۔ اس کے آگے وہ مزید نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اپنی بہن کے ہتھکڑی لگے ہاتھ دیکھنے کی ہمت اُس میں نہیں تھی۔ وہ کب سے اتنا حساس ہو گیا تھا۔ اُسے خود پتا نہیں چلا تھا۔

وہ بس جلد از جلد اس شہر سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس شہر سے اس کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ وہ یادیں جو اب اُسے جینے نہیں دیتی تھیں۔ اس شہر میں اُس نے اپنا سب کچھ کھویا تھا۔ بڑا ظلم کیا تھا برمنگھم نے الہان پر۔۔۔ بڑا ظلم

اناؤنسمنٹ ہوتے ہی اس نے ہتھیلی سے اپنے آنسوؤں کو خشک کیا پھر کلائی پر بندھی کھڑی پر نظر ڈالی اور ایگزٹ ڈور کی جانب چل پڑا اور الہان نے پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ کسی کو چھوڑ کر جاتے ہوئے پلٹ کر دیکھنے سے ارادے کمزور پڑنے لگتے ہیں اور وہ کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

کیونکہ کمزور مردوں کو یہ دنیا بڑی حقارت بھری نظروں سے دیکھتی ہے۔

☆...☆...☆

میر آہل ایک پل کے لئے بھی دل آویز کے پاس سے ہلا نہیں تھا۔ دل آویز نیم بے ہوشی میں تھی اور آہل ٹکٹکی باندھے مرعوب سا اُسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے چاند کو چکور دیکھتا ہے۔ اس کی زندگی کی روشنی لوٹ آئی تھی۔ اس چہرے پر ایک بار پھر زندگی کی دمک دکھائی دینے لگی تھی۔

کوئی میر آہل کو دیکھ لیتا تو دیوانہ کہتا۔۔۔ اعلم یہ تھا کہ مقابل نے پلکیں تک نہیں جھپکی تھیں کہ محبوب نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے یا پھر اگر یہ خواب ہے تو کہیں وہ نیند سے جاگ نہ جائے۔ آہل کے چہرے کی مسکراہٹ نے اس کے اندر کا حال کھول کر رکھ دیا تھا۔ وہ ہاتھ کا مُکا ٹھوڑی کے نیچے ٹکائے اُسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔

"میری زندگی میں ایسے موقعے بہت کم آئے ہیں کہ میں نے اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کیا ہو، میں بیوقوف کتنا غافل تھا اس کی نعمتوں اور برکتوں سے، لیکن آج کے بعد میں کبھی بھی اس کا شکر ادا کئے بغیر سو نہیں پاؤں گا"

وہ اپنے خیالات کی اوٹ میں مسکرایا جب کسی نے میر آہل کے کندھے پر آہستگی سے اپنا ہاتھ رکھا تھا تو وہ چونکا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا تو مائیکل اُس کے سر پر کھڑا تھا۔

"یار مائیکل کبھی تو کباب میں ہڈی بننے سے گُریز کرو" اس نے بیزاری سے سر کو زنبش دی۔

مائیکل کچھ کہنے کے بجائے خاموش ہو گیا۔ اس کی جانب سے مکمل خاموشی محسوس کرتے ہوئے میر آہل نے پھر سے پلٹ کر اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"سر"

اس نے دروازے کی جانب سر سے اشارہ کرتے ہوئے سنجیدگی سے اُسے مخاطب کیا تو میر آہل نے ایک نظر دل آویز پر ڈالی اور کوٹ کا بٹن مقفل کرتے ہوئے اس کے ساتھ کمرے سے باہر آگیا۔

"کیا ہوا مائیک"

اُس کے ماتھے پر بل پڑے

"سر اُس شخص کا پتا چل گیا ہے"

"کون ہے"

یکدم میر آہل کی آواز بدلی

جواب میں کچھ کہنے کے بجائے مائیکل نے فون کی اسکرین اُس کے سامنے کر دی۔

اینا اورنگزیب کی وائرل ویڈیو اسکرین پر اُبھری۔۔۔ میر آہل کی آنکھوں کا رنگ بدلا اور جبڑے سختی سے بھینچ گئے۔ کوئی بھی اس لمحے میر آہل کے چہرے پر اُبھرتے تاثرات کو دیکھ لیتا تو ڈر جاتا وہاں قیامت بپا تھی۔ سامنے سے آتی جولیانہ کے قدم سُست ہوئے۔ میر آہل کو اتنے طیش میں دیکھ کر وہ راہداری کے سرے پر ہی رُک گئی۔

"مائیکل گاڑی نکالو"

میر آہل نے ضبط سے مٹھی بھینچتے ہوئے اُسے حکم دیا اور الفاظ اُس کے منہ سے نکلنے کی دیر تھی۔ مائیکل نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی۔۔۔ جاتے جاتے میر آہل جولیانہ کے پاس رُکا۔

"ڈونٹ وری سر میں میم کا دھیان رکھوں گی"

وہ میر آہل کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کی بات سمجھ گئی تھی۔ آہل ایک لمحہ ضائع کئے بغیر لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

اینا اورنگزیب کے وی آئی پی سویٹ میں اس وقت بلا کا سناٹا تھا اور اس سناٹے میں محض نیوز چینل پر چیختے اینکر کی آواز گونج رہی تھی۔ اُس نے بیزاری سے بھنویں اُچکاتے ہوئے پاس رکھا ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی بند کر دیا۔ اب کمرے میں صرف اس کی سانسوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

اس خوفناک سناٹے اور خاموش سانسوں کے درمیان ایک محشر بپا تھا جس کا عالم صرف اینا ہی محسوس کر سکتی تھی۔ وہ اٹھی اور سیدھا واش روم میں داخل ہو گئی۔ سامنے دیوار پر آئینہ لگا تھا۔ جس میں اس نے خود کو بغور دیکھا تھا۔

وہ کچھ دیر خاموشی سے بس خود کو دیکھتی چلی گئی پھر وارڈروب سے سیاہ رنگ کا سِلک کا گاؤن نکالا۔۔۔۔ چند لمحوں بعد وہ سیاہ گاؤن میں ملبوس سجی سنوری آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے آج آنکھوں میں بھر کر کاجل لگایا تھا۔ ہونٹوں پر سرخ رنگ کی لپسٹک تھی۔ اینا نے انگلی کے پوروں سے ہونٹ کے کنارے سے اپنی لپسٹک دُرست کی اور سیاہ ہائی ہیلز میں باری باری پاؤں ڈالے اب وہ اپنے قد سے پانچ انچ مزید لمبی لگ رہی تھی۔

بلاشبہ وہ بہت حسین تھی اُس سے محبت کرنے والے دعویداروں کی کمی نہیں تھی لیکن اینا نے جس کی محبت کا کلمہ پڑھا تھا وہ اس کی محبت کا انکاری تھا۔ وہ خود کو شیشے میں دیکھ کر یاسیت سے مسکرائی۔ جس خوبصورتی پر اُسے ناز تھا، آج وہی حُسن اُسے پھیکا پھیکا لگ رہا تھا۔ آنسوں کا ایک قطرہ اس کی آنکھ کے کنارے پر آکر ٹھہر گیا۔ افسوس اُس کے تابوت میں آخری کیل ٹھوکنے والا کوئی اور نہیں اُس کا بھائی تھا۔

آنکھ کے کنارے پر ٹھہرا ہوا آنسوں باہر نہیں نکلا بلکہ وہی خشک ہو گیا۔ اُسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ اینا اورنگزیب نے گہری سانس لی اور سر اٹھا کر آئینے میں ایک آخری بار خود کو دیکھا اس کی نگاہوں میں اپنے لئے اچانک رشک اُبھرا تھا۔

اُس نے کبھی کسی کے آگے سر نہیں جھکایا تھا تو اب کیسے جُھکا دیتی۔ اس نے تفاخر سے خود کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے قدم دروازے کی جانب بڑھا دیئے۔ وہ سیاہ تھی۔۔۔۔ اور اُسے اپنی یہ سیاہی دلوں جان سے قبول تھی۔ اُس نے جو کیا اپنے لئے کیا تھا۔ اپنی انا کی تسکین کے لئے کیا تھا اور اُسے اپنے کئے پر کوئی شرمندگی نہیں تھی۔ دروازے کے سامنے جا کر وہ رُک گئی۔

قسمت نے تمام دروازے اُس پر بند کر دیئے تھے تو کیا ہوا آج ایک دروازہ وہ خود پر کھولنے والی تھی۔ اور اس بار اینا اورنگزیب اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنے جا رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور چند کانسٹیبلز اُس کے سامنے ریوالور تانے اندر داخل ہوئے تھے۔

"مس اینا اورنگزیب ہمارے پاس آپ کی گرفتاری کے آرڈرز ہیں"

اینا اورنگزیب کی کہانی کا آغاز جس نے بھی لکھا ہو مگر اپنی کہانی کا انجام وہ خود لکھنا چاہتی تھی۔ بلکل اپنے انداز میں اور اس کا انداز سیاہ تھا۔ اندھیرے سے بھی زیادہ گہرا، رات سے بھی زیادہ کالا۔۔۔ اینا اورنگزیب جیسا سیاہ۔

اُن کی پشت پر چمکتے ہوئے سورج سے پھوٹتی شعاعیں اُس کے چہرے پر گریں تو اینا کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اُس نے جھنجھلا کر ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھا تھا۔ وہ سیاہ تھی تو اُجالا اُسے کیسے راس آسکتا تھا۔

"چُپ چاپ سرینڈر کر دیں"

فیمیل کانسٹیبل نے تنبیہ کی

اینا اورنگزیب نے چہرے سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے آنکھیں سکوڑ کر اُنہیں گردن دائیں جانب گراتے ہوئے مغرور سے انداز میں دیکھا۔ اینا کی خاموشی ماحول میں ہیجان پیدا کر رہی تھی۔ خطرہ محسوس کرتے ہوئے کانسٹیبلز کی گرفت ریوالور پر مزید مضبوط ہوئی۔ اینا اورنگزیب نے ان کے محتاط انداز پر فیمیل کانسٹیبلز کو مسکرا کر دیکھا تھا۔ اُسے ان کی آنکھوں میں یہ خوف پسند آیا تھا اور پھر بنا کسی مزاحمت کے اینا نے اپنی دونوں کلائیاں آہستگی سے پولیس کانسٹیبلز کے آگے پھیلا دیں۔ فیمیل کانسٹیبل کچھ لمحے تو حیرت سے اینا اورنگزیب اور اُس کی کلائیوں کو دیکھتی رہی پھر ریوالور کو واپس ہولسٹر میں اڑستے ہوئے آگے آئی اور اینا اورنگزیب کے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑی لگا دی۔

دو میل کانسٹیبلز اینا اورنگزیب کے آگے اور دو فیمیل کانسٹیبلز اُس کے پیچھے موجود تھے۔ جب اُسے کمرے سے باہر لایا گیا۔ سامنے ریلنگ سے نیچے جھانک کر دیکھو تو پورے شہر کی میڈیا ہوٹل کے باہر موجود تھی۔ وہ چند قدم آگے بڑھے ہی تھے کہ سامنے سے میر آہل انہیں کی سمت آتا دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے مائیکل بھی موجود تھا۔ اُسے دیکھ کر پولیس کانسٹیبلز آگے سے ہٹ گئے۔ میر آہل اور اینا اورنگزیب کی نگاہیں بروقت ایک دوسرے سے ٹکرائی تھیں۔

یہاں آتے ہوئے اُس نے سوچا تھا کہ جب اینا اس کے سامنے آئے گی تو دل آویز کو ضرر پہچانے کے جرم میں وہ اُسے سزائے موت دے دیگا مگر نجانے کیوں اِس لمحے اُسے اینا کے حال پر ترس آیا۔

جو لوگ اپنی موت سے پہلے ہی مر جاتے ہیں ان کی سب سے بڑی سزا زندگی ہوتی ہے۔

اینا اورنگزیب چند لمحے یوں ہی خالی نظروں سے میر آہل کو دیکھتی رہی اور پھر یاسیت سے مسکرائی۔

"اِس سے زیادہ بُرا کیا ہو گا میرا۔۔۔ میرے تو دشمن بھی اب مجھے نفرت سے نہیں دیکھتے"

اُس نے زوردار قہقہہ لگایا تھا مگر اس قہقہہ میں بلا کی اُداسی تھی۔ میر آہل دونوں ہاتھ جیب میں مُقید کئے اُسے کھڑا خاموشی سے دیکھتا رہا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ چاہ کر بھی میر آہل اُس سے نفرت نہیں کر پا رہا تھا۔ یکدم ہوا کا رُخ بدلا۔۔۔

"یہ مت سوچنا میر آہل کے میں تمہیں بھول جاؤں گی"

ہتھکڑی لگے ہاتھوں سے اینا نے اپنے چہرے پر آئی لٹوں کو کان کے پیچھے اڑسا تھا۔

"تم نے ایک بار پوچھا تھا مجھ سے کہ میرے لئے محبت کیا ہے"

وہ فاتحانہ انداز میں مسکرائی۔ میر آہل بنا کسی تاثر کے اُس کی بات سنتا رہا۔

"میں آج تمہیں بتاتی ہوں میرے لئے محبت کیا ہے"

وہ ذرا سا آگے آئی تو فیمیل کانسٹیبلز نے اُسے بازوؤں سے تھام کر پیچھے کھینچا مگر اینا نے بات جاری رکھی۔

"میں اپنی محبت میں جنون کی کوئی بھی حد توڑ سکتی ہوں"

میر آہل نے اپنی بھنویں مستفسرانہ انداز میں اُچکائیں۔

"میں کسی کو بھی مار سکتی ہوں"

وہ سانس لینے کو رُکی مگر اس نے سانس نہیں لی۔ اینا اورنگزیب کے چہرے پر ایک پر اسرار سی مسکراہٹ اُبھری تھی اور آنکھوں میں ایک عجیب سا تاثر تھا۔ ہوا کا رُخ اینا کے مخالف تھا اُس کے بال پھڑ پھڑانے لگے۔

"اور خود مر بھی سکتی ہوں"

یہ کہتے ہی اس نے فیمیل کانسٹیبلز کو پوری شدت سے پیچھے کی جانب دھکا دیا تھا۔ اینا کے اچانک دھکے کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ دونوں لڑکھڑا کر زمین پر جا گریں تھیں اور اینا اورنگزیب نے پلک جھپکتے ہی ریلنگ سے نیچے چھلانگ لگا لی۔ ہواؤں کا رُخ ایک بار پھر بدلا تھا۔ میر آہل سمیت وہاں موجود تمام افراد دوڑ کر ریلنگ تک آئے تھے۔

سب کچھ سیکنڈز کی رفتار میں ہوا تھا اور اِن چند سیکنڈز نے بساط پلٹ دی تھی۔ ہواؤں کی بانہوں میں جھولتی اینا نے مسکرا کر آخری بار میر آہل کا عکس اپنی آنکھوں میں مُقید کیا تھا۔

اینا اورنگزیب اپنی زبان کی پکی تھی اس نے کہا تھا وہ محبت میں خود مر بھی سکتی ہے اور آخری سانس تک وہ اپنی بات پر قائم رہی۔۔۔ وہ مر گئی۔

جب لمحہ دھندلا لگتا ہے اور یادیں دھندلی ہو جاتی ہیں، جب روح گھلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور دل کی دھڑکنیں ساکن ہو جاتی ہیں تو اُس لمحے آپ دنیا کی تمام بندشوں سے بری الزمہ ہو جاتے ہیں۔ آپ سکون میں آجاتے ہیں۔ آپ کی دنیا شانت ہو جاتی ہے۔ سارے حساب برابر ہو جاتے ہیں۔

وہ کوئی جِن یا آسیب نہیں تھی وہ اینا اورنگزیب تھی جو میر آہل پر عاشق ہوئی تھی۔ جیتے جی وہ کبھی میر آہل کے ساتھ نہیں رہ سکی مگر مرنے کے بعد اب دِن کے ایک پہر وہ کسی سائے کی طرح اُس کے ساتھ رہتی تھی۔ اُس کا خیال بن کر۔۔۔ میر آہل کو اینا اورنگزیب سے محبت نہ کرنے کا پچھتاوا نہیں تھا مگر اس کے چلے جانے کا افسوس ضرور تھا۔

کچھ لوگ آپ کے لئے مر بھی سکتے ہیں یہ جاننے کے باوجود بھی آپ کو اُن سے محبت نہیں ہو پاتی پتا نہیں کیوں لیکن محبت کی جنگ میں اکثر لوگ، وقت، حالات اور قسمت سب آپ کے مخالف ہو جاتے ہیں۔ لیکن اینا اورنگزیب کے لئے یہ محبت یا نفرت کی جنگ نہیں تھی۔ اُس کے لئے یہ انا کی جنگ تھی۔ اُسے محبت نہ ملنے سے زیادہ ٹھکرائے جانے کا غصہ تھا۔ وہ اپنی سیاہی سمیت اس دنیا سے چلی گئی تھی۔ اینا نے محبت تو کی مگر وہ محبت کی معراج کو نہ چُھو سکی۔۔۔ اپنے اندر کی سیاہی کو نہ مات دے سکی۔ اپنی انا، اپنی "میں" کا گلا نہیں گھونٹ سکی اور محبت کا تو تقاضا ہے اپنی انا کا قتل کرنا اپنی "میں" کو مٹا کر "تُو" ہو جانا۔

☆...☆...☆

(بیس دن بعد)

"پلیز آہل اور نہیں پینا یہ بلکل پھیکا ہے"

وہ نیپکن سے ہونٹوں کے کنارے خشک کرتے ہوئے بولی مگر آہل نے زبردستی سوپ کا ایک اور چمچ اس کی جانب بڑھادیا جِسے مجبوراًدل آویز کو پینا پڑا۔

وہ دونوں لونگ روم میں صوفے پر بیٹھے تھے پیچھے گلاس وال سے روشنی ان دونوں پر ِگر رہی تھی اور میر خلیل لونگ روم کے دروازے پر کھڑے دونوں کو دیکھ کر نرمی سے مسکرا رہے تھے۔

آج ان کی پاکستان واپسی تھی۔وہ جانے سے پہلے دونوں کو الوداع کہنا چاہتے تھے۔جب اُنہیں دل آویز کے ساتھ ہوئے حادثے کے بارے میں علم ہوا تو وہ دو دن بعد ہی برمنگھم پہنچ گئے تھے۔

"بس یہ آخری چمچ ہے دل آویز"

"کب سے آخری چمچ بول بول کر پلائے جا رہے ہیں"

دل آویز زچ ہوئی۔

"پرامس یہ آخری ہے"

میر آہل اُس کی چڑی ہوئی شکل دیکھ کر محظوظ ہوا۔اُس نے آخری سوپ کا چمچ اُسے پلا کر باؤل دوبارہ ٹرے میں رکھا۔میر خلیل آہستگی سے گلا کھنکار کر لونگ روم میں داخل ہوئے تو دل آویز اور میر آہل دونوں اُن کی جانب متوجہ ہوئے۔دل آویز اُنہیں دیکھ کر ہلکا سا مسکرائی جبکہ میر آہل نے پہلو بدلا۔

"کیسی ہے میری بیٹی"

انہوں نے شفقت سے دل آویز کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا حال دریافت کیا۔

"اب بہت بہتر ہوں چاچو"

وہ مسکرائی

"میں نے سوچا ائیر پورٹ کے لئے نکلنے سے پہلے تم دونوں سے آخری بار مل لوں پھر پتا نہیں کب ملاقات ہو تم دونوں سے"

وہ کَن اکھیوں سے میر آہل کو دیکھتے ہوئے بولے جو سپاٹ چہرے کے ساتھ موبائل کی اسکرین گھور رہا تھا۔

"اتنی جلدی کیا ہے کچھ دن اور ٹھہر جاتے چاچو"

دل آویز کے چہرے پر اُداسی بکھر گئی۔

"نہیں بیٹا کافی دن ہو گئے ہیں پھر حویلی اور کھیتوں کی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ اب نوکروں پر کتنے دن تک ذمہ داریاں ڈالی جا سکتی ہیں۔ بس تمہیں یہاں پر سکون اور خوش دیکھ کر مجھے اطمینان آگیا ہے اور ویسے بھی بیٹی کے گھر باپ کا زیادہ دنوں تک رہنا معیوب سمجھا جاتا ہے"

وہ بولتے بولتے رُکے

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آج کے زمانے میں ایسی باتیں کون سوچتا ہے اور یہ گھر صرف آپ کی بیٹی کا نہیں بلکہ آپ کے بیٹے کا بھی ہے"

دل آویز کے تبصرے پر میر خلیل اور آہل نے بروقت ایک دوسرے کی جانب دیکھا تھا ماحول میں ایک غیر مانوس سا تناؤ پیدا ہوا جسے صرف اُن دونوں نے ہی محسوس کیا تھا۔

"اپنا بہت خیال رکھنا بیٹی"

وہ جواب میں محض اتنا ہی کہہ سکے تھے

"ٹھیک ہے چاچو آپ بھی اپنا بہت خیال رکھئے گا اور زلیخا چچی اور ریما کو میرا سلام دیجئے گا۔ کاش وہ دونوں بھی آپ کے ساتھ آجاتیں تو کتنا اچھا ہوتا"

وہ نرمی سے مسکرائی مگر میر خلیل جواباً مسکرا نہ سکے وہ بس دل آویز کی شکل دیکھتے رہ گئے۔ اس کا مطلب آہل نے زلیخا اور ریما کے انتقال کی خبر دل آویز کو نہیں دی تھی۔ اُنہوں نے تھوک نگلا اور میر آہل کی گردن میں گلٹی اُبھر کر معدوم ہوئی۔

"آئیں میں آپ کو باہر گاڑی تک چھوڑ دیتا ہوں"

میر آہل فوراً صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا دل آویز بھی اٹھنے لگی مگر آہل نے اُسے اٹھنے سے منع کر دیا۔ میر خلیل بمشکل مسکراتے ہوئے صوفے کا سہارا لیتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ میر آہل نے اتنی بڑی بات کیوں دل آویز سے چھپائی تھی۔

میر خلیل نے آخری بار دل آویز کے سر پر محبت سے ہاتھ رکھا اور اس کے گال کو شفقت سے چھو کر وہ لونگ روم سے باہر نکل گئے۔ آہل نے بھی اُن کی تقلید کی، دونوں کے درمیان پہاڑ جیسی خاموشی تھی۔ میر آہل اور میر خلیل آگے پیچھے چلتے ہوئے بیرونی دروازے تک پہنچے باہر گاڑی بلکل تیار کھڑی تھی۔ مائیکل اور شوفر اُن کے منتظر تھے۔

وہ چند لمحے یوں ہی گاہے بگاہے اُسے دیکھتے رہے مگر میر آہل نے کچھ نہیں کہا تو انہوں نے خود ہی بات کا آغاز کر دیا۔

"اپنا اور دل آویز بیٹی کا خیال رکھنا آہل"

وہ یاسیت سے بولے

"جی رکھوں گا"

مختصر سا جواب دیا گیا۔

"اور سال میں ایک بار ہی سہی وقت نکال کر گاؤں آجانا۔ چاہے فاصلے کتنے ہی ہوں خون کی کشش ہمیشہ اپنوں کو کھینچتی ہے۔۔۔ دیکھو میں بھی تو کِھنچا چلا آیا نہ اتنی دور"

وہ بول رہے تھے اور میر آہل خاموشی سے سُن رہا تھا۔

میر خلیل اس کی مسلسل خاموشی سے مایوس ہوئے تو یاسیت سے مسکرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"میں تمہیں بہت یاد کرتا ہوں بیٹا"

وہ نجانے کس امید میں کہہ بیٹھے کہ شاید مقابل کا دل موم ہو جائے مگر میر آہل نے اُنہیں کوئی تاثر نہیں دیا۔ مقابل کی خاموشی لاتعلقی کا چیخ چیخ کر اعلان کر رہی تھی۔ اب مزید رُکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

وہ بنا کچھ کہے گاڑی کی جانب پلٹنے لگے جب میر آہل نے اچانک اُنہیں پیچھے سے مخاطب کیا۔ وہ فوراً پلٹے۔ ان کی بے قراری اور تڑپ ان کی آنکھوں میں صاف دکھائی دے رہی تھی۔

آہل۔۔۔ میر خلیل کو دیکھ کر مسکرایا تو جواباً وہ بھی مسکرائے۔ دل میں ایک آس سی پیدا ہوئی۔

"ایک منٹ چاچو"

میر آہل کے منہ سے برسوں بعد لفظ چاچو سُن کر اُن کی بوڑھی آنکھوں میں نمی اُبھرنے لگی۔ کہیں جو کچھ ٹوٹا ہوا سا تھا پھر سے جُڑنے لگا۔

"مائیکل"

میر آہل کے مخاطب کرنے پر مائیکل نے کچھ فائلز اور ایک لکڑی کا چھوٹا سا باکس میر آہل کی جانب بڑھایا۔ میر خلیل نے بس ایک لمحے کے لئے آہل کے پاس کھڑے اس شخص کو آنکھیں سکوڑ کر غور سے دیکھا تھا۔ جواباً مائیکل نے بھی میر خلیل کو لمحے بھر کے لئے نظر اُٹھا کر دیکھا تھا۔

اچانک دونوں کے ارد گرد فلیش بیک کی روشنی پھیل گئی اور اس روشنی میں دونوں کرداروں کے نقش دھندلا سے گئے۔ کیا تھا میر خلیل اور مائیکل کے درمیان؟ کوئی راز؟ مطلب ابھی ایک خُلاصہ ہونا باقی تھا۔ مائیکل اور اس کا کردار لکھنے والوں کا خلاصہ۔۔۔ اگر ہم اس لمحے کو چند سیکنڈز کے لئے پوز کر کے دوبارہ دس سال پیچھے ماضی میں لوٹ کر جائے تو تمام سوالات کے جوابات مل جائے گیں۔

("جلالی میرا بیٹا ٹوٹ چکا ہے اور ایسے حالات میں، میں اُسے انجان ملک میں، انجان لوگوں کے درمیان تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ اس لئے اپنے بیٹے ماز سے کہو کہ وہ میر آہل کے ساتھ جائے۔ اُس کا خیال رکھے اور دھیان رہے جلالی میر آہل کو کبھی بھی اِس بات کی بھنک تک نہیں پڑھنی چاہئے کہ ماز کون ہے۔ اُس کی حقیقت کیا ہے"

میر خلیل نے حُقے کا کش بھرتے ہوئے جلالی کے بغل میں کھڑے اُس کم عُمر لڑکے کو غور سے دیکھا تھا۔ جو ابھی کچھ دن پہلے ترکی سے اپنا ماسٹرز مکمل کر کے آیا تھا۔ جس نے جواباً میر خلیل کو دھویں کی آڑ میں محض ایک نظر دیکھا تھا اور فوراً نظریں جُھکا دی تھیں۔ میر خلیل کے بہت سے احسانات تھے اُن پر اب اُن احسانوں کا بدلہ چُکانے کا وقت تھا۔)

"یہ آپ کی امانت"

وہ میر آہل کی آواز پر چونکے ارد گرد بکھری روشنی غائب ہوگئی۔ دس سال کا فاصلہ سیکنڈز میں سمٹ آیا۔ وہ چند فائلز میر خلیل کی جانب بڑھاتے ہوئے تامل سے بول رہا تھا۔

"یہ کیا ہے؟"

میر خلیل کے ماتھے پر بل پڑے انہوں نے مستفسرانہ نگاہوں سے پہلے کاغذات اور پھر میر آہل کو دیکھا۔

"یہ کھیت اور حویلی کے کاغذات ہیں۔اب سے آپ ان سب کے مالک ہیں"

میر خلیل کو لگا شاید اُنہیں سُننے میں غلطی ہوئی ہے۔

"مگر یہ سب تو رحمان بھائی کا ہے۔بی جان اور بابا جان نے سب کچھ اُن کے نام کر دیا تھا"

وہ الجھن کا شکار ہوئے۔

میر خلیل کی بات سُن کر میر آہل اُن کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ایک سیڑھی نیچے اُترا۔۔۔اب وہ دونوں آمنے سامنے ایک برابر کھڑے تھے۔

"بجا فرمایا آپ نے چاچو۔۔۔دادا جان نے سب کچھ ابو جی کے نام ہی کیا تھا مگر"

وہ رُکا

"مگر"

میر خلیل نے بے قراری سے کہا۔

"مگر ابو اور امی نے یہ سب آپ کے نام کر دیا تھا"

یہ انکشاف تھا یہ کوئی دھماکہ۔۔۔میر خلیل کا ذہن ماضی کے اندھیروں میں گھوم گیا۔میر آہل اُنہیں چند لمحے خاموشی سے دیکھتا رہا۔

"کیا ہوا۔۔۔چاچو"

اُس نے اب کی بار لفظ چاچو پر قدرے زور دیتے ہوئے کہا تو وہ ذرا سا چونکے اُنہوں نے سر نفی میں ہلا دیا۔ان کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا وہ بس دھندلی آنکھوں سے فائلز کو تکے جا رہے تھے۔

"خیال سے جائیے گا"

اس نے میر خلیل کے ہاتھوں میں فائلز تھماتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔وہ سر اثبات میں ہلاتے ہوئے خاموشی سے بنا کچھ کہے گاڑی میں بیٹھ گئے اور فائلز اپنی گود میں رکھ لیں۔آہل نے آہستگی

سے دروازہ بند کیا اور پلٹ کر مائیکل کو مخاطب کیا۔ میر خلیل کی آنکھوں سے چند آنسوں کے قطرے نکل کر فائلز کے اوپر رکھے لکڑی کے باکس پر گرے تھے۔ اُنہوں نے چونک کر لکڑی کے ڈبے کو دیکھا۔

آنسوؤں کی وجہ سے اُن کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔

میر خلیل نے ہتھیلی سے آنکھیں رگڑتے ہوئے شیشے سے باہر ایک نظر میر آہل پر ڈالی جو اب مائیکل سے محو گفتگو تھا۔ انہوں نے باکس کا ڈھکن کھولا تو اندر ایک تہ شدہ سفید مخملی رومال رکھا ہوا تھا۔

انہوں نے جیسے ہی رومال کھینچا تو کوئی چیز پھسل کر اُن کے قدموں میں جا گری تھی۔ وہ تھوڑا سا جُھکے اور نیچے سیٹ کے پاس اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے لگے۔ چند سیکنڈز کی مشقت کے بعد وہ چیز اُن کے ہاتھ میں آگئی۔ چھونے سے وہ کوئی پتھر معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ہی اُنہوں نے وہ پتھر اٹھا کر دیکھا ان کی سانسیں ساکت ہو گئیں۔ دھڑکنوں کی رفتار مدھم ہوئی۔ دنیا کی ہر شہہ اوپر نیچے ہو گئی۔

وہ فیروزہ تھا اُن کی انگشتری کا وہ نگ جو برسوں پہلے کہیں کھو گیا تھا۔ کہاں کھویا تھا یہ میر خلیل خود بھی نہیں جانتے تھے۔ یکدم آس پاس کا منظر بدلتا چلا گیا اور کان کے پردے سُن ہو گئے۔ آنکھوں کی پتلیوں پر ماضی کی وہ خوفناک شام کسی فلم کی طرح چلنے لگی تھی۔

اس خاموشی میں کسی نے گاڑی کے شیشے پر انگلی سے دستک دی تھی، وہ میر آہل تھا۔ شوفر نے بٹن دبا کر پیچھے کا شیشہ نیچے کر دیا۔ میر خلیل بھیگی آنکھوں میں شرمندگی سمیٹے پتھر کو دیکھ رہے تھے یوں جیسے آج کے بعد وہ کبھی کچھ اور دیکھ نہیں پائیں گے۔ میر آہل نے جُھک کر ایک نظر ان کے ہاتھ میں موجود اُس نیلے پتھر کو دیکھا تھا جو اِس وقت اپنے حقدار کے قبضے میں تھا۔

"آپ نے دُرست کہا تھا خون میں بہت کشش ہوتی ہے فاصلے چاہے جتنے بھی ہو خون کی کشش ہمیشہ اپنوں تک کھینچ لاتی ہے۔ پھر ایسا کیا ہوا تھا چاچو جو آپ کا خون سفید پڑ گیا"

آہل نے میر خلیل کی شکل دیکھتے ہوئے استفسار کرنے والے انداز میں کہا۔

"میں دس سال سوچتا رہا مگر مجھے جواب نہیں ملا"

میر آہل کھڑکی پر جھکا پرسکون آواز میں بول رہا تھا اور میر خلیل کی سماعتیں سائیں سائیں کرنے لگی تھیں۔

"مگر پھر ایک رات ایسی آئی میری زندگی میں جس نے سب کچھ بدل دیا۔ جس نے سیاہ کو سیاہ اور سفید کو سفید کر دیا۔ اُس رات نے مجھے میرے تمام سوالات کے جوابات دے دیئے۔ وہ رات جب میں آخری بار بی جان کی گود میں سر رکھ کر سویا تھا"

وہ رُکا اور میر خلیل کی دھڑکنیں بھی رُک گئیں۔

"پچھلے دس سالوں میں کوئی ایسا دن، کوئی ایسی شام، کوئی ایسا پہر نہیں تھا جب میں اپنے ماں باپ کو یاد کر کے نہیں تڑپا۔ یہ چند سال عذاب کی مانند گزرے تھے مجھ پر"

آہل کی آنکھیں نم ہوئیں۔

"لیکن غلطی آپ کی نہیں ہے۔ آپ کے تو محض نام میں۔۔۔ میر۔۔۔ تھا مگر رگوں میں میروں کا خون نہیں تھا"

اور کچھ چھن سے ٹوٹا تھا میر خلیل کے اندر وہ جس کی آواز صرف میر خلیل اور آہل سُن سکتے تھے۔ اُنہوں نے نظر اٹھا کر آہل کی جانب نہیں دیکھا۔ وہ ہنوز سامنے دیکھتے رہے۔ آنسوں کے قطرے ٹپ ٹپ ان کے گال پر بہہ رہے تھے مگر آہل رُکا نہیں۔

"تھے تو آپ ایک معمولی سے مالی کے بیٹے جِسے ترس کھا کر بی جان نے گود لیا تھا۔ محبت دی تھی، اپنا نام دیا تھا "

وہ ٹھہر ٹھہر کر گہری آواز میں کہہ رہا تھا اور میر خلیل کے اعصاب شل ہو گئے تھے۔ ایک ایک لفظ ان پر چابک کی طرح برس رہا تھا۔

"محض دولت کے لئے آپ اتنا گر گئے"

میر خلیل نے کرب سے آنکھیں میچیں۔

"مگر میں اب بھی اتنا بیوقوف ہوں کہ اگر آپ ایک بار، بس ایک بار کہہ دینگے کہ یہ سب آپ نے نہیں کیا تو میں آنکھ بند کر کے آپ کی بات کا اعتبار کر لوں گا۔ میں یہ مان لوں گا کہ آپ کی انگشتری کا نگ ابو امی کی لاش کے پاس

ملنا محض ایک اتفاق تھا۔ میں بھول جاؤں گا ہمارے درمیان میں آئے ان دس سالوں کو۔۔۔ یہ پھر بھلانے کی کوشش ضرور کروں گا"

وہ دل برداشتہ ہو امیر خلیل کی خاموشی اُسے اندر سے توڑ رہی تھی۔ چند لمحے خاموشی میں گزر گئے۔

ان کی خاموشی دیکھ کر میر آہل نے کرب سے ہونٹ آپس میں مسلتے ہوئے نظریں پھیر لیں۔

"دل آویز کو مت بتانا کہ میں"

اُن کی آواز کسی کھائی سے نکلی تھی۔ میر آہل کے دل پر کسی نے زور سے گھونسا مارا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کسی نے سینے سے دل نوچ لیا ہو اس کا۔

"آپ دل آویز کی فکر مت کریں میں اُسے کبھی نہیں بتاؤں گا کہ وہ چاچو جس میں وہ اپنے باپ کو دیکھتی ہے۔ ان کے ہاتھوں میں اپنے ہی بھائی کا خون ہے۔ وہ بھائی جس نے یہ جانتے ہوئے کہ آپ اُن کے سگے بھائی نہیں ہیں۔ پھر بھی بنا کچھ سوچے سمجھے اپنا سب کچھ آپ کے نام کر دیا صرف اِس لئے کہ آپ کو یہ نا لگے کہ آپ کے ساتھ کسی بھی قسم کی زیادتی ہوئی ہے"

آہل نے میر خلیل کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اُنہیں ٹوک دیا۔

آسمان کا رنگ بدل گیا تھا۔ بادل شور کرنے لگے تھے۔

"آپ کو یہ دولت اور پہاڑ جیسی تنہائی مبارک ہو میر خلیل"

یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹ گیا اور شوفر نے شیشہ اُوپر چڑھا لیا۔ میر خلیل نے فیروزہ کو مٹھی میں زور سے دباتے ہوئے سر پیچھے گرا دیا۔ شوفر نے گاڑی زن سے آگے بڑھائی تھی اور میر آہل بہت پیچھے چھوٹ گیا تھا۔ میر خلیل نے آج صرف بیٹا نہیں بلکہ اپنا دوست، اپنا سب سے مضبوط بازوں کھویا تھا۔ اقتدار کی اس جنگ میں ایک بار پھر رشتے ہار گئے تھے۔

وہ دونوں جیسے ہی لونگ روم سے نکلے جولیانہ چند سیکنڈز بعد جوس کا گلاس تھامے اندر داخل ہوئی تھی۔ دل آویز نے جوس کے گلاس کو دیکھ کر بیزار سی شکل بنائی تو جولیانہ ہنسنے لگی۔

"تمہیں اور آہل کو اور کوئی دوسرا کام نہیں ہے کیا" وہ زچ ہوئی۔ اتنے دنوں سے مسلسل بیماروں والا کھانا کھا کر اور جوس پی پی کر وہ اُکتا گئی تھی۔

"دل آویز بچوں جیسی باتیں مت کریں اور خاموشی سے یہ پورا جوس کا گلاس ختم کریں شاباش"

وہ قمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے چٹکی بجا کر بولی

"اچھا اور اگر نہیں کیا تو کیا کر لو گی تم ہاں"

دل آویز نے تیور دکھائے

"ٹھیک ہے میں ابھی میر سر کو آواز لگاتی ہوں"

وہ دونوں ہاتھوں کا منہ کے گرد پیالہ بناتے ہوئے چلانے کی اداکاری کرنے لگی تو دل آویز نے اُسے فوراً ٹوکا۔

"اچھا اچھا رکو۔۔۔ میر سر کی چمچی کیا ہر وقت ان کی دھمکی دیتی رہتی ہو۔۔۔ پیتی ہوں صبر کرو پہلے سوپ تو ہضم ہونے دو"

اس نے ہنکارا بھرا تو جولیانہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔

"کیا ہی ہی کر رہی ہو"

وہ اب بھی غصے سے جولیانہ کو گھور رہی تھی۔ اس کا قصور نہیں تھا اینٹی بائیو ٹکس کھا کھا کر اس کے منہ کا ذائقہ ہی اتنا کڑوا ہو گیا تھا کہ میٹھی چیز بھی اُسے زہر لگتی تھی۔ بادل ناخواستہ اس نے جوس کا گلاس گھٹ گھٹ اپنے اندر انڈیل دیا۔

"گُڈ گرل"

جولیانہ نے اس کے ہاتھ سے جوس کا گلاس لیتے ہوئے پیار سے کہا تو وہ ذرا سا مسکرائی۔

"اب آپ کو اپنے روم میں چلنا چاہئے"

وہ گلاس سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے دل آویز کو سہارا دے کر صوفے سے اٹھانے لگی۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں دل آویز کے بیڈ روم میں موجود تھے۔

"تھینکس جولی"

اِن بیس دنوں میں جولیانہ نے اس کی خدمت میں کوئی قصر نہیں چھوڑی تھی۔ ایک اچھے دوست کی طرح اس نے دل آویز کا بہت خیال رکھا تھا۔

"پلیز میں نے جو کیا ہماری دوستی کی خاطر کیا تھینک یو بول کر اس کی وقعت کم مت کریں"

وہ چادر دل آویز کے پیروں پر پھیلاتے ہوئے بولی تو جواباً دل آویز مسکرائی۔

"آپ آرام کریں میں آپ کی دوائیاں لے کر آتی ہوں پھر تھوڑی دیر سو جائیں گا"

اس کی بات پر دل آویز نے محض سر ہلا دیا وہ چلی گئی تو دل آویز کچھ پل دروازے کو تکتی رہی پھر ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل کا دراز کھولا اور اس میں رکھی بھورے رنگ کی ڈائری اٹھالی۔

پہلے صفحے پر الہان کا نام لکھا تھا دل آویز نے یاسیت سے اس کے نام پر اپنی اُنگلی پھیری۔

اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ دل کے خاموش کمرے میں انگنت یادوں نے ایک بار پھر سے سر اُٹھایا تھا۔ مگر جیسے ہی اُسے جولیانہ کے قدموں کی چاپ سنائی دی اس نے فوراً ڈائری بند کر کے چادر کے نیچے کھسکا دی۔

"یہ لیں آپ کی دوائیاں"

جولیانہ نے ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور چند گولیاں اور کیپسول نکال کر دل آویز کی ہتھیلی پر رکھیں۔ جِسے دل آویز نے پانی کی مدد سے حلق میں اُتار لیں۔

"جولی"

وہ جانے لگی تو دل آویز نے آواز دے کر اُسے روکا

"جی دل آویز"

وہ فوراً پلٹی

"و۔۔وہ میرے بُک لانچ ایونٹ کی کیا اپڈیٹ ہے"

وہ پوچھنا کچھ اور چاہتی تھی مگر بات کا رُخ دوسری جانب موڑ دیا۔

"سارے انتظامات تقریباً مکمل ہو گئے ہیں۔ اب آپ کے ٹھیک ہونے کا انتظار ہے بس۔۔۔ آپ جلدی سے پہلے کی طرح ٹھیک ہو جائیں"

اس کی بات پر دل آویز معنی خیز انداز میں مسکرائی

"اوکے میڈم جو آپ کا حکم"

دونوں کے درمیان مسکراہٹ کا تبادلہ ہوا۔ جولیانہ کمرے سے گئی تو دل آویز نے چادر کے نیچے سے ڈائری نکال کر واپس دراز میں رکھ دی اور آنکھ موند کر دوبارہ لیٹ گئی۔

☆...☆...☆

صبح کا وقت تھا اور اس وقت پورا قبرستان سناٹے میں تھا۔ اس سناٹے میں ایک اُدھیڑ عمر شخص سیاہ سوٹ میں ملبوس ایک قبر کے آگے کھڑا تھا۔ اس کے عقب میں چند فاصلے پر تقریباً تیس سے پینتیس سال کا ایک اور شخص بھی موجود تھا۔

قبر ایک قدیم تناور درخت کے سائے میں بنی ہوئی تھی۔

اینا اورنگزیب بنت اورنگزیب عالمگیر

(۱۹۹۹–۲۰۲۵)

اورنگزیب عالمگیر نے تختی پر درج نام پڑھ کر کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھوں کی پتلیوں پر وہ لمحہ اُبھرا جب اُنہوں نے اپنی بیٹی کو آخری بار اپنے گلے سے لگانا چاہا تھا پر ان کے ہاتھ میں محض ٹکڑے ہی آئے تھے۔ ہواؤں کے زور سے پتوں میں سرسراہٹ سی پیدا ہوئی تھی۔ اردگرد دور دور تک پراسراریت سی پھیل گئی۔ کافی دیر وہاں کھڑے رہنے کے بعد وہ پلٹے تو انکا سیکرٹری چارلی اُنہیں تشویش بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"چارلی میں نے تمہیں ایک کام دیا تھا کرنے کو"

اورنگزیب کے استفسار پر اس نے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔

"جی سر لیکن کیا آپ واقعی ایسا کرنا چاہتے ہیں آپ نے یہ سب بہت محنت سے کمایا ہے"

وہ ناچاہتے ہوئے بھی پوچھ بیٹھا۔ وہ ایک عرصے سے اورنگزیب عالمگیر کے ساتھ بطور پرسنل سیکرٹری کام کر رہا تھا۔ چارلی نے ان کی زندگی میں آنے والے بہت سے اُتار چڑھاؤ دیکھے تھے۔ مگر آج سے پہلے اُس نے اورنگزیب

عالمگیر کو اتنا بے بس اور بے سہارا نہیں دیکھا تھا۔ ان کی شخصیت میں پائے جانے والا وقار اور خود اعتمادی چکنا چور ہو چکی تھی۔ اولاد کے غم نے اُنہیں اندر سے توڑ دیا تھا۔

"میں نے اتنی دولت اپنے لئے نہیں کمائی تھی چارلی" ان کے لہجے میں درد تھا۔

"میرا بیٹا میری شکل نہیں دیکھنا چاہتا میری بیٹی ہمیشہ کے لئے مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ میں تنہا ہو گیا ہوں۔ اب کس کام یہ دولت، کیا میں پیسوں سے اپنی تنہائی دُور کر سکتا ہوں۔ نہیں کر سکتا۔۔۔ سارا قصور اس دولت کا ہے۔ مجھے لگا کہ میں اپنے بچوں کی ساری خواہشات پوری کر کے اُنہیں ایک اچھا انسان بنا سکوں گا مگر میں غلط تھا۔ دیکھو اب کیا ہو گیا ہے۔ میری دولت کمانے کی لت نے مجھے خالی ہاتھ کر دیا ہے"

اورنگزیب نے اپنی کھلی ہتھیلیوں کو دیکھا۔

"کاش میں اینا کو بات بات پر کریڈٹ کارڈز تھمانے کے بجائے اُس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ تھماتا اور اس کی ہر ناجائز فرمائش پوری کرنے کے بجائے اُسے اچھے اور بُرے کی تمیز سکھاتا تو آج حالات مختلف ہوتے"

اُن کی آواز بھیگ گئی تھی۔

ایک باپ اپنی اولاد کے بہتر مستقبل کے لئے دن رات روبوٹ کی طرح کام کرتا ہے۔ محنت و مشقت کرتا ہے اور اپنے بچوں کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر ان تمام کوششوں اور مشقتوں کے درمیان وہ یہ بات کیوں بھول جاتا ہے کہ یہ تمام تر آسائشیں جو وہ اپنے بچے کو دے رہا ہے یہ محض دنیاوی ہیں۔ آخرت میں یہ چیزیں اُس کے کسی کام نہیں آئیں گی۔ ماں باپ اپنی اولاد کو سب سے قیمتی چیز، اپنا وقت اور اچھی تربیت دے سکتے ہیں۔ وہ تربیت جو اُنہیں اس دنیا اور آخرت میں کام آئے گی۔ کاش ماں باپ یہ بات سمجھ جائے کہ خواہشات پوری کرنا تربیت کرنا نہیں ہوتا۔ بچوں کے ساتھ وقت گزارنا اُنہیں صحیح غلط کی تعلیم دینا ان کی تربیت کرنا ہوتا ہے۔ پھر یہی ماں باپ بعد میں روتے ہیں یہ بول کر کہ۔۔۔ ہم نے اپنی اولاد کے لئے کیا کچھ نہیں کیا پھر بھی ہمارے بچے نافرمان ہیں ۔۔۔ جب بچہ روئے تو اُسے سینے سے لگانا چاہئے نا کہ اس کے ہاتھ میں موبائل تھما دینا چاہئے۔

"لیکن سر آپ نا امید کیوں ہو رہے ہیں۔ آپ مسٹر الہان سے بات کریں وہ ضرور آپ کی بات کو سمجھیں گے"

اس کی بات پر اورنگزیب کی آنکھوں میں رنج کے آنسوں چمکے۔

"اُس کی یہ ناراضگی بجا ہے چارلی۔۔۔ میں بحیثیت ایک باپ ناکام ہو گیا ہوں۔ میں نے بڑا ظلم کیا ہے اپنے بچوں پر ان کو وقت نا دے کر، پتا نہیں میرے دل کا یہ غم کب ہلکا ہو گا۔ اور اب مجھ میں ہمت نہیں ہے کہ کسی سے نظریں بھی ملا سکوں۔ میں بس اس شہر سے دور، اس شور سے کہیں دور بہت دور جانا چاہتا ہوں"

چارلی بے چین ہُوا۔

"میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا سر میرے مشکل وقت میں آپ نے میری بہت مدد کی اب آپ کے مشکل وقت میں مجھے آپ کے ساتھ ہونا چاہئے"

اورنگزیب نفی میں گردن ہلاتے ہوئے یاسیت سے مسکرائے

"تمہاری فکر کا شکریہ مگر اب آگے کا سفر مجھے تنہا ہی طے کرنا ہے چارلی تم جوان ہو، عقل مند بھی ہو۔ تمہیں اپنے کریئر پر دھیان دینا چاہئے"

انہوں نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

"لیکن سر"

اس نے کچھ کہنا چاہا مگر انہوں نے چارلی کو درمیان میں ٹوک دیا۔

"میں مزید کچھ نہیں سُننا چاہتا بس یہ رکھو تمہارے کام آئے گا اور ویسا ہی کرو جیسا میں کہہ رہا ہوں"

اُنہوں نے اپنی گاڑی کی چابی اور ایک چیک اس کی جانب بڑھایا۔

"نہیں سر میں یہ نہیں رکھ سکتا"

چیک اور گاڑی کی چابیاں لیتے ہوئے اُسے خجالت محسوس ہوئی۔ اورنگزیب نے بنا کچھ کہے چابی اور چیک اس کے کوٹ کی سائیڈ پاکٹ میں ڈال دیا اور چُپ چاپ اس کے بغل سے نکل کر آگے بڑھ گئے۔ چارلی نے خاموشی سے مُڑ کر اورنگزیب کو قبرستان کا دروازہ عبور کرتے ہوئے دیکھا۔

انسان کو اللہ نے دنیا میں آخرت کمانے کے لئے بھیجا ہے مگر انسان آخرت چھوڑ کر دُنیا میں باقی ہر ایک چیز کماتا ہے۔ اگر انسان دنیا میں بھیجے جانے کا مقصد جان لے تو دنیا کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھے اور دن رات بس اپنی قبر

کو ہی یاد کرتا رہے۔ لیکن یہ انسان غفلت کی نیند میں اس طرح سے مبتلا ہے کہ کبھی کبھی اپنے اُوپر نازل ہونے والی آزمائشوں کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے۔

اورنگزیب عالمگیر نہیں جانتے تھے کہ اب وہ آگے کی زندگی کیسے بسر کرنے والے تھے اور تنہا زندگی گزارنے کا کوئی جواز تھا بھی نہیں مگر وہ بزدل نہیں تھے۔ جو غلطیاں اُن سے ہوئی تھیں۔ اُن کا اب ازالہ تو ممکن نہیں تھا۔ مگر زندگی جب تک تھی تب تک اپنی غلطیوں سے سیکھ کر اُنہیں مزید نا دہرانے کی کوشش تو کی جاسکتی تھی۔

چلتے چلتے وہ کافی دور نکل آئے تھے اور قبرستان کہیں پیچھے رہ گیا تھا وہاں اُن کا کوئی اپنا سو رہا ہے اس کے باوجود بھی اُنہوں نے ایک بار بھی پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے ارادے کمزور پڑنے لگتے ہیں اور وہ کمزور نہیں پڑنا چاہتے تھے۔

میر آہل جب کمرے میں آیا تو دل آویز سو رہی تھی۔ اُس نے آہستگی سے کمرے کا دروازہ مقفل کیا اور خاموشی سے بیلکونی میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ سورج کی شعاعیں دن ڈھلنے کے ساتھ ساتھ نرم پڑھ رہی تھیں۔ اس وقت اس کا ذہن بلکل خالی تھا۔ دل میں کوئی جذبہ نہیں تھا۔ نا اُسے کسی کے جانے کا دکھ تھا اور نہ کسی بات کی خوشی۔

وہ دور اُفق پر سورج کو آہستہ آہستہ غروب ہوتے دیکھتا رہا۔ بادل دھیرے دھیرے رنگ بدل رہا تھا۔ چرند پرند اپنے اپنے آشیانے کو لوٹ رہے تھے۔ اچانک اس کے کورے ذہن کے فرش پر یادوں کے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی اور وہ ماضی کی ایک یاد میں پلٹ گیا۔

("بیٹے کل تیرا اور دل آویز کا نکاح ہے"

وہ کمرے کا دروازہ مقفل کر کے بی جان کے قدموں میں آکر بیٹھ گیا۔

"جی بی جان معلوم ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے آپ کیا کہنے والی ہیں۔ یہی کہ دل آویز کا خیال رکھنا، اس کو کبھی کوئی دکھ مت دینا۔۔۔ وغیرہ وغیرہ"

وہ ان کی گود میں سر رکھتے ہوئے بولا۔ دل آویز کی جانب بی جان کا جھکاؤ دیکھ کر کبھی کبھی میر آہل کو بہت زیادہ کوفت ہونے لگتی تھی۔ اس کی بات پر بی جان ہلکا سا ہنسی۔

"مجھ سے زیادہ تو آپ کو اپنی پوتی کی فکر رہتی ہے۔ حالانکہ ہمدردی کا اصل حقدار تو میں ہوں۔ بَلی کا بکرا جو بنایا جارہا ہے مُجھے"

وہ مضحکہ خیز لہجے میں بولا مگر آگے سے کوئی جواب نہیں آیا۔ جب کافی دیر تک بی جان نے اس کی بات پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تو اُس نے سر اُٹھا کر ان کے نورانی چہرے کو دیکھا۔ اُن کی آنکھ میں نمی تھی اور ہونٹوں پر ایک اُداس سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

"کیا ہوا بی جان؟"

وہ سنجیدہ ہُوا۔

"قسمت کب کس پر رحم کرتی ہے بیٹا۔۔۔ اس حویلی میں گُزارا ہوا ہر پل دل آویز پر پتھر کی طرح بھاری گُزرا ہے۔ زلیخا نے میری بچی پر بہت ظلم کئے ہیں۔ اپنی نفرت، جلن اور حسد کی وجہ سے اس نے ایک منٹ بھی اُسے سکون سے رہنے نہیں دیا۔ ہمیشہ اس پر طعنے کسے، مارا پیٹا، ظلم کیا مگر مجال ہے آج تک میری بیٹی کی زُباں پر ایک گلہ تک آیا ہو۔۔۔ گلاب کے ساتھ کانٹے بھی ملتے ہیں مگر دل آویز وہ گلاب ہے جس میں محض خوشبوں ہی خوشبوں ہے کانٹے نہیں ہے۔ میں چاہتی ہوں پُتر تو اُسے وہ مان، سُکھ اور محبت دے جو اُسے اس گھر میں نہیں ملا۔ میں چاہتی ہوں وہ زندگی سے اپنی خوشیاں سمیٹ لے۔ اس کے دامن میں پھول ہی پھول ہو اور یہ سب صرف تُو کر سکتا ہے"

وہ بنا پلک جھپکے بی جان کی باتیں سُنتا رہا تھا۔ وہ جب بھی دل آویز کا ذکر کرتی تھیں۔ ان کے چہرے پر درد اور مسرت ساتھ ساتھ دکھائی دیتے تھے۔

"مگر زلیخا چچی کیوں دل آویز سے اتنی نفرت کرتی ہیں۔ آخر اُس نے چچی کا بگڑا ہی کیا ہے؟"

میر آہل کے سوال پر وہ ایک لحظے کے لئے سوچ میں پڑیں اور آہل انہیں استفسار بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔

"ہم نے بچپن میں ہی زلیخا اور فیصل کا رشتہ طے کر دیا تھا مگر فیصل نے زلیخا سے شادی پر انکار کر دیا تھا"

میر آہل کو بی جان کی بات سُن کر حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ زلیخا چچی فیصل چاچو کی منگیتر تھیں اس بات کا علم اُسے آج ہُوا تھا۔

"فیصل ہمیشہ سے رابعہ کو پسند کرتا تھا اور اُسی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ یہ بات برداشت نہیں کر سکی اور اِن سب میں۔۔۔ میں خود کو قصوروار سمجھتی ہوں کیونکہ جو بھی تھا زلیخا اپنے گھر کی بچی تھی۔ مجھے فیصل کو سمجھانا چاہئے تھا۔ لیکن میں بھی کیا کرتی پُتر میں اپنی ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو گئی تھی۔ وہ بیچاری میری وجہ سے ایک ناپسند شخص کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئی۔ مجھے لگا وقت اُسے بدل دیگا، خلیل کی محبت اُس کا دل بدل دیگی مگر ایسا نہیں ہوا، وقت کے ساتھ ساتھ وہ مزید تلخ ہوتی چلی گئی"

بعض اوقات محبت اور توجہ بھی آپ کو بدل نہیں پاتے ہیں۔ ایک لمحے کے لئے میر آہل کا دل بند ہوا۔ اس کے ذہن کے خالی پنّوں پر دل آویز کا معصوم سا چہرہ اُبھرا اور اس چہرے کے ساتھ ساتھ اور بہت سے سوالاتوں نے بھی جنم لیا۔

"یہی وجہ ہے وہ رابعہ کی بیٹی کو آج تک قبول نہیں کر سکی مگر خلیل نے میرا مان رکھا۔ اس نے زلیخا کو قبول کیا اور فیصل اور رابعہ کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد دل آویز کو باپ سے بھی بڑھ کر محبت دی۔ حویلی کی بھاگ ڈور سنبھالی۔۔۔ اُس نے کبھی مجھے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ میرا سگا بیٹا نہیں ہے"

اور میر آہل کا خون منجمد ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہوئیں۔ مانو سر سے پاؤں تک وہ پتھر کا مجسمہ بن گیا۔

"ک۔۔ کیا۔۔ چ۔۔ چا۔۔ چاچو آپ کے"

اس کے سوال نے درمیان میں ہی دم توڑ دیا تھا۔ اور اس پل، اس لمحے اُسے اپنے اندر پلتے اُن سارے سوالوں کا جواب مل گیا۔ جس نے میر آہل کے وجود کو پچھلے دس سالوں میں دیمک کی طرح چاٹ لیا تھا۔ اس نے آرام سے اپنا سر دوبارہ بی جان کی گود میں رکھ دیا۔ آہل کو لگا کسی نے اس کے اندر کی تمام تر ہمت نچوڑ لی ہے اور اُس میں بی جان کی آنکھوں میں جھانکنے کی ہمت نہیں بچی تھی۔ وہ آنکھیں جن میں میر خلیل کے لئے اتنی محبت اور یقین تھا۔ اگر وہ اُنہیں بتا دیتا کہ میر خلیل نے اپنی قربانیوں کا احسان اُن کے بیٹے اور بہو کی موت کی صورت میں لیا ہے تو وہ جیتے جی مر جاتیں۔

اُس کی آنکھ سے پانی بہہ کر بی جان کے دامن میں جذب ہوا مگر بی جان کسی اور ہی دُھن میں تھیں۔ انہوں نے میر آہل کی خاموش سسکیوں کی جانب دھیان نہیں دیا)

دل آویز کی کھانسی کے شور نے میر آہل کو یادوں کی نیند سے بیدار کیا تھا۔ سورج پوری طرح غروب ہو چکا تھا۔ اور بر منگھم پر رات اُتر چکی تھی۔ وہ فوراً کمرے میں آیا تو دیکھا دل آویز اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اُس نے فوراً آگے بڑھ کر اُسے شانوں سے آہستگی سے تھاما تھا۔

"تم ٹھیک ہو۔۔۔ کچھ چاہیئے تو نہیں؟"

اُس نے دل آویز کی پُشت پر تکیہ دُرست کرتے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں میں ٹھیک ہوں"

وہ تکیئے پر آرام سے ٹیک لگاتے ہوئے مُسکرائی تو جواباً آہل بھی مسکرایا۔

"کیا ہوا آپ پریشان دکھائی دے رہے ہیں؟"

اس نے آہل کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے تشویش بھری نظروں سے اُسے دیکھا۔ نا جانے وہ کیسے ہمیشہ میر آہل کی پریشانی، اُس کا چہرہ دیکھ کر ہی بھانپ لیتی تھی۔ آہل نے سر نفی میں ہلایا۔

"کچھ نہیں بس چاچو چلے گئے ہیں اس لئے تھوڑا اُداس ہوں"

اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا وہ دل آویز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دلیری سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔

"آپ بہت سویٹ ہیں آہل"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی تو آہل کے رخسار سرخ ہوئے۔ اس نے نظر اٹھا کر ذو معنی انداز میں دل آویز کو دیکھا۔

"خیر سے کہیں شوگر نا ہو جائے تمہیں"

آہل کے شوخ پن پر دل آویز نے کھل کر قہقہہ لگایا تھا۔ آہل اُسے ہنستا ہوا دیکھ کر اپنے سارے غم سیکنڈز میں بھول گیا۔ دل آویز کے قہقہوں کی بازگشت اُسے دنیا کی افراتفری اور شور شرابے سے بہت دور لے جاتی تھی۔ وہ افراتفری جس میں میر آہل ایک بار خود کو کھو چکا تھا۔ وہ شور جس نے اس کی سماعتوں کو سُن کر دیا تھا۔

ہر آنے والی رات کے بعد ایک نئی صبح آپ کی منتظر ہوتی ہے۔ جس طرح عروج پر زوال آتا ہے۔ اِسی طرح زوال کے بعد ایک عروج ہوتا ہے۔ وقت ایک جیسا نہیں رہتا وہ بدلتا رہتا ہے مگر انسان کو چاہئے کہ وہ ان بدلتے حالات میں صبر کا دامن نہیں چھوڑے۔ انسان کا بدلنا غلط نہیں ہے۔ بس اُس تبدیلی کی وجہ صحیح یا غلط ہو سکتی ہے۔

میر آہل نے باری باری اُس کی آنکھوں پر اپنی محبت کی مہر ثبت کی تھی۔ دل آویز نے دوبارہ اپنی آنکھیں نہیں کھولی وہ بس میر آہل کے لمس کو اپنی پلکوں پر محسوس کرتی رہی۔ اُس کا ہاتھ میر آہل کے ہاتھ میں تھا اور اس پل، اس لمحے میں اس کی دنیا مکمل ہو گئی تھی۔

زندگی میں تسلسل بہت ضروری ہے ورنہ ایک جگہ ٹھہرے پانی کی طرح انسان میں بھی کائی جم جاتی ہے۔ پھر انسان کا دل بھی کائی زدہ پانی کی طرح آلودہ ہونے لگتا ہے اور ایسا انسان کبھی کسی دوسرے انسان کو محبت یا تسکین نہیں دے سکتا جس کا دل آلودگی سے پاک نہ ہو۔ اس کی سوچ ہمیشہ منفی ہی رہے گی وہ کبھی مثبت سوچ ہی نہیں سکتا۔

"اور پھر اُن دونوں نے ایک دوسرے میں موجود تمام خلاؤں کو پُر کر دیا"

دل آویز اسٹیج پر موجود کرسی پر ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر ٹکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ آج اس کی کتاب لانچ ہوئی تھی۔ پورے برمنگھم کی میڈیا دل آویز کی کتاب۔۔مائے بیٹر ہالف۔۔۔کی رونمائی کی تقریب میں شریک ہوئی تھی۔

"وہ تو شاید دنیا کی بھیڑ میں خود کو کب کا کھو دیتی۔ لوگوں کی بھیڑ کا حصہ بن کر رہ جاتی مگر اُس نے ایسا ہونے نہیں دیا۔ وہ اُسے لوگوں کی بھیڑ سے کھینچ کر اپنی محبت کی دنیا میں لے آیا۔ وہ دنیا جہاں اُسے اپنے خوابوں کی تعبیر ملی"

دل آویز نے فرنٹ رو میں بیٹھے سیاہ ٹکسیڈو میں ملبوس میر آہل کو دیکھتے ہوئے کہا جس کی آنکھوں میں دل آویز کے لئے ناز تھا، فخر کی چمک تھی۔

"اُس نے مجھ میں جینے کی آس جگائی، میرے دامن کو محبت سے بھر دیا، مجھے اپنے پیروں پر کھڑا کیا۔ میں لڑکھڑائی تو مجھے سہارا دیا وہ خود جتنے بڑے تھے انہوں نے مجھے بھی اتنا بڑا بننے میں مدد کی"

دل آویز کو مبہوت سے دیکھتی میر آہل کی آنکھوں میں موتی چمکنے لگے۔ اس کا سینا تفاخر سے پُھول گیا۔

"میرے خوابوں کو اپنی آنکھوں میں سجایا۔ میرے پیشن کو اپنا پیشن سمجھا، میرے خوابوں کو تعبیر دی وہ خواب جو شاید میری آنکھوں میں ہی قید رہ جاتے"

دل آویز کے حلق میں کچھ اٹکا اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ اُس کی آواز بھیگنے لگی۔ اُس نے گود میں رکھی اپنی کتاب کی جانب دیکھا۔ گزشتہ ایک سال میں بتایا ہوا ہر ایک پل اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ کچھ لمحے یوں ہی سرک گئے۔

میر آہل نے غیر آرام دہ ہو کر پہلو بدلا وہ اس پل دل آویز کی کیفیت سمجھ سکتا تھا۔ وہاں موجود ہر ایک شخص اُسے تشکر سے دیکھ رہا تھا۔ دل آویز نے دوبارہ سر اٹھا کر سامنے دیکھا تو وہ پہلے سے بھی زیادہ مضبوط اور پُر اعتماد دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی پر اعتمادی دیکھ کر جولیانہ کے چہرے پر بڑی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور آہل نے پر سکون سی سانس ہوا میں خارج کی۔

“My name is Dilawaiz Meer and this is my love story, my fairytale and I want to dedicate this book to my husband Mr Meer Ahil … My better half”

دل آویز نے کتاب بند کرتے ہوئے سامنے میر آہل کی سمت مسکرا کر دیکھا اور اگلے ہی لمحے برمنگھم لائبریری کا ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ فوٹو گرافرز کھچا کھچ دل آویز کی تصویریں کھینچ رہے تھے۔ سب کی نظریں دل آویز پر تھی مگر دل آویز کی نظروں کا مرکز محض میر آہل تھا۔ بُک ریڈنگ سیشن کے بعد دس سے پندرہ منٹ کتاب سے متعلق سوالوں کا دور چلا۔ دل آویز ایک کے بعد ایک سوالوں کا مستحکم اور پر اعتمادی سے جواب دے رہی تھی۔

مختلف اخبارات اور میگزین کے ایڈیٹرز بھی وہاں موجود تھے۔ جن میں سے چند ایک کو دل آویز جانتی تھی اور کچھ سے محض ای۔ میل اور سوشل میڈیا کی حد تک علیک سلیک تھی۔

"جولیانہ میں تمہارے کام سے بہت متاثر ہوئی ہوں واقعی ایونٹ بہت اچھا آرگنائز کیا ہے تم نے"

دل آویز کافی متاثر دکھائی دے رہی تھی۔

"تھینک گاڈ آپ کو پسند آیا میں تو بلا وجہ ہی فکر مند ہو رہی تھی"

جولیانہ کے سر سے جیسے کوئی ٹینشن اُتری تھی۔

"میر امشورہ ہے کہ اب تم ایونٹ مینجمنٹ کا کام شروع کر دو"

دل آویز نے مشورہ دیا۔مائیکل اور میر آہل دو قدم کے فاصلے پر کھڑے اُن دونوں کی گفتگو سُن رہے تھے۔

"میم میری سائن کاپی ؟"

میر آہل نے گلا کھنکارتے ہوئے دل آویز کی جانب جھک کر کہا تو وہ فوراً پلٹی۔

"شیور مسٹر میر"

اس نے مسکراتے ہوئے ٹیبل پر کرینے سے رکھیں کتابوں

میں سے ایک کتاب اٹھائی اور جھک کر کچھ لکھنے لگی۔

To Meer Ahil,

My love, my life, my light

نیچے اپنا سگنیچر کر کے اس نے مسکراتے ہوئے وہ کتاب میر آہل کی جانب بڑھائی تھی جِسے میر آہل نے مسکرا کر تھام لی۔پاس کھڑی جولیانہ اُن دونوں کو دیکھ کر بلش کرنے لگی تھی اور پیچھے موجود مائیکل نے تو نظریں ہی دوسری جانب پھیر لی تھیں۔وہ ٹھہرا بیچارہ سدا کا کنوارا اتنا رومانس اُس سے ہینڈل نہیں ہوتا تھا۔

"ایکسکیوزمی مسز میر"

کسی اجنبی کے پکارنے پر وہ فوراً پلٹی دل آویز کے عقب میں کھڑے آہل نے اور ساتھ کھڑی جولیانہ نے بھی بروقت اُس اجنبی کو دیکھا تھا۔وہ لمبے قد کاٹ کا شخص تھا۔اس کی آنکھوں کا رنگ نیلا تھا اور بال ہلکے بھورے رنگ کے تھے۔

"میرا نام لیوڈِی سُوزا ہے آپ شاید مجھے نہیں جانتی مگر میں آپ کو جانتا ہوں۔آپ کا پہلا آرٹیکل میں نے ہی پبلش کروایا تھا"

وہ دونوں ہاتھ باہم ملاتے ہوئے پُر جوشی سے بولا۔ دل آویز کی پہلی مسکان سمٹی پھر آنکھیں سکوڑ کر اُسے غور سے دیکھا۔ مائیکل نے بھی ایک نظر میر آہل کے عقب سے سر نکال کر اُس انگریز کی جانب دیکھا تھا۔

"میں الہان اور نگزیب کا دوست ہوں۔۔۔ اُس نے ذِکر تو کیا ہو گا آپ سے"

دل آویز ایک پل کے لئے لاجواب سی سامنے کھڑے شخص کو دیکھتی رہ گئی۔۔۔ اُس نے ایک نظر گھما کر پاس کھڑی جولیانہ کو دیکھا تھا وہ شاک کے عالم میں اُسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"جی الہان نے آپ کا ذکر کیا تھا مجھ سے نائس ٹو میٹ یو لیو"

اُس نے مسکرا کر سر کو زنبش دی تھی۔ وہ چند سیکنڈز مزید وہاں رُکا تھا۔ اور اس پورے دورانئے میں جتنی حیرت جولیانہ کو الہان کی حقیقت کُھلنے کے باوجود دل آویز کو پر سکون دیکھ کر ہوئی تھی۔ اُتنا ہی بڑا اجھٹکا دل آویز کو میر آہل کے تاثرات دیکھ کر لگا تھا۔ وہ بلکل پر سکون دیکھائی دے رہا تھا۔ دل آویز شاید آہل سے کسی اور ہی رد عمل کی توقع کر رہی تھی۔ مگر سامنے والے کے ردِ عمل نے اُسے گہری سوچ میں ڈال دیا تھا اور ایسا ہی حال کچھ جولیانہ کا بھی تھا۔

لیو کے جانے کے بعد چند لوگ دل آویز کے ارد گرد آکر جمع ہو گئے تھے۔ وہ باری باری سب کی کتاب سائن کر رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ میر آہل ضروری کال اٹینڈ کرنے کے لئے موبائل کان سے لگائے ایگزٹ ڈور کی جانب جا رہا تھا اور مائیکل بھی اس کی تقلید کرتے ہوئے اُس کے پیچھے باہر نکل گیا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر کھڑی جولیانہ اُسے استفسار بھری نظروں سے گھور رہی تھی۔ وہ جیسے ہی سب کو فارغ کر کے مڑی جولیانہ بے قراری کے عالم میں اُس کی جانب بڑھی۔ وہ جولیانہ کی آنکھوں میں اُبھرتے سوالاتوں کو پڑھ چکی تھی۔

(دل آویز نے الہان کو پریشان کرنے کی نیت سے اس کی ڈائری اپنے بیگ میں رکھ لی تھی۔ رات کو فارغ ہو کر دل آویز نے اپنا اسائمنٹ مکمل کرنے کے لئے اسٹڈی روم کا رُخ کیا۔ اپنے بیگ سے بکس نکالتے ہوئے اس کی نظر الہان کی ڈائری پر پڑی۔ جو پورے دن کی مصروفیت کی وجہ سے اس کے ذہن سے نکل گئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بار پھر شرارت بھری مسکان رینگ گئی۔

"میں بھی تو دیکھوں اپنی محبت کی کونسی داستانیں درج کر رکھیں ہے اس نے"

وہ کھڑکی کے سامنے رکھے سنگل صوفے پر پرسکون انداز میں ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور ڈائری گود میں رکھ لی۔

اس نے پہلا صفحہ کھولا اور اس کے پورے بدن میں کرنٹ دوڑ گیا۔

الہان اورنگزیب

اُسے لگا اس نے غلط نام پڑھا ہے اس نے زور سے آنکھیں جھپکتے ہوئے دوبارہ اس نام کو پڑھا اور اس کا پورا حلق سوکھ گیا۔ دل آویز مکمل شاک میں تھی۔ جیسے جیسے وہ ڈائری کے ورک پلٹتی گئی اس کے اندر جذبات کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ وہ شخص جو ہر وقت اس کے ارد گرد ہنستا کھیلتا دکھائی دیتا تھا در حقیقت اپنے اندر درد کا ایک زمانہ مقید کئے ہوئے تھا۔

یکدم اس کا ورک پلٹتا ہاتھ سُست ہوا، کتاب کے درمیان دل آویز اور الہان کی تصویر رکھی ہوئی تھی۔ یہ تصویر جولیانہ نے دی الیکٹرک کے باہر لی تھی۔ جن دو صفحات کے درمیان وہ تصویر رکھی ہوئی تھی وہ بلکل خالی تھے۔

دل آویز نے صفحہ پلٹ دیا اور اس صفحے کے ساتھ اُس کی زندگی بھی پلٹ گئی۔)

"آپ نے مجھے کبھی بتایا کیوں نہیں کہ آپ بھی الہان کی حقیقت جانتی تھیں"

جولیانہ کی بات پر دل آویز نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ اسٹڈی روم کا منظر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

"کیا مطلب آپ بھی؟ کیا تم پہلے سے جانتی تھی کہ الہان"

دل آویز کا جملہ منہ میں رہہ گیا جب اُس کی بات پر جولیانہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مجھے لگا وہ آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔۔۔ اوہ گاڈ دل آویز یہ میں نے کیا کر دیا"

اس نے اپنا سر ہاتھوں میں دیا۔

"ریلیکس جولی"

دل آویز نے اُسے شانوں سے تھاما

"میں نے اُسے کیا کچھ نہیں کہا دل آویز میں نے اُسے اپنی صفائی پیش کرنے کا ایک موقع تک نہیں دیا۔ وہ میری باتوں سے دل برداشتہ ہو کر برمنگھم چھوڑ کر چلا گیا دل آویز میں نے اُسے بہت بُرا بھلا کہا۔۔۔۔ میں نے اُسے ہماری زندگیوں سے نکل جانے کا کہا تھا اور اس نے وہی کیا وہ چپ چاپ ہماری زندگیوں سے نکل گیا"

وہ بمشکل اپنے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے بولی تھی۔ وہ سب کی نگاہوں کا مرکز نہیں بننا چاہتی تھی۔

"پتا نہیں وہ کیسا ہو گا دل آویز، کتنا ٹوٹ گیا ہو گا وہ"

جولیانہ کو اپنی بیوقوفی پر شدید غصہ آرہا تھا۔

"تم اس کے پاس جاؤ جولی"

اس کی بات پر جولیانہ نے حیرت سے سر اٹھایا

"میرے دوست کے پاس جاؤ جولی اُسے تمہاری اس وقت سب سے زیادہ ضرورت ہے"

وہ عجیب سے انداز میں بولی۔

"آپ ٹھیک ہیں دل آویز"

جولیانہ کو اُسے اس طرح بولتے دیکھ کر تشویش ہوئی۔

"جولی تم جاؤ میرے دوست کے پاس اور جب تک وہ خود نہ چاہے تب تک اُسے مجھ سے ملنے پر مجبور مت کرنا

"

دھواں ایک بار پھر نظروں کے سامنے چھانے لگا تھا۔

"پر کیوں دل آویز"

دل آویز کی سماعتیں بند ہو گئی تھیں اُسے آس پاس کی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔

(** کاش میں برمنگھم واپس نہ آیا ہوتا۔ کاش میں اُس سے نہیں مِلا ہوتا۔ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے یہ بات میرے دل کو خون کے آنسوں رُلاتی ہے **

یہ پڑھتے ہی دل آویز کو گہرا شاک لگا وہ بے چینی سے آگے کو ہوئی۔

کاش اُس کی محبت کا ایک لو تا حقدار میں ہوتا۔ وہ مجھے نہیں کسی اور کو چاہتی ہے یہ حقیقت میرا دل مسل کر رکھ دیتی ہے

الہان کے لکھے ایک ایک لفظ میں دل آویز کے لئے حیرتوں کا جہان آباد تھا۔

"مگر جولیانہ تو الہان سے محبت کرتی ہے پھر وہ ایسا کیوں سوچتا ہے کہ۔۔۔۔"

دل آویز نے من ہی من میں سوچا اس کا دماغ الجھ سا گیا تھا۔ وہ آگے پڑھنے لگی۔

مجھے نہیں معلوم تھا ایک دن میری دنیا اُس کی ذات تک محدود ہو کر رہ جائے گی۔ اُس کی گہری خاموش آنکھیں میری زندگی کا مرکز بن جائیں گی۔ میں جب بھی اُس کے سرخ صبیح چہرے کو دیکھتا ہوں تو اپنی حدیں فراموش کرنے لگتا ہو

دل آویز جیسے جیسے صفحے پلٹتی گئی اُس کی آنکھیں تحیر سے پھیلتی چلی گئیں۔

پتا نہیں کیوں آج اُس نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے کبھی محبت ہوئی ہے یا نہیں۔ اُسے لگتا ہے میں نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی اس لئے میں محبت کو سنجیدگی سے نہیں لیتا۔ وہ کہتی ہے کہ جب مجھے محبت ہو گی تو مجھے لگ پتا جائے گا کہ محبت کیا ہوتی ہے پھر دنیا کا ہر دوسرا کام میرے لئے غیر اہم ہو جائے گا

آخر کا لفظ آنسوں کا قطرہ گرنے کی وجہ سے ذرا سا مٹ گیا تھا۔ دل آویز نے الہان کے آنسوں کے دھبے کو انگلی کے پوروں سے چُھوا۔ اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ الہان کسی کے لئے اس حد تک بھی بے اختیار ہو سکتا تھا، یہ جان کر دل آویز کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔

** جولیانہ بہت اچھی لڑکی ہے اور افسوس ایک دن میں اُس کے آنسوؤں کی وجہ بنوں گا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ میں اپنے دل سے اُسے نکال کر جولیانہ کی محبت کو جگہ دوں مگر دل کب کسی کی بات سنتا ہے **

دل آویز کا ہاتھ کانپا وہ کس کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ ایک عجیب سے احساس نے اس کے دل کا طواف کیا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے ایک اور ورک پلٹا تھا۔

اور یہ وہ پل تھا جس نے دل آویز سے اُس کا سب سے بہترین دوست چھین لیا تھا۔

** کاش وہ میر آہل کے بجائے مجھ سے محبت کرتی۔ اس کا دل میرے نام کی تسبیح پڑھتا۔۔۔ لیکن کچھ محبتیں کبھی کامل نہیں ہوتیں میں یہ حقیقت تسلیم کر لوں گا کہ میری محبت اُنہی میں سے ایک ہے **

اور دل آویز نے منہ کھول کر سانس لینے کی کوشش کی اُسے اپنا دل بند ہوتا محسوس ہوا۔

** میں اپنی یکطرفہ محبت کا جنازہ اپنے دل میں دفن کئے دل آویز کی زندگی سے دبے پاؤں خاموشی سے چلا جاؤں گا **

اور دل آویز کا ہاتھ بے جان سا ہو کر پہلو میں جا گرا، ڈائری زمین پر گر کر بند ہو گئی۔ دل آویز کو گمان تھا کہ وہ الہان کی سب سے اچھی دوست تھی مگر اس کا یہ بھرم آج چکنا چور ہو گیا تھا۔ وہ کمال کا اداکار تھا، کس طرح اُس نے اپنی بے خودی پر اپنی مسکراہٹ کا پردہ ڈالا تھا۔ دل آویز کو ایک دم سے ہوا میں آکسیجن کی کمی محسوس ہوئی)

"دل آویز کدھر کھو گئی میں کب سے تمہیں پُکار رہا ہوں"

میر آہل نے اُسے بازوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا تھا وہ حواس باختگی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے"

میر آہل نے اُس کے گال کو چھوتے ہوئے سوال کیا۔ چند لمحے لگے تھے اُسے خود کو سنبھالنے میں جولیانہ اب بھی اُسے مستفسرانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ مگر دل آویز کا رُخ اب میر آہل کی طرف تھا۔ وہ جان بوجھ کر جولیانہ کی آنکھوں میں دیکھنے سے اجتناب کر رہی تھی اور یہ بات وہ دل آویز کے رویّے میں اچانک آئی تبدیلی سے بھانپ چکی تھی۔

"میری طبیعت کچھ عجیب لگ رہی ہے"

وہ میر آہل کے دونوں بازوؤں کو تھامتے ہوئے بمشکل اپنے قدموں پر کھڑی رہتے ہوئے بولی۔

"مائیکل فوراً گاڑی نکالو ہم ہسپتال جا رہے ہیں"

اس نے دل آویز کو اپنے حصار میں لیتے ہوئے حکم صادر کیا۔

"نہیں ہسپتال جانے کی ضرورت نہیں، بس گھر چلیں۔ تھوڑا آرام کروں گی تو بہتر محسوس کروں گی"

اس نے مسکرانے کی کوشش کی

"ٹھیک ہے"

میر آہل کا حصار اس کی گرد مزید مضبوط ہوا وہ دونوں ایگزٹ ڈور کی طرف بڑھنے لگے۔ مائیکل نے کانچ کے دروازے کا ایک پٹ باہر کی جانب دھکیلا۔

پیچھے کھڑی جولیانہ کا دماغ اب اول تا آخر تانے بانے جوڑنے لگا تھا۔ جب دل آویز نے دروازے سے نکلتے وقت ہلکا سا مُڑ کر جولیانہ کی سمت دیکھا تھا۔ جولیانہ نے بھی بروقت نظر اٹھا کر دل آویز کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ اور یہ

لمحہ جولیانہ کے لئے سب سے مشکل لمحہ تھا کیونکہ آگاہی کا پل عذاب لاتا ہے۔ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت لگا تھا دونوں کی نظر کا رابطہ منقطع ہونے میں۔

کچھ باتوں کو سمجھنے کے لئے لفظوں کی ضرورت نہیں پڑھتی بس انسان کی بے قرار نظریں ہی کافی ہوتی ہیں۔ جو باتیں زبان نہیں بول پاتی وہ آنکھیں بول دیتی ہیں۔

وہ دونوں گاڑی میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ سیاہ شیشیوں کے پار برمنگھم کا خوبصورت انفراسٹرکچر نظروں کو خیرہ کر رہا تھا۔ مگر دل آویز کی نظر نا جانے خلاء میں گم کس نادیدہ نقطے کو گھور رہی تھی۔

"آپ نے کبھی مجھ سے کچھ کہا کیوں نہیں"

یوں ہی بیٹھے بیٹھے اُس نے اچانک کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

"الہان اینا کا بھائی تھا آپ جانتے تھے۔ وہ اینا کے کہنے پر میرے قریب آیا تھا آپ یہ بھی جانتے تھے پھر بھی آپ نے کچھ نہیں کیا بس خاموش رہے۔ کیوں آہل آپ کیا پُروف کرنا چاہتے تھے؟"

وہ ہنوز کھڑکی کے باہر نظر جمائے میر آہل سے استفسار کر رہی تھی۔

"آپ کو میری محبت پر، میری نیت پر شک تھا؟"

میر آہل کہنیاں اپنے گھٹنوں پر ٹکائے سر جھکا کر بیٹھا اُس کی باتیں سن رہا تھا۔

"آپ میری وفاداری آزمارہے تھے؟"

اُس نے خالی نگاہوں سے اپنے آگے میر آہل کے جُھکے سر کو دیکھا۔

گاڑی برمنگھم کی سڑکوں پر فراٹے بھر رہی تھی مگر اندر قیامت جتنا سناٹا تھا۔

"بولئے اب ہونٹ کیوں سِل گئے ہیں آپ کے"

اُس کی خاموشی نے دل آویز کے اندر اشتعال پیدا کیا۔

"میں ابھی اتنا بے غیرت نہیں ہوا کہ اپنی بیوی کے کردار پر کسی غیر مرد کی وجہ سے انگلی اُٹھاؤں، تمہاری عزت کی ذمہ داری میرے ہاتھوں میں ہے، میں اپنے ہی ہاتھوں سے اُسے کبھی داغدار نہیں کروں گا۔"

میر آہل نے ایک دم سر اٹھا کر اُس کی آنکھوں میں دیکھا اور ساری بات وہی ختم ہوگئی۔

"میں تمہاری نیت اور الہان کی حقیقت دونوں سے بخوبی واقف تھا۔ اس لئے میں نے اس بات کو زیرِ بحث لانا ضروری نہیں سمجھا دل آویز کیونکہ مجھے تم پر خود سے زیادہ اعتبار ہے"

اس نے اپنے غصے کو ضبط کرنے کی کوشش کی

"اور اگر وہ اینا کے بہکاوے میں آجاتا تو۔۔۔۔"

"تو الہان اورنگزیب ابھی منوں مٹی تلے دفن ہوتا"

میر آہل کا جارحانہ انداز دیکھ کر وہ ٹھٹکی پھر گہری سانس پھیپھڑوں میں اُتاری۔ میر آہل کے ماتھے پر شکنوں کا جال دیکھ کر وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئی تھی۔ اُسے اطمینان ہوا کہ آہل کم از کم الہان کے احساسات سے ناواقف تھا۔

ورنہ وہ بہت پہلے ہی الہان اورنگزیب کا وجود اِس صفحہ ہستی سے مٹا دیتا۔ دل آویز نے کبھی بھی الہان پر اُس کے جذبات سے آگاہی کا تاثر نہیں ڈالا تھا۔ جب الہان نے کبھی اُس پر اپنے جذبات مسلط نہیں کئے تھے تو اُسے بھی کوئی حق نہیں بنتا تھا کہ وہ اس کے دل میں پل رہے جذباتوں کو کُریدے۔ الہان کی حقیقت جو بھی تھی۔ ان سب حقیقتوں کے باوجود وہ اُس کا دوست تھا اور اس نے آخری وقت تک اپنی دوستی کا حق بھی ادا کیا تھا۔ اس کی نیت پر شک کرنا اس کی توہین تھی اور دل آویز اس گناہ کی مرتکب نہیں ہونا چاہتی تھی۔

کچھ باتیں دبی رہیں تو بہتر ہوتا ہے۔ غیر ضروری باتیں کُھلنے سے اکثر رشتوں کی ساکھ کمزور ہو جاتی ہے۔

اگر خاموشی آپ کے چہیتے رشتوں کو بچا لیتی ہے تو بہتر ہے کہ خاموشی اختیار کر لی جائے۔

"مجھے تمہیں پانے یا نہ پانے کی حسرت نہیں ہے"

آج اتوار کا دن تھا اور صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ اپنے اندر کی آوازوں کو دبانے کے لئے وہ ہفتے کے ساتوں دن ہی خود کو کام میں مصروف رکھتا تھا مگر آج اس کا خود کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا ارادہ تھا۔ شاید وہ آہستہ آہستہ اپنی محبت سے دستبردار ہونا چاہتا تھا۔ مگر اپنی محبت سے دستبردار ہونے کے لئے بڑے حوصلے کی ضرورت پڑتی ہے۔

"کیونکہ تم سے پیار کرنے کے لئے مجھے تمہاری ہی ضرورت نہیں ہے"

وہ پیلے رنگ کے ٹریک سوٹ میں ملبوس 40 اسٹور اسٹریٹ پر واک کر رہا تھا۔ کانوں میں ہینڈ فری لگائے۔ دنیا کے شور و غل سے بے خبر وہ چلتا جا رہا تھا۔ بس ایک اندر کا شور تھا جس سے وہ پیچھا نہیں چھڑا پاتا تھا۔

"میرا یقین مانو میں تم سے دور رہ کر بھی خوش رہ سکتا ہوں۔ تمہاری آنکھوں میں جو پانی بھرا ہے اُس میں کسی بے سُدھ مچھلی کی طرح بہہ سکتا ہوں"

تھوڑے فاصلے پر اسٹور اسٹریٹ ایسپریسو کے نام سے ایک کیفے تھا۔ کیفے سے اُس کے میوزک اسٹوڈیو کا راستہ محض چند منٹ کا تھا۔ وہ جب بھی تھکا تھکا محسوس کرتا تھا تو یہاں اپنی پسندیدہ کافی پینے آجاتا تھا۔ اُسے کافی بہت پسند تھی کافی پینے کے بعد وہ خود کو توانا اور ایزجیٹک محسوس کرتا تھا۔

"تمہارے لئے کُچھ گھنٹے کیا پوری زندگی کر سکوں یہ وہ انتظار ہے"

کاؤنٹر سے اپنی کافی اُٹھا کر وہ اسٹور کے باہر رکھیں ایک ٹیبل پر آکر بیٹھ گیا۔ کیفے کی بیرونی دیوار شیشے کی تھی۔ جس سے سڑک سے گزرتا کوئی بھی شخص اندر بیٹھے لوگوں کو آرام سے دیکھ سکتا تھا۔ اور اتوار ہونے کی وجہ سے کیفے میں ہلکا پُھلکا رش بھی تھا۔

"ہاں یہ سچ ہے مجھے تم سے ایک طرفہ پیار ہے"

وہ اسٹول پر بیٹھا پیچھے شیشے سے ٹیک لگائے سڑک پر موجود لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ آج وہاں کافی گہما گہمی تھی اور موسم بھی کافی خوشگوار تھا۔ اس نے کافی کا کپ لبوں سے لگایا اور گرم گرم کافی کا ایک گھونٹ لیا۔ اور کانوں سے ہینڈ فری نکال کر سامنے ٹیبل پر رکھ دیئے۔

"الہان میں نے آپ کا نیا گانا۔۔۔ایک طرفہ پیار۔۔۔سُنا ہے۔اِٹ واز امیزنگ پلیس کیا میں آپ کے ساتھ ایک سیلفی لے سکتی ہوں"

کیفے سے نکلتی دو لڑکیاں جو کم عمر معلوم ہوتی تھیں الہان کو دیکھ کر فوراًاُس کی جانب متوجہ ہوئیں۔ابھی ایک ہفتہ پہلے ہی الہان نے اپنا پہلا گانا اپنے یوٹیوب چینل پر اپلوڈ کیا تھا اور صرف چند منٹوں میں ہی اُس کی ویڈیو پر ملینز میں ویوز آئے تھے۔سوشل میڈیا پر الہان کا نام ایک نئے اُبھرتے سنگر کے طور پر ٹرینڈ ہو رہا تھا۔

"شیور"

وہ ہلکا سا مسکرایا اُن دونوں کو دیکھ کر کیفے میں بیٹھا سترہ سے اٹھارہ برس کا لڑکا بھی ان کی جانب متوجہ ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے چار پانچ لوگ مزید اُس کے ارد گرد اکھٹا ہو گئے۔وہ باری باری سب کے ساتھ تصویریں بنوا رہا تھا۔ وقت کتنے وقت کے بعد اُس پر ذرا سا مہربان ہوا تھا۔بہت دنوں کے بعد وہ خوشی محسوس کر رہا تھا۔لوگوں کا اس طرح سے اُسے توجہ دینا الہان کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔وہ ہمیشہ سے یہی تو چاہتا تھا کہ دنیا اُسے اُس کے ٹیلنٹ کے حوالے سے جانے۔۔۔۔

"مسٹر الہان کیا آپ میرے ساتھ سیلفی لینا پسند کریں گے"

ابھی بھی اس کے آس پاس چند لوگ اُسے گھیر کر کھڑے تھے جب ایک مانوس سی نسوانی آواز اُس کے عقب سے اُبھری اس کے چہرے پر پھیلی مسکان ایک دم غائب ہوئی۔وہ پلٹا نہیں بس آہستگی سے ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کی اور پھر کھولیں۔وہ ابھی بھی الہان کے عقب میں کھڑی اُس کے پلٹنے کی منتظر تھی۔مگر وہ پلٹا نہیں بس سامنے کیفے کے گلاس وال میں اُس کا عکس دیکھتا رہا۔باقی موجود لوگ ایک ایک کر کے الہان کے ساتھ سیلفیز لیتے گئے مگر الہان ایک بار بھی مُسکرا نہیں سکا۔

ایک بار پھر الہان تنہا تھا۔یکدم ہی ارد گرد سناٹا سا چھا گیا۔جولیانہ نے بنا کچھ کہے اپنا سر اُس کے کندھے پر ٹکا دیا۔الہان کا سانس ساکن ہوا۔اس نے ہلکی سی گردن موڑ کر بائیں شانے پر جولیانہ کے بکھرے بالوں کو دیکھا۔

"کہنے کو، سُننے کو بہت کچھ ہے الہان"

جولیانہ اِسی طرح سر اُس کے کندھے سے ٹکائے بولی

"لیکن میں بس اس پل کو محسوس کرنا چاہتی ہوں"

اُس کو اپنے کندھے پر نمی کا احساس ہوا۔ الہان کی آنکھیں بھی بھیگنے لگی۔

"میں نے تمہیں بہت غلط سمجھا، تمہیں بہت کچھ کہہ دیا مگر کیا تم مجھے معاف کر سکتے ہو؟"

جولیانہ کے حلق سے سسکی نکلی

"دل آویز کیسی ہے جُولی؟"

الہان کے استفسار پر جولیانہ نے ٹھٹھک کر سر اُٹھایا۔ دونوں کے درمیان خاموشی اتنی گہری ہو گئی کہ وجود کو چھو کر گزرتی ہوا کا شور بھی کانوں میں چبھنے لگا۔

"د۔۔دل آویز تو بلکل ٹھیک ہیں ایک دم پہلے کی طرح"

وہ توقف سے بولی۔

"اور میر سر کے ساتھ بہت خوش بھی ہیں"

جولیانہ نے تھوک نگلتے ہوئے بمشکل کہا۔ الہان نے پلٹ کر اس کے چہرے کو دیکھا تو اُس نے خجالت سے چہرہ جُھکا دیا۔

"مجھے بنا بتائے اس طرح تمہارے پاس نہیں آنا چاہئے تھا ہے نا؟"

اس نے یوں ہی بات بنائی درمیان میں ایک عجیب سا تکلف حائل ہو گیا تھا۔

"پتا نہیں تم میرے بارے میں ک۔۔کیا سوچ رہے ہو گے"

وہ بے مقصد ہی اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی اور الہان ہونق سا کھڑا بس اُسے دیکھتا رہا۔

"لیکن تم فکر مت کرو میں ایک دو روز میں واپس برمنگھم لوٹ جاؤں گی"

اُس نے اپنی ناک رگڑتے ہوئے کہا

"پتا نہیں میں نے کیا سوچ لیا تھا"

کچھ کہے بغیر الہان نے اُسے گلے لگایا تھا۔ بڑی نرمی سے جیسے اپنے سابقہ رویئے کی تلافی کر رہا ہو۔

وہاں سڑک کے کنارے کھڑے اُن دونوں کے درمیان ایک لفظ کا بھی تبادلہ نہیں ہوا تھا، کوئی گلہ، کوئی شکایت یہ اظہار محبت کچھ بھی نہیں۔

"خیر میں لندن تم سے ملنے نہیں آئی تھی بلکہ گھومنے آئی تھی۔ اس لئے زیادہ خوش مت ہونا"

وہ خود کو الہان سے الگ کرتے ہوئے بولی

"ارے نہیں میں کیوں خوش فہمیاں پالنے لگا ویسے ہاں لندن، برمنگھم کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت ہے"

الہان نے اس جھوٹ کو سچ بنانے میں اس کی مدد کی

"تو پھر میں نے سوچا کہ تم سے بھی مل لوں"

وہ اٹکی پھر اس نے کہا

"اچھا کیا تم نے۔۔۔ میں بھی تمہیں بہت یاد کرتا تھا"

ایک دوسرے کے رُوبرُو کھڑے، وہ بنا نظریں ملائے جھوٹ بول رہے تھے۔

"ا۔۔۔ اچھا"

جولیانہ اٹکی اُسے سمجھ نہیں آیا مزید کہا کہے

لمحے بھر کی خاموشی

"جولیانہ"

الہان کی پکار میں کچھ ایسا تھا کہ اس نے حیرت سے اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"مجھ سے شادی کرو گی؟"

اب مزید کچھ کہنے کو باقی نہیں تھا اس لئے اس کے ذہن میں جو سوال اُبھرا اس نے پوچھ لیا۔ جولیانہ کی آنکھوں میں موتی چمکنے لگے تھے۔

کسی شخص سے آپ محبت کرلیں تو پھر اُس کی ریپلیسمنٹ نہیں ہوتی، ہو ہی نہیں سکتی، جھوٹے ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں ہر چیز ریپلیس ایبل ہے۔ دل کے کسی کونے میں آپ اپنے من پسند شخص کی جگہ کے آس پاس، کسی دوسرے شخص کو جگہ دے تو دیتے ہیں مگر اپنے پسندیدہ شخص کو کبھی ریپلیس نہیں کر پاتے۔ بس یہ مان کر زندگی گزار لیتے ہیں

کہ شاید ہم نے اُنہیں بھلا دیا۔ پر کیا واقعی ہم اُنہیں بھلا دیتے ہیں؟ یہ بھی ایک معمہ ہے جسے آج تک کوئی حل نہیں کر سکا۔ الہان کو اُس کی محبت نہیں مل سکتی تھی مگر وہ جولیانہ کو اُس کے حصے کی محبت تو دے سکتا تھا۔

جولیانہ جانتی تھی کہ اُس نے جس سمندر کی گہرائی میں اُترنے کا فیصلہ کیا ہے وہاں ڈوبنا شرت ہے مگر محبت وہ بلا ہے جو انسان پر سوار ہو جائے تو اُسے خاک کر کے ہی دم لیتی ہے۔ اگر الہان کے عشق کی آگ میں جل کر خاک ہونا ہی اُس کی تقدیر تھی تو اُسے جل کر خاک ہونا قبول تھا۔ اگر اُوپر والے نے اُس کی کہانی کا انجام یوں ہی لکھا تھا تو اُسے اوپر والے کا لکھا بھی قبول تھا۔

"مائیکل بقول تُمہارے تمہارا اِس دنیا میں کوئی نہیں پھر تم ہر سال دو مہینوں کے لئے انڈیا کس سے ملنے جاتے ہو؟"

چند ضروری کاغذات پر دستخط کرتے ہوئے میر آہل نے یوں ہی سوال پوچھ لیا۔ مائیکل کی گردن میں ایک گلٹی اُبھر کو معدوم ہوئی۔

"میرے ماں باپ انڈیا کے ہیں وہاں ہمارا خاندانی گھر ہے۔ بس اُن کی یاد میں ہی کچھ وقت اُس گھر میں گزارتا ہوں۔ وہاں سے میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں"

آہل نے فائل بند کر کے مائیکل کی جانب بڑھائی

"مگر تم اور تمہارے نام کا آپس میں کوئی میل جول نہیں لگتا"

اُس نے آنکھیں سکوڑ کر مائیکل کو دیکھا۔ میر آہل کی بات پر وہ ٹھٹکا۔

"جی وہ اس لئے کیونکہ میری ماں کا تعلق انگلینڈ سے تھا اور میرے والد انڈیا کے تھے"

وہ توقف سے بولا

"مطلب تُمہارے ماں باپ نے لو میرج کی تھی؟"

آہل نے اُنگلی سے ٹھوڑی کھُرچتے ہوئے پُر سوچ انداز میں استفسار کیا

"ج۔۔جی اُن کی لو میرج تھی"

وہ اٹکا

"اُن کی ملاقات کیسے ہوئی تھی؟"

میر آہل نے ایک اور سوال پیش کیا۔ مائیکل کا گلا سوکھا۔ اُسے معلوم تھا ایک نا ایک دن میر آہل اس سے یہ سوالات ضرور کرنے والا تھا۔

"میرے ابو جاب کے سلسلے میں انگلینڈ آئے تھے بس تب ہی اُن دونوں کی ملاقات ہوئی تھی پھر اُن دونوں نے شادی کر لی اور پھر وہ دونوں واپس انڈیا چلے گئے"

اُس نے دس سال پہلے جو من گھڑت کہانی تشکیل دی تھی کسی طوطے کی طرح سنا دی۔

"ہمم انٹرسٹنگ۔۔۔ تم شاید اپنے والد پر گئے ہو، کیونکہ دکھنے میں تم انگریز نہیں لگتے"

پتا نہیں آج میر آہل کیوں اس کا فیملی بیک گراؤنڈ کھنگال رہا تھا۔ آج سے پہلے اُس نے کبھی مائیکل کے گھر والوں میں اس طرح سے دلچسپی نہیں لی تھی۔

"ج۔۔جی میں دکھنے میں اپنے والد جیسا ہوں"

اس نے فوراً ہامی بھری

"مائیک تمہارا پورا نام کیا تھا میرے ذہن سے نکل گیا؟"

میر آہل دونوں ہاتھ باہم ملاتے ہوئے ٹیبل پر جُھکا تھا اور مائیکل نے بروقت تُھوک نگلا تھا۔

"میرا پورا نام"

(میر آہل کو کبھی بھنک نہیں پڑھنی چاہیے کہ ماز کون ہے اُس کی حقیقت کیا ہے)

اس کے کانوں میں میر خلیل کی آواز گونجی تھی۔ اُس نے لمحے بھر کے لئے رُک کر میر آہل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تھا۔

"مائیکل جمال۔۔۔۔ میرا پورا نام مائیکل جمال ہے"

وہ پر اعتمادی سے میر آہل کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرایا تھا۔ وہ ہی تھا جو میر آہل کی آنکھوں میں دیکھ کر پورے اعتماد کے ساتھ جھوٹ بول سکتا تھا۔

میر آہل بھی جواباً مسکرایا تھا۔

"آل رائٹ۔۔۔ جلد دوبارہ ملاقات ہو گی"

وہ کوٹ کا بٹن مقفل کرتے ہوئے اپنی پاور سیٹ سے کھڑا ہو گیا اور گھوم کر ٹیبل کے پار کھڑے مائیکل کی جانب بڑھا۔

"شیور سر"

وہ بھی آگے بڑھ کر میر آہل کے بغل گیر ہوا۔

"اپنا خیال رکھنا"

آہل نے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا

"آپ بھی اپنا اور میڈم کا بہت خیال رکھئے گا"

وہ میر آہل سے جُدا ہوتے ہوئے یاسیت سے بولا اس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی اُمڈنے لگی تھی کیونکہ یہ بات محض مائیکل ہی جانتا تھا کہ آج اُس کا برمنگھم میں آخری دن تھا۔ اب وہ کبھی لوٹ کر یہاں نہیں آنے والا تھا۔ اُس کا کام اب برمنگھم میں تمام ہو گیا تھا۔ میر آہل اور مائیکل کا ساتھ بس یہی تک تھا۔ اُسے لوٹ کر اب اپنی دنیا میں واپس جانا تھا۔ وہ دنیا جہاں سب اُسے ماز جمال کے نام سے جانتے تھے۔

مائیکل نے فائل سینے سے لگاتے ہوئے رُخ دروازے کی جانب موڑا ابھی اُس نے ہاتھ ہینڈل پر رکھا ہی تھا کہ میر آہل نے اُسے پیچھے سے پُکارا۔

"مائیکل"

ابھی میر آہل کے منہ سے اُس کا نام پوری طرح سے نکلا بھی نہیں تھا کہ اُس سے پہلے ہی مائیکل پلٹا۔

"جی سر؟"

دونوں بروقت مُسکرائے تھے۔

"تھینک یو مائیک"

میر آہل نے شکر گزاری سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"مینشن ناٹ سر"

وہ مزید رُکے بغیر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور میر آہل جیب میں دونوں ہاتھ مقید کئے گلاس وال کے باہر پھیلی صبح کو پر سوچ انداز میں گھورتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد آفس کے دروازے پر کسی نے دستک دی تھی۔

"کم اِن"

وہ وہیں کھڑا بنا پلٹے بُلند آواز میں بولا۔

"سر آپ نے یہ فائل منگوائی تھی"

ایچ آر اسسٹنٹ دروازہ دھکیل کر آفس میں داخل ہوا۔

"ہمم ٹیبل پر رکھ دو"

اُس کی نظر اب بھی گلاس وال کے اُس پار جمی تھی۔ اسسٹنٹ فائل ٹیبل پر رکھ کر چلا گیا تو وہ فوراً پلٹا اس کے ماتھے پر لکیریں اُبھری تھیں۔ وہ کچھ دیر خاموش کھڑا ٹیبل پر رکھی فائل کو دیکھتا رہا تھا۔

وہ گھر میں داخل ہُوا تو ملازم دروازے کے پاس کھڑا میر آہل کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا یوں جیسے وہ اُسی کا منتظر تھا۔ اس نے چونک کو ملازم کے چہرے پر بکھری مسکراہٹ دیکھی تھی۔

"میڈم کہاں ہیں؟"

وہ واحد سوال جو گھر میں داخل ہوتے ہی میر آہل سب سے پہلے پوچھا کرتا ہے۔

ملازم نے جواباً کچھ کہے بغیر اس کے ہاتھ سے آفس بیگ لیا اور وہاں سے چلا گیا۔ میر آہل کو ملازم کا یہ ردعمل بڑا عجیب لگا تھا۔ وہ اُوپر کمرے میں آیا تو دیکھا وہاں دل آویز نہیں تھی۔ وہ پلٹ کر ڈریسنگ ٹیبل کے پاس آیا تو سامنے شیشے پر پیلے رنگ کا اسٹکی نوٹ چپکا ہوا تھا۔

وہ ٹائی ڈھیلی کرتے ہوئے زیر لب اسٹکی نوٹ پڑھتے ہوئے مُسکرایا اور ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر فوراً بیک یارڈ کی جانب بڑھا۔

میر آہل نے جیسے ہی قدم بیک یارڈ کی انٹرنس پر رکھے، وہ آنکھوں میں حیرت لئے وہی منجمد ہو گیا تھا۔ بیک یارڈ کو خوبصورت قمقموں اور فیری لائٹس کی مدد سے ایک جادوئی جگہ میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ سامنے ایک چھوٹا سا

سفید خیمہ لگا تھا جہاں گھاس پر ایک چادر اور دو کُشنز رکھے ہوئے تھے۔ پاس ہی ایک میز اور دو کرسیاں بھی موجود تھیں۔

میر آہل کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی آنکھوں میں دل آویز کو دیکھنے کی طلب چمکی جب اچانک اُسے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی۔

وہ فوراً پلٹا۔۔۔۔ دل آویز بیک یارڈ کے انٹرنس پر سفید رنگ کی میکسی میں ملبوس آنکھوں میں دھنک کے ساتوں رنگ سمیٹے اُسے خوشمگین انداز میں دیکھ رہی تھی۔ کچھ بہت الگ تھا اُس کی آنکھوں میں جِس نے میر آہل کو الجھا دیا تھا۔ اس کی آنکھیں دل آویز کے وجود پر مقناطیس کی طرح جم گئیں۔ میر آہل کی نظروں کی تپش نے اُس کے چہرے پر سرخی بکھیر دی تھی۔

"کیسا لگا میرا سرپرائز؟"

دونوں ہاتھ میر آہل کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے اُس نے بڑے دل سے استفسار کیا۔

وہ دل آویز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے خوشمگین انداز میں مُسکرایا۔ دل آویز نے بروقت نظریں جھکائی تھیں۔

"بہت حسین مگر اِن آنکھوں سے زیادہ نہیں"

میر آہل اُس کے کان میں آہستگی سے سرگوشی کرتے ہوئے بولا تھا۔

"آہل"

دل آویز نے اُس کے شرٹ کے بٹن پر انگلی پھیرتے ہوئے جُھکی نظروں کے ساتھ اُس کا نام دھیرے سے پُکارا تھا۔

"ہمم"

وہ کچھ بھی کہے بغیر دل آویز کی ہر ایک ادا کو خاموشی سے ملاحظہ کرنے لگا۔ اُس کا ہر انداز جان لیوا تھا۔ وہ اب تک زندہ تھا تو حیرت تھی۔

وہ اس کے جھکے ہوئے چہرے پر مزید جھکا تھا۔ جیسے اس کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"ہماری شادی کو ایک سال مُکمل ہو گیا ہے اور میری طبیعت کی وجہ سے ہم اپنی زندگی کا سب سے اہم دن ہماری اینیورسری ٹھیک سے سیلبریٹ نہیں کر پائے"

وہ میر آہل کے شرٹ کے بٹن پر سابقہ انداز میں اُنگلی پھیرتی دھیمے لہجے میں بول رہی تھی۔

"لیکن یہ سب اینیورسری کی وجہ سے نہیں ہے"

وہ کہتے کہتے اٹکی پھر یکدم معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

"پھر کس لئے ہے؟"

میر آہل نے دیکھا وہ مُسکرا نہیں رہی تھی۔ وہ شرما رہی تھی۔

"ایک بہت ضروری بات ہے لیکن وہ میں آپ کو بول کر نہیں بتا سکتی"

اس نے نظر اٹھا کر ایک سیکنڈ کے لئے میر آہل کی آنکھوں میں دیکھا۔

"دل آویز"

اس کے لہجے میں بیتابی تھی۔ دل آویز کے انداز سے آہل اتنا تو سمجھ گیا تھا کہ بات کچھ اور تھی جسے وہ کب سے یہاں وہاں گھوما پھرا رہی تھی۔

"آپ کے لئے ایک گفٹ رکھا ہے وہاں ٹیبل پر"

دل آویز نے جھینپتے ہوئے کہا۔ میر آہل نے تجسس سے گردن موڑ کر ٹیبل کی جانب دیکھا وہاں ایک کیک اور ساتھ میں ایک خاکی رنگ کا لفافہ رکھا ہُوا تھا۔

وہ بلا تاخیر ٹیبل کی طرف بڑھا اور فوراً سے لفافہ اُٹھایا۔ اس کے اندر سفید رنگ کا کاغذ تھا۔ ہوا خاصی تیز ہو گئی تھی جس کے جھونکوں سے لفافہ اُڑ گیا تھا مگر وہ اپنی جگہ سے ہلا نہیں بلکہ وہیں ساکت ہو گیا جیسے حیرت سے سانسیں رُک گئیں ہوں۔ اس کی نظریں کاغذ پر ٹھہر گئیں۔

"کانگریچولیشن آہل"

وہ پیچھے سے آہل کے گلے لگتے ہوئے دھیرے سے بولی تھی مگر وہ جواباً کچھ کہہ بھی نہیں سکا تھا۔ اُس کی خاموشی پر چونک کر دل آویز نے اُس کی پُشت سے سر اٹھایا اور میر آہل کا رُخ اپنی جانب پھیرا تھا۔ اُس کی بند آنکھوں

سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ کر وہ مزید چونکی پھر نرمی سے مسکراتے ہوئے میر آہل کے گیلے چہرے کو اپنی ہتھیلیوں میں بھر لیا۔

دل آویز کا محبت بھرا لمس پا کر میر آہل کے منہ سے سسکی نکلی اور پھر وہ اپنے جذباتوں پر قابو نہ رکھ سکا۔ اُس نے بنا کچھ کہے دل آویز کو کس کر گلے سے لگایا تھا۔ میر آہل کی ہر ایک سانس میں وہ شدت محسوس کر سکتی تھی۔

"تھینک یو"

وہ ہچکیوں کے درمیان بمشکل بول سکا تھا۔

"تھینک یو سو سو مچ"

دل آویز اُمید سے تھی اس خبر نے میر آہل کو خوشی سے نہال کر دیا تھا۔ ان کی محبت میں حصہ مانگنے والا اس دنیا میں آنے والا تھا۔ ہوا کے جھونکوں سے پیڑ کی ڈالیاں ہلنے لگیں اور یکدم پھول ٹہنیوں سے ٹوٹ کر اُن دونوں پر برس پڑے۔ ہوا خاصی تیز ہو گئی تھی مگر آہل نے دل آویز کو اپنے آپ سے جُدا نہیں کیا تھا۔ وہ ہزاروں صدیاں اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹے اس طرح گُزار سکتا تھا۔

میر آہل کی دنیا دل آویز کی آنکھوں میں دیکھنے سے لیکر اُس کی بانہوں میں ختم ہو جاتی تھی۔ ایک بار پھر برسات ہونے لگی تھی موسم بدل گیا تھا مانو اُن دونوں کی دنیا بھی بدل گئی تھی۔

☆...☆...☆

"اور میں الہان اورنگزیب اپنی داستان یہاں ادھوری چھوڑ رہا ہوں اِس اُمید پر کے شاید زندگی کے کسی موڑ پر تم مُجھے مل جاؤ گی پھر شاید ہم کبھی جُدا نہیں ہونگے۔ شاید ایک دن دُوریوں کے یہ عذاب ختم ہو جائیں گے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہو گا مگر پھر بھی اِسی اُمید کے سہارے میں اپنی باقی کی پوری زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔

میں الہان اورنگزیب عالمگیر اپنی یہ زندگی تُمہاری یادوں کے حوالے کرتا ہوں"

اُس نے ہمیشہ کی طرح صفحے کو ڈائری سے پھاڑ کر اپنے اسٹڈی روم میں موجود آتش دان میں جھونک دیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے آگ نے کاغذ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور الہان آتش دان کے پاس پنجوں کے بل بیٹھا اُسے راکھ ہوتے دیکھتا رہا تھا۔ صفحے کے ساتھ الہان کی چاہتیں بھی جل کر راکھ ہو گئی تھیں۔

"الہان ڈنر تیار ہے"

دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر جولیانہ اسٹڈی روم میں داخل ہوئی اور دروازے پر ہی رُک گئی۔ اُس نے الہان کی نظر کا تعاقب کرتے ہوئے آتش دان میں جلتے کاغذ کو دیکھا تھا۔ یہ پہلی بار نہیں تھا وہ الہان کو پہلے بھی ایسا کرتے دیکھ چکی تھی مگر کبھی بھی جولیانہ میں الہان سے سوال کرنے کی ہمت پیدا نہیں ہوئی تھی کیونکہ ابھی اُس میں جواب سُننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اُس کے لئے الہان کا اس کی نظروں کے سامنے ہونا اور نرمی سے مسکرا کر دیکھ لینا ہی کافی تھا۔ چاہتوں کی طلب اب کس کو تھی وہ دونوں تو الگ ہی دنیا کے مکین بن چُکے تھے۔ جہاں حاصل کی طلب بے معنی تھی۔

الہان نے آتش دان سے نظر ہٹا کر جولیانہ کے مسرت بخش چہرے کو دیکھا تھا وہ بے ساختہ مسکرایا۔ اب وہ کبھی کبھی مُسکرا لیا کرتا تھا۔ جواباً جولیانہ بھی مُسکرائی تھی۔

"تم چلو میں آتا ہوں"

وہ کچھ توقف سے بولا

"میں انتظار کر رہی ہوں جلدی آنا"

اُس کے جواب پر الہان نے اثبات میں سر کو زنبش دی تھی۔ جولیانہ کے جانے کے بعد وہ کچھ پل آتش دان میں بھڑکتی آگ کے شعلوں کو غور سے دیکھتا رہا۔ وہ کاغذ اب راکھ ہو چکا تھا۔

وہ ہنستا کھیلتا خوش مزاج لڑکا اب بہت خاموش رہنے لگا تھا۔ ایک حادثہ ہو گیا تھا اس کے ساتھ۔۔۔

اُسے محبت ہو گئی تھی۔۔۔

دل آویز سے

الہان نے قلم صفحے پر اٹکا کر ڈائری مقفل کر کے شیلف میں واپس رکھ دی تھی۔

☆...☆...☆

دو قسم کی منصوبہ بندی ہوتی ہے ایک وہ جو انسان کرتا ہے اور دوسری وہ جو خالق کرتا ہے۔ اس کہانی کے تمام کردار ایک دوسرے سے دور اپنی اپنی دنیا میں پُر سکون زندگی بسر کر رہے تھے اس بات سے بلکل انجان کے آنے والے وقتوں میں تقدیر ایک بار پھر ان سب کو پوری شدت سے جھنجھوڑنے والی تھی۔

☆...ختم شدہ...☆